زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی

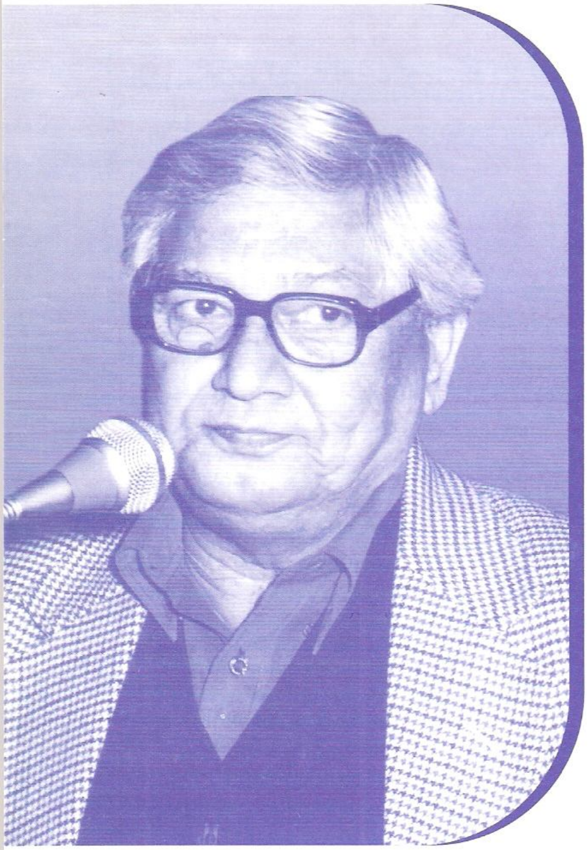

کس کس طرح سے مجھ کو نہ رسوا کیا گیا
غیروں کا نام میرے لہو سے لکھا گیا

نکلا تھا میں صدائے جرس کی تلاش میں
دھوکے سے اِس سکوت کے صحرا میں آگیا

کیوں آج اس کا ذکر مجھے خوش نہ کر سکا
کیوں آج اس کا نام مرا دل دکھا گیا

میں جسم کے حصار میں محصور ہوں ابھی
وہ روح کی حدوں سے بھی آگے چلا گیا

اس حادثے کو سن کے کرے گا یقین کوئی
سورج کو ایک جھونکا ہوا کا بجھا گیا

زندگی کے ساتھ ساتھ

ماہنامہ

چہارسو

راولپنڈی

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد:۱۶ شمارہ ستمبر، اکتوبر ۲۰۰۷ء

مجلسِ مشاورت

قارئین چہارسو

زرِ سالانہ

دلِ مضطرب شکیبانہ

چہارسو کا زیرِ نظر شمارہ !

چھ دہائیوں پر محیط

اندھیرے کو

روشنی میں تبدیل کرنے کی

آرزو، اُمید، یقین، اعتماد، اعتقاد

اور عمل کی

دنیا سے

منسوب ہے

٭

بانی مدیر اعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مدیر مسؤل

گلزار جاوید

مدیر معاون

بینا جاوید

رابطہ: 537، ویسٹرج-III، راولپنڈی۔ فون: 5462495-51-92 فیکس: 5467235 ای میل: waqars_oma@yahoo.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس، ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسُو

سرورق؛ پس ورق .... شعیب زیدی	
کمپوزنگ .... حافظ ضیا الحق	3
قرطاسِ اعزاز	4
کشتیِ جاں .... مصطفےٰ ملک	5
برہنہ پاؤں .... ہمایوں شہریار	9
ورقِ آرزو .... قاری ثنا	13
براہِ راست .... گلزار جاوید	18
ہم سے خلوت گزیدہ گنہگار .. گوپی چند نارنگ	23
دنیا کا طلب گار نہیں .... مجتبیٰ حسین	25
دل دھڑکنے سے خفا ہے .... حامد سرور	29
زرد پتے خفیف ...... شمس الرحمن فاروقی	33
میرے حصے کی زمیں ..... اسلوب انصاری	37
وحشت کا سبب .... صفوت علی صفوت	49
فکر کو کوئی دنیا کی روانی سے ...... بیدار بخت	56
حاصلِ سیرِ جہاں .... شمیم حنفی	59
برہنہ تیرگی .... فیصل عظیم	68
عجب سانحہ مجھ پر گزر گیا .... سرور الہدیٰ	74
تمام شہر آگ کی لپیٹ میں .... ابوالکلام قاسمی	80
Imagination Unchained... سلمان قریشی	81
چاند بنا پیراہن .... امتیاز عالم	
افسانے	83
بوڑھا اور نیل .... شمشاد احمد	86
آخری مکالمہ .... جمیل احمد عدیل	88
سنتا کی گوری .... دیپک کنول	
آئینۂ فن	
خود احتسابی کی بازآفرینی ..... ستیہ پال آنند	92
تخلیقِ عصر	
تازہ تخلیقات کا تعارف ...... عطیہ سکندر علی	97
ڈرامہ	
آج کی تازہ خبر .... گلزار جاوید	102
رس رابطے	
جستجو تیرے بندوں میں .... وقار جاوید	116

O O O

عرضِ مکرر!

"چہارسُو" اردو کے تمام مراکز اور مکاتب کی نمائندگی کا حامل ایسا ادبی، علمی اور سماجی جریدہ ہے جس میں آپ کی غیر مطبوعہ تخلیقات کی اشاعت کے باعث ہمہ رنگی اور ہمہ جہتی کے علاوہ وسیع النظری اور وسیع المشربی کو بجا طور پر فروغ مل رہا ہے۔

تخلیقات کی ترسیل سے قبل غیر مطبوعہ کا اطمینان کر لیجیے۔ نقول کے بجائے اصل مسودہ کو ترجیح دیتے ہوئے اپنے قلم سے غیر مطبوعہ تحریر کرنا ہرگز نہ بھولئے۔

ادارہ

O

○

قرطاسِ

اعزاز

شہریار

کے

نام

○○○

○

"دن ڈھلا شام ہوئی دل کو ڈبونے والی
ایک دروازہ کھلا
دوست سبھی جمع ہوئے چھوٹے بڑے
ایک خاموش سا چہرہ ہے کہ لگتا ہے اداسی کی جھیل
ہم سبھی اس کی طرف دیکھتے ہیں
اس کی آنکھیں ہیں کہ خوابوں کا جزیرہ کوئی
ان سے گر بات کرو
وہ بہت بولتی ہیں
ہم تو حیران سے رہ جاتے ہیں!

دوست پھر جمع ہیں اور رات کی تاریکی ہے
وہی کمرہ ہے وہی لوگ ہیں، محفل ہے وہی
ہم سبھی شعر سناتے ہیں
وہ کہتا ہے میاں...... دیکھو!
کچھ خواب بنو...... عشق کرو
تھوڑے سا دان بنو اور پھر شعر کہو
اور یہ کہہ کے ہر اک دوست کے ماتھے پہ کئی چاند بنا دیتا ہے
اور ہم سوچتے ہیں
اپنے خوابوں کی حقیقت کیا ہے
خواب کے در تو سبھی بند ہوئے
عشق کرنا کوئی آسان نہیں
شعر پھر کیسے کہیں
اور مغموم سے ہو جاتے ہیں
اور پھر رات گئے
اپنے گھر لوٹ کے آ جاتے ہیں اس فخر کے ساتھ
شہریاروں سے ہمیں نسبت ہے"

مہتاب حیدر نقوی (علی گڑھ، بھارت)

کشتیِ جاں

مصطفیٰ ملک (راولپنڈی)

نام: کنور اخلاق محمد خان (شہریار)۔

ولادت: 16 جون 1936ء۔

مقام ولادت: آنولہ ضلع بریلی یوپی بھارت۔

تعلیم: ابتدائی تعلیم ہردوئی، ماسٹرز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

پیشہ: لیکچرار اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی 1961ء تا 1996ء بطور پروفیسر ریٹائرڈ۔

زباں فہمی: اردو، ہندی، انگلش اور فارسی

صحافتی تجربہ:

(۱) مدیر علی گڑھ میگزین

(۲) ادارتی ممبر "ہماری زبان" اور "اردو ادب" از انجمن ترقی اردو ہند تین سال۔

(۳) مدیر "فکر و نظر" تحقیقی جریدہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آٹھ سال، اس عرصہ میں "فکر و نظر" کے چھ خصوصی شمارے سر سید، شبلی، حالی، نظیر، ابوالکلام آزاد اور نامورانِ علی گڑھ شائع ہوئے۔

(۴) آج کل معتبر ادبی جریدے "شعر و حکمت" کے جناب مغنی تبسم کے ساتھ شریک مدیر ہیں۔

رکن:

(۱) سابق ممبر ایگزیکٹو کونسل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۲) سابق ممبر اردو ایڈوائزری بورڈ ساہتیہ اکادمی

(۳) سابق نائب صدر انجمن جمہوری لیکھک سنگھ

(۴) ممبر جنرل کونسل نیشنل کونسل برائے ترقی اردو

(۵) ممبر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ

(۶) پیٹرن جن وادی لیکھک سنگھ

تصانیف:

(۱) اسمِ اعظم (1965)

(۲) ساتواں در (1970)

(۳) ہجر کے موسم (1977)

(۴) خواب کا در بند ہے (1985)

(۵) نیند کی کرچیں (1995)

(۶) حاصلِ سیرِ جہاں (2001)

(۷) شام ہونے والی ہے (2004)

تراجم: ہندی رسم الخط میں آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ساہتیہ اکادمی دہلی کے زیرِ اہتمام "دھند کی روشنی" کے نام سے ہندی رسم الخط میں انتخاب شائع ہو چکا ہے۔ ساہتیہ اکادمی اور روپا اینڈ سنز (دہلی) نے نظموں کے انگریزی تراجم الگ الگ شائع کئے ہیں۔ اس کے علاوہ فرنچ، جرمن، بنگالی اور تلگو زبان میں بھی شہریار صاحب کے کلام کے تراجم ہو چکے ہیں۔

فلمی تجربہ:

چند ناقابلِ فراموش فلموں "امراؤ جان ادا"، "فاصلے"، "انجمن" اور "گمن" کے نغمات تحریر کئے۔ ڈاکومینٹری فلم "شخصیات اور کارنامے" ساہتیہ اکادمی اور نگر ماس کمیونیکیشن کے تعاون سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لئے بنائی۔ تین دہائیوں سے زیادہ عرصے ریڈیو، ٹیلی ویژن کے مختلف پروگراموں اور مشاعروں میں شرکت اس کے علاوہ ہے۔

اعزازات:

ساہتیہ اکادمی، غالب انسٹی ٹیوٹ، اقبال سمان (مدھیہ پردیش حکومت)، اردو اکادمی دہلی، اردو اکادمی، فراق سمان، بھاشا شکتی پیارے کی منتری ایوارڈ اور دیگر کے علاوہ شہریار صاحب کی بے شمار نظمیں بھارت کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں جنہیں نامور دانشور ادیب، صحافی سردار خشونت سنگھ اعلیٰ پائے کی نظمیں گردانتے ہیں۔

سیاحت: امریکہ، فرانس، اٹلی، بلجیم، ڈنمارک، چین، مسقط، قطر، سعودی عرب اور پاکستان۔

پتہ:
101، سفینہ اپارٹمنٹ، میڈیکل روڈ، علی گڑھ۔
فون: 0091-571-2701322
موبائل: 0091-9837061322

☆

برہنہ پاؤں

پیش کش جناب شہریار کے غیر مطبوعہ کلام سے دستیاب تخلیقی سوغات

ہمایوں شہریار (دلی)

غ

بھولی بسری یادوں کی بارات نہیں آئی
اک مدت سے ہجر کی لمبی رات نہیں آئی

آتی تھی جو روز گلی کے سونے نکڑ تک
آج ہوا کیا وہ پرچھائیں ساتھ نہیں آئی

مجھ کو تعاقب میں لے آئی اک انجان جگہ
خوشبو تو خوشبو تھی میرے ہاتھ نہیں آئی

اس دنیا سے ان کا رشتہ آدھا ادھورا ہے
جن لوگوں تک خوابوں کی سوغات نہیں آئی

اوپر والے کی من مانی کھلنے لگی ہے اب
مینھ برسا دو چار دفعہ برسات نہیں آئی

O

برہنہ پانو

برہنہ پانو
جلتی ریت پر چلنا عبادت ہے
ہمیشہ کی طرح ہم آج بھی
اس رسم کے آداب کو ملحوظ رکھیں گے
کسی اک دور کی آواز کا پیچھا کریں گے
دھوکا کھائیں گے
مقدس دیوتاؤں کی قسم
اب کے بھی ہم کو
کوئی پچھتاوا نہیں ہوگا
برہنہ پانو جلتی ریت پہ چلنے کی لذت
کس کو ملتی ہے؟

O

عرفان صدیقی کے نام

میرے اُس کے بیچ لگی تھی شرط
کہ جیتا ہے
پہلی بار میں اُس سے جیتا اور وہ ہار گیا
کتنا بڑا یہ جھوٹا سچ کوئی بتلاؤ
کیا وہ سچ مچ ہار گیا میں جیت گیا اُس سے

O

مجبوری

چاندناؤ میں بیٹھا
آسماں سمندر میں
پھر سے تو نظر آیا
تیری نور پیشانی
اک طویل بوسے کی
منتظر ہے لیکن میں
اس زمین کی حد سے
آگے جا نہیں سکتا

O

O

جاگتا ہوں میں ایک اکیلا دنیا سوتی ہے
کتنی وحشت ہجر کی لمبی رات میں ہوتی ہے

یادوں کے سیلاب میں جس دم میں گھر جاتا ہوں
دل دیوار اُدھر جانے کی خواہش ہوتی ہے

خواب دیکھنے کی حسرت میں تنہائی میری
آنکھوں کی بنجر دھرتی میں نیندیں بوتی ہے

خود کو تسلی دینا کتنا مشکل ہوتا ہے
کوئی قیمتی چیز اچانک جب بھی کھوتی ہے

عمر سفر جاری ہے بس یہ کھیل دیکھنے کو
روح بدن کا بوجھ کہاں تک کب تک ڈھوتی ہے

O

O

گرتی ہوئی دیوار سے جیسے ڈھلتے ہوئے سائے
تم کو یاد کہاں آنا تھا یاد کہاں آئے

ہجر کی کالی لمبی رات کا جادو تھا ایسا
مجھ کو جاگتے جو دیکھا تو سوئے نہیں ہمسائے

اس صحرا کو ختم کیا تو ایک سمندر ہے
پیاس قافلے سے یہ کہہ دو کچھ آگے جائے

مستقبل کے خواب دیکھنا عادت ہے میری
دنیا کو کوئی سمجھا دے مجھ سے نہ گھبرائے

بے منزل انجان سمت میں حکم ہے جانے کا
چاہتا تھا میں جسم سفر کی آخری حد آئے

O

O

کہتا نہیں ہوں لوگو میں کر کے دکھاؤں گا
پھر سے جنوں چراغ ہوا میں جلاؤں گا

آنکھوں نے نیند رخ نہ کیا جانتا تھا میں
تجھ خواب تک رسائی کبھی میں نہ پاؤں گا

سورج ستم نشانہ بنا ہوں اسی لئے
چاہا تھا دھوپ قہر سے تجھ کو بچاؤں گا

تنہا سفر پہ مجھ کو روانہ تو کر دیا
سوچا نہیں کہ تجھ کو بہت یاد آؤں گا

چ سُن نہیں سکے گا کوئی ورنہ جی میں تھا
دنیا کو جیسا دیکھا ہے سب کو بتاؤں گا

بچے دلوں کے ننھے پرندوں کے سائے میں
جینے کا لطف اور کبھی کچھ دن اٹھاؤں گا

O

منیر نیازی کی یاد میں

اے شہرِ سخن کچھ ہونے کی
جو ایک نشانی باقی تھی
آوازِ منیر تھی
سن وہ بھی
اک لمبی چپ کی نذر ہوئی
اے شہرِ سخن تجھ سے میرا
کیا اب بھی کوئی رشتہ ہے
اس لمبی چپ سے آگے بھی
کوئی جادہ ہے کوئی رستہ ہے

O

میں بھی سولوں

بین کرتے ماتمی ملبوس پہنے لوگ
سڑکوں پہ ہمیشہ کی طرح نکلے ہیں
ان کو دیکھنے والوں میں اک بس میں ہوں
اور کوئی نہیں ہے
رات ڈھلنے میں ابھی کچھ وقت ہے
یہ سوچتا ہوں میں بھی سولوں

O

O

یہ سچ ہے سرابوں سے کچھ دور تھا پانی بھی
اور پیاس مخالف تھی دریا کی روانی بھی

لکھنے کو خطوں میں یوں دل حال سبھی لکھا
حسرت ہی رہی تجھ سے کچھ کہتے زبانی بھی

تاریک بہت شب ہے اور وہ بھی بڑی لمبی
نیند آتی نہیں مجھ کو اب سن کے کہانی بھی

پوچھے تو بھلا کس سے آنکھوں کی یہ حیرانی
اس شہر میں رہتا تھا وہ دشمن جانی بھی

چہرہ کوئی مجھ جیسا دکھلائی دیا جس دن
اُس روز یقیں آیا' ہوگا ترا ثانی بھی

O

ورقِ آرزو

ذرہ نوازیں

قاری شا(عدن)

شہریار صاحب' آداب۔

کیا لکھوں آپ سے کس قدر شرمندہ ہوں' خط کا جواب نہ دینا اور پھر آپ کے خط کا' کیا بتاؤں' کیا کیا سوچتا رہا ہوں۔ بس ہر ہفتے علی گڑھ کا پروگرام بن بن کے رہ جاتا رہا ہے۔ ملاقات پر تفصیل سے عرض کروں گا۔ Re-settle ہونے میں کیا کیا مصیبت گزر جاتی ہے اور کیسی کیسی آرزوؤں کا دم گھٹ جاتا ہے مختصر یہ کہ ان دنوں کسی قدر پریشان ہوں اور بدحواس بھی۔ یقین ہے کہ اس مرتبہ "شعر و حکمت" سے میری غیر حاضری پر خفا نہ ہوں گے۔ ممکن ہے اگلے ہفتے وہاں آ نکلوں' سرور صاحب کو میری آمد کا علم ضرور ہوگا۔ خلیل صاحب اور بھابھی صاحبہ کی خدمت میں سلام کہیئے۔

(گوپی چند نارنگ)

برادرِ عزیز شہریار۔

آپ کے خط سے میرے تجزیے کا مژدۂ جانفزا ملا کہ مجھے واقعی بے انتہا خوشی ہوئی۔ آپ کے ایک ایک حرف سے مسرت ٹپکی پڑتی تھی۔ سچ پوچھیے مجھے اپنے تجزیے سے زیادہ خوشی آپ کے بے لوث involvement نے پہنچائی۔ اور یہ جان کر تو مجھے واقعی بے انتہا خوشی ہوئی کہ آپ کو مجھ سے کیسا والہانہ اور جذباتی لگاؤ ہے۔ بہر حال زندگی کا ایک مسئلہ یہ بھی تھا سو طے ہوا کم از کم میرے ذاتی مسائل کی چند گتھیاں سلجھ گئیں۔ فسادات پر مضمون یہاں بھی بہت پسند کیا گیا۔ "شعر و حکمت" کا شمارہ اچھا ہے لیکن مضامین کا حصہ کمزور ہے ویسے تو مشی کی یہ بات مجھے بات flattering لگی کہ سب سے اچھا مضمون میرا ہی ہے لیکن اب اس عمر میں حریفانہ مقابلوں سے آگے نکل گیا ہوں۔ بیگم صاحبہ کو میرا آداب کہیئے اور یہ بھی کہیئے کہ اُن کی غیر حاضری میں' میں نے اُن کا گھر اپنا گھر سمجھ کر استعمال کیا۔ میں آپ دونوں کو خلوصِ دل سے احمد آباد آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ آپ میرے غریب خانہ اپنا گھر سمجھ کر اسی طرح استعمال کیجئے جس طرح میں آپ کا گھر اپنا سمجھ کر استعمال کرتا رہا ہوں۔ بیگم صاحبہ سے میری جانب سے یہ بھی کہیئے کہ وہ آپ کی شب بیداری پر نظر رکھیں۔ صبح کا ٹہلنا اور رات کا کھانا باقاعدہ شروع کر دیں۔ آپ نے تو میری بات نہیں مانی لیکن میں آپ کو "صحت مند" شاعر بنانے کے لیے عورتوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے پر مجبور ہوں۔

(وارث علوی)

برادرم شہریار صاحب تسلیم

آپ کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ "اسمِ اعظم" اور خط ملا ہے۔ آپ کے خلوص اور محبت کا شکریہ کیسے ادا کروں۔ میں تو اس کرم اور توجہ کا مستحق بھی نہیں تھا عمر بھر اس التفات کو یاد رکھوں گا۔ یقین کیجئے اس کرم کے جواب میں آپ مجھے ہمیشہ سراپا سپاس پائیں گے۔ آپ کی غزلیں بھی بہت عمدہ ہیں البتہ مجھے نظمیں بہت پسند آئی ہیں۔ میں آپ کی نظموں میں موجود پختگی' سادگی اور تازگی سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ یہ اسلوب آپ کا اپنا ہے۔ اس کے حصول کے لئے آپ نے جتنی ریاضت اور جگر ماری کی ہے وہ بھی آپ ہی کا حصہ ہے۔ خدا آپ کو اور آپ کے فن کو اس بلندی تک ضرور پہنچائے گا جو آپ کا مقصودِ نظر ہے۔

(مجید امجد)

میری زندگی' میرے پیارے' میری جان شہریار۔

ابھی ابھی عبید نے فون کر کے تمہاری بیماری کی خبر دی ہے۔ اس سے پہلے تمہارا بہت خوبصورت خط ملا تھا۔ میرا ساتھ کہاں کہاں دو گے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ میرا ہارٹ اٹیک تمباکو کی وجہ سے ہوا۔ خیال غالب ہے کہ تمہارا شراب کی وجہ سے ہوا ہوگا۔ میں نے تمباکو ترک کر دی (بالکل) اب میرا ساتھ دیتے ہوئے تم بھی شراب ختم کر دو نہ کر سکو تو ایک آدھ جام تک محدود ہو جاؤ۔ اب میں بالکل تندرست ہوں بلکہ Fighting Fit۔ نظموں کی کامیابی' ادبی کامیابیاں' انعامات اور پروفیسری مبارک۔ نیک دعائیں (مجھے تو ساری زندگی کوئی اعزاز نہیں ملا) میری تمنا میرے پیاروں نے پوری کی ہے۔

(ساقی فاروقی)

پیارے شہریار' خوش رہو۔

تمہارا خط اور نظمیں ملیں۔ سب سے پہلے تو نظموں کے لئے شکریہ اور مبارکباد قبول کرو۔ نظمیں پڑھ کر بے ساختہ منہ سے نکلا کہ بلاشبہ شہریار ہمارے عہد کے سب سے بڑے شاعر ہیں اور ہمارے زمانے کے Major Poet ہیں۔ اگلے "شب خون" میں "خواب کا در بند ہے" کی نظمیں شامل ہیں۔ ان کے بعد مزید نظمیں شامل اشاعت کروں گا۔ تمہاری صحت کی طرف سے فکر لگی رہتی ہے۔ دہشت پھیلنا اچھی بات ہے کیونکہ یہ انسان کو بے احتیاطی اور بدپرہیزی سے باز رکھتی ہے۔ مگر ڈر نے کی کوئی بات نہیں۔ تم نسل کے راجپوت اور عقیدے سے مسلمان ہو' تم کو مارنا آسان نہیں۔ اللہ نے چاہا تو ابھی بہت دن جیو گے۔ اردو ادب بلکہ عالمی ادب کو ابھی تمہاری بہت ضرورت ہے۔ دنیا میں کوئی بات ایسی نہیں جس کی اصلاح نہ ہو سکے۔ سگریٹ امید ہے تم نے کم کر دی ہوگی۔ شراب کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ ہفتے میں ایک بار تھوڑی پی لینے میں کوئی حرج نہیں۔ مجھے بیس مارچ کو دلّی جانا ہے اگر ممکن ہو تو انیس کے دن یا انیس کی رات کو چند گھنٹوں کے لئے تم سے ملنے آؤں گا۔

(شمس الرحمن فاروقی)

پیارے شہریار! دعائیں اور سلام بھی۔

تمہارا خط مجھے اپنے طویل دورۂ سعودی عرب کے بعد ملا۔ اس دوران تمہیں میرا ایک آدھ مختصر خط ضرور ملا ہو گا۔ مجھے بہت خوشی ہوتی اگر تم سادات امروہہ کے مشاعرے میں یہاں آتے۔ ناخوشی کی بات یہ ہے کہ میں ان دنوں میں کراچی میں نہیں ہوں گا۔ ہمارا وفاقی بجٹ چار جون کو اسمبلی میں پیش ہوا ہے۔ وہاں میری ڈیوٹی لازمی ہے۔ اگر ایک شب کے لئے مشاعرے میں شرکت کے لئے آ سکو تو بڑی بات ہے۔ ہاں ایک بات ضرور دھیان میں رکھنا کراچی کے علاوہ لاہور اور اسلام آباد کا ویزہ بھی لگوا کے آنا۔ لاہور میں کشور ناہید، امجد اسلام امجد اور عطاالحق قاسمی تمہاری آمد کے منتظر ہیں۔ اسلام آباد کے کئی دوست بھی تمہاری آمد میں اشتیاق رکھتے ہیں۔ اگر کسی طرح مری کا ذکر بھی ویزے میں ہو جائے تو تمہیں اور بھابھی صاحبہ کو مری کی سیر کرانے کی آرزو ہے۔ مری میں ریسٹ ہاؤس میں قیام اور آنے جانے کے لئے میری گاڑی حاضر ہو گی۔ اگر کسی وجہ سے میں ہمراہ نہ جا سکا تو تمہاری بھابھی ضرور تمہاری اور بھابھی صاحبہ کی میزبانی کے لئے حاضر ہوں گی۔ میری تمہاری ملاقات صرف اسلام آباد تک محدود رہے گی۔ نوکری چھوٹے تو آزاد ہو کر تمہیں اپنے جوہر دکھاؤں۔ اب تک تو تم کو میں نے گویا خوش ہی کیا ہے۔ (جمیل الدین عالی)

برادرم شہریار! سلام مسنون۔

میرے لئے آپ کا خط ایک سب سے اہم تحفہ تھا۔ دو تین بار اسے پڑھا۔ یقین نہیں آتا کہ آپ کا خط ہے۔ ایک طرف تو یہ تاریخی حقیقت ہے کہ بھارت سے مجھے پہلا خط آپ ہی نے لکھا تھا۔ اور آپ ہی بھارت میں میرے اولین دوست تھے اور ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ نے ہی سب سے پہلے مجھے بھلا دیا۔ خط و کتابت تک نہ باقی رہی۔ حالانکہ میں کتابیں، رسالے اور خطوط کے ذریعے آپ کو برابر ڈھونڈتا رہا۔ پاکستان آئے تو آپ سے ملاقات ہی نہ ہو سکی۔ بھلا یہ بھی کوئی ملاقات تھی! ملاقات تو یوں ہونی چاہیے تھی کہ آپ ساری ہنگامہ آرائی کو خیرباد کہہ کر میرے پاس تشریف لاتے اور میں آپ کو اپنے گاؤں کی سیر کراتا۔ اندازہ کیجئے کس قدر مزہ آتا۔ مگر آپ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے طوفانی دورے میں ایک تنکے کی طرح اڑتے ہوئے آئے اور چلے گئے۔ یا شاید نارنگ صاحب واقعی طوفان کی طرح آتے ہیں۔ احباب ان کی گل افشانی گفتار سے محظوظ ہوتے ہیں اور نارنگ صاحب اپنے مقتدر حلقے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ آپ خاموش طبع انسان ہیں۔ آپ کا تو یہ دورہ غارت ہو گیا ہو گا۔ مجھے آپ کا تازہ مجموعۂ کلام ملا ہے۔ ایک عرصہ بعد اچھی شاعری پڑھنے کو ملی۔ لطف آ گیا۔ ہر روز اس کا مطالعہ کرتا ہوں۔ ایک روز جمیل یوسف صاحب آپ کی کتاب مطالعے کے لئے لے گئے۔ دوسرے روز آئے تو ہم لوگ دیر تک آپ اور آپ کی کتاب کی بابت گفتگو کرتے رہے۔ فی الواقعہ بے کیف اور بے رس شاعری کے اس دور میں آپ کا مجموعۂ کلام ایک تازہ جھونکے کی مانند ہے۔ آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ نے مجھے یہ مجموعہ ارسال کر کے مسرت کے چند نایاب لمحے عطا کر دیئے۔ (وزیر آغا)

بھائی شہریار صاحب۔

آپ کے نام کے ساتھ ایک زندگی نظر میں گھوم جاتی ہے۔ اطہر نفیس، نعیم حقی اور بیر کالونی کے قریب گزرتے ہوئے آپ کا ذکر بڑے پیار سے کرتے تھے۔ پھر سلیم احمد صاحب کے جہانگیر روڈ والے گھر کے قریب آپ کا ذکر آیا۔ آپ کا اور خلیل الرحمن اعظمی مرحوم کا ذکر جانے کن کن محفلوں میں اور کب کب ہوا کرتا ہے۔ آج ہی لندن سے ساقی فاروقی کا خط آیا ہے۔ اطہر مرحوم آپ کا اور ساقی بھائی کا ذکر اکثر ایک ساتھ کرتے تھے۔ پھر آپ خود کراچی آئے ریڈیو میں ملاقات ہوئی اور پھر جو آپ گم ہوئے تو یوں لگتا ہے کہ کوئی ساتھی میلے میں گم ہو گیا ہے۔ اتفاق دیکھئے کہ میں ایک عرصہ الہ آباد میں رہا لیکن ماگھ میلے میں نہیں گیا۔ نثار رشن نے اپنے ایک مضمون میں اس کا ذکر کیا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی ماگھ میلے میں ضرور گئے ہوں گے۔ "دریافت" آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔ اسے اپنا پرچہ سمجھ کر اس کے لئے ضرور کچھ قلمی سوغات بھیجئے گا۔
(قمر جمیل)

عزیز شہریار۔

تمہارا خط مل گیا تھا۔ میں اب آتا جاتا ہوں مگر جو توانائی بدن میں ہونی چاہیے وہ ابھی نہیں آئی۔ میرا بہت بڑا آپریشن ہوا ہے۔ پانچ By pass ہوئے ہیں اور ایک volve بدلا گیا ہے۔ اجمالی کا خط آیا تھا بلانے کے لئے میں بھوپال جانے کی کوشش کروں گا۔ نومبر میں دلی کانفرنس میں بھی آنے کا ارادہ ہے۔ "سوانح" لکھنا شروع تو کر دی ہے مگر نظر ثانی کی ضرورت ہے جو ابھی ذرا مشکل ہے۔ لیکن چوپڑہ کا جو کام بیچ میں چھوڑ گیا تھا وہ بھی پورا کرنا ہے۔ کوشش کروں گا "سر و ساماں" ڈاک سے بھجواؤں۔ وحید اختر علی گڑھ جا رہے ہیں۔ یہ بات میرے ذہن میں نہیں تھی ورنہ کتاب ان کے ہاتھ بھیج دیتا۔
(اختر الایمان)

ڈیئر شہریار۔

تمہارے سب خطوط ملے۔ جواب میں دیر اس لئے ہوئی کہ ادھر مصروفیت بہت ہے۔ نعیم نے 19 کو یہاں ایک یوم غالب کا اہتمام کیا تھا جس میں اعجاز کچھ امریکن شعرا کو لے کر آنے والے تھے۔ اس موقع پر مجھ سے غالب پر ایک پرچہ لکھنے کی انہوں نے فرمائش کی۔ اس کی تیاری میں دو ہفتے لگ گئے۔ بہرحال غالب کی نسبت کا یہ پروگرام بہت اچھا رہا۔ اعجاز نے غالب کی غزلیں پڑھیں۔ چار امریکی شعرا نے غالب کے کلام کے ترجمے جو بہت اچھے لگے سنائے۔ بہرحال امریکہ میں غالب کے نام کا خوب چرچا ہو، جو نیک شگون ہے۔

ایک کمی البتہ بڑی شدت سے محسوس ہوئی کاش تم بھی اس خاص اور اہم موقع پر ہمرکاب ہوتے تو لطف دوبالا ہو جاتا۔ خیر تم نہ سہی تو تمہارے طالب علم نعیم اور ڈاکٹر افضل تمہاری کمی پوری کر رہے ہیں۔ میں اب چار فروری کو وفد خصاری کے ہمراہ نیپال جاؤں گا اور وہاں دو لیکچر دوں گا۔ اصل بات یہ ہے کہ مجھے وزارت تعلیم نے پولینڈ اور ہنگری کے دورے کی دعوت بھی دی ہے۔ غالباً اپریل کے آخر تک ہندوستان لوٹوں گا۔ نعیم نے غزل کی دو اور تمہاری ایک نظم کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے جو احباب میں پسند کئے جا رہے ہیں۔ میرے کئے ہوئے ترجمے انگلستان سے شائع ہونے والی ایک کتاب کے لئے ارسال کئے جا رہے ہیں۔ "ہماری زبان" باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ ڈاکٹر منیر بھی مل گیا تھا۔ ہاں ناشر نقوی سے کہہ دینا کہ اُن کی بھیجی ہوئی کتاب مل گئی ہے۔ منظر نقوی کو بھی بتا دینا کہ اُن کا خط بھی مل گیا ہے۔ اجازت سے پہلے بتا کید ضروری ہے کہ میرے خط کے انتظار میں نہ رہا کرو مگر مجھے خط ضرور لکھتے رہا کرو۔

(آل احمد سرور)

شہریار میرے یار۔

تمہارا خط اس مرحلے پر ملا کہ میں ہنگری جانے کے لئے تیار ہوں۔ یہ خط لکھنے کے فوراً بعد میں یہاں ایک شادی میں شریک ہو کر فوری بعد ہنگری روانہ ہو جاؤں گا۔ تکمیلی ورشاد میں دو نظمیں بھیج رہا ہوں۔ تیسری واپسی پر۔ تمہارا پہلا خط اور پرچے دونوں مل گئے تھے۔ شکریہ۔ سالار افتخار جالب نے لے لیا ہے۔ اپنے حصے کا پانچ نہیں لی اس لئے میرے حصے کا پانچ ختم کر گیا ہے۔ نظموں کی پروف ریڈنگ پر اسی طرح توجہ دینا جس طرح اپنی شاعری کی نوک پلک درست کرنے پر دیا کرتے ہو۔ شمیم کوثری کی طرف سے سلام۔ حبیب الرحمن ملیں تو انہیں بھی میرا سلام کہنا۔ تمہاری خوشی کا طالب۔

(منیر نیازی)

شہریار۔ پیارے دوست

یہ اپنا تعارف کرا چکے ہوں گے۔ اپنی تالیف "آج" اور اپنے خوبصورت تراجم کے ذریعے۔ یہ میرے اُن نوجوان دوستوں کے لئے ہیں جو اطہر نفیس کی طرح مجھ سے باخبر رہتے ہیں۔ میری خبر گیری کرتے ہیں۔ مجھے ہجر کے موسموں سے باخبر رکھتے ہیں۔ یہ مجھے اس لئے بھی عزیز ہیں کہ سعادت مندی کے ساتھ ان میں ایک اکھڑ پن بھی ہے جو بڑے لکھنے والوں کا۔ یہ ہندوستان کو دریافت کرنے نکلے ہیں اور شاید طے کر کے نکلے ہیں کہ اُن تمام لوگوں اور جگہوں کو بھی دیکھیں گے جو مجھے عزیز ہیں۔ چنانچہ تمہاری اور محمود کی زیارت اور اجنتا غاروں اور بھوپال و مجھ اراؤ سے ملاقات ان کے پروگرام میں شامل ہے۔ یہ انجینئر ہیں زبردست انتظامی صلاحیت کے مالک ہیں اور بہت پیارے انسان ہیں۔ ان سے ملو اور انہیں اپنے موسموں سے باخبر ہونے دو۔ یہ جب کراچی پہنچیں گے تو بہت کچھ مجھ تک پہنچا دیں گے۔ اس کا مجھے یقین ہے۔ میں نے تمہارے اس خط کا جواب نہیں دیا جو بھائی اطہر سے بچھڑنے کے بعد تم نے لکھا تھا۔ میں نے کئی بار وہ خط تمہیں لکھنے کی کوشش کی مگر بزدلی کی وجہ سے لکھ نہیں پایا۔ میں اب شاید اُس طرح کسی کو خط نہ لکھ سکوں جس طرح کبھی لکھا کرتا تھا۔ صرف اس لئے کہ احباب میری باتوں سے ڈیپریس ہو جائیں گے جو مجھے ہرگز منظور نہیں۔ عصمت محمد خان میرا بھائی اور اطہر نفیس میرا بھائی اور دوست مجھے گھر میں قید کر گئے ہیں۔ میں نہ سلیم احمد کے پاس جا سکتا ہوں اور نہ اطہر نفیس کے بھائی اصغر علی خان کی طرف نہ ساقی کو خط لکھتا ہوں نہ جمال پانی پتی کے پاس جاتا ہوں نہ اور کسی دوست کو کسی طرح تنگ کرتا ہوں۔ میں تم سے باخبر رہتا ہوں، سلیم بھائی اور جمال سے بھی، ساقی اور محمود سے بھی..... کیسی خوبصورت نثر لکھتا ہے یہ محمود آل انڈیا ریڈیو سے اُس کو سنتا ہوں.... کہاں ہیں یہ لوگ... ذہین لوگ... محبت کے لوگ...

(اسد محمد خان)

مئے خان "غالب" کے ایڈیٹر شہریار کو جو عزیز ترین دوست۔

تم کہاں کس راہ چلے جا رہے ہو۔ سارا راستہ تھے اور شاید نیا دعا راستہ تھے۔ چلو اچھا ہوا کر مان گئے۔ پیارے مصروف بہت رہتا ہوں۔ میری مصروفیات کے باعث تھوڑی رعایت کر دو۔ "غالب" کے تینوں شمارے ملے بہت پسند آئے ہیں۔ ان دنوں علی گڑھ کی ادبی سرگرمیوں پر رشک آتا ہے۔ "ہماری زبان" سے وہاں کے حالات کا پتہ چل جاتا ہے۔ مجنوں صاحب، عزیز قریشی صاحب کی حمد اور دلچسپ باتیں "ادب اور مقصد" "شاعری کے متعلق مباحث" پڑھ کر لگتا ہے کہ علی گڑھ اس وقت سنجیدگی کا شہر بن گیا ہے۔ ویسے بھی علی گڑھ میری تو جان ہے۔ ہم دوستوں کو وہاں جانے کی شکل تھی تمہارے بلاوے پر ہم سر کے بل بھی اپنے کرائے سے بھی آنے کو تیار ہیں۔ اب تو اس شہر محبوب کو دیکھنے کے لئے جی ترسنے لگا ہے کوئی سبب ہو تو آ جائیں۔ کچھ دن وہاں رہیں۔ وہاں سب لوگوں سے ملاقات ہو جائے۔ ایک بار چھوڑے ہوئے در و دیوار کو پھر سے دیکھیں اور بس۔ کتنی پاکیزہ خواہش ہے یار تم نے غزلیں سنانے کا پروگرام بھی بند کر دیا۔ اب تمہی بتاؤ جینے کا آسرا کہاں تلاش کریں؟

(اطہر نفیس)

شہریار میاں!

تمہارا خط ملا پڑھ کر جی خوش ہو گیا۔ لکھنؤ میں آج کل غضب کی گرمی پڑ رہی ہے۔ رات سنگھار کا پہلا باب بھی کچھ مکمل نہیں رہا۔ حد یہ ہے کہ آم کھانے تک کو جی نہیں چاہتا۔ علی گڑھ آنے کی بہت خواہش ہے لیکن وہاں تو بالکل ہی عرق کشید ہو جائے گا۔ اب ایسا کرو کسی دن تم لکھنؤ آ جاؤ۔ تم ٹھنڈی بیئر سے جی بہلانا اور میں تلخی سے خوش ہو لوں گا۔ یوں کچھ دیر دونوں کا غم غلط ہو جائے گا۔ اگر تم نہیں آئے تو پھر میں کسی دن اچانک آ نکلوں گا۔ مرغوب صاحب جدہ چلے گئے ہیں۔ اب تک تو پرانے ہو چکے ہوں گے۔ پچھلے دنوں اچھا خاصا جڑ ما ہوا تھا ابتدا میں چار غزلیں ہوئی ہیں۔ چاہو تو سن لو اور چاہو تو دوسروں کو بھی

تحا ہو۔ تمہاری غزل واقعی بہت پسند آئی۔ حیرت تحیر اور سکوت سرتاپا ہوا۔ شعر تو یوں جانو میری بیماری میں شفا کا کام کر گیا۔ (عرفان صدیقی)

پیارے بھائیوں۔

لکھنؤ سے تمہارا خط ملا تھا۔ بروقت جواب نہ لکھنے کی کوئی اچھی سی سزا تجویز کرو۔ بڑے سائز کے پرچوں کے لئے بہت ضروری ہے کہ کتابت کے علاوہ ساری باتیں زوردار ہوں۔ ارے ہاں اس ماہ "شبخون" کہاں رک گیا؟ اِدھر اس ادارہ نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ "شعر و حکمت" اور "شبخون" کے علاوہ کہیں مت رنگ دکھاؤں گا۔ "ساتواں در" کن مرحلوں میں ہے۔ ایک آدھ مہینے میں بھجوا تو جائیں۔ میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ نفرت کی وجہ سے نجمہ بھابی یاد آتی ہیں یا نجمہ بھابی کی وجہ سے نفرت؟ یہ بھی معلوم نہیں ابھی بھائیوں نے چلنا سیکھا یا نہیں؟ اگر چلنا شروع کیا ہے تو اردو یا کوئی اور زبان۔ سب سے زیادہ تشویش تمہارے بارے میں ہوتی ہے کہ تم نے فکر اور قلب کے درمیان توازن قائم کیا کہ نہیں۔ تمہاری شاعری جس بلند مقام کی حامل ہے مستقبل اس سے بھی زیادہ عظمت لئے ہوگا۔ اس لئے آج کے ساتھ کل کے لئے بھی وہ سب کچھ بچا رکھو جس کی فنکار کو اشد ضرورت ہوا کرتی ہے۔ پیارے اعظمی صاحب کیسے ہیں۔ بدر کی شعر دانی یاد آتی ہے اور احتشام اختر کی آنکھیں۔ چلئے بہت دیر ہو گئی۔ کلاس میں طالب علم آپ کی راہ دیکھتے ہوں گے۔ (عادل منصوری)

پیارے شہریار۔

تمہارا گوشہ کا خیال گیا۔ میں نے سوچا تم سے سبق حاصل کروں اور ذرا دیر سے جواب لکھوں تاکہ کچھ قدر و قیمت بڑھے اور کچھ نہیں تو تمہاری آتش شوق۔ "شعر و حکمت" بے حد توانا ہے تا بلکہ دبنگ نمبر ملا۔ واقعی تم لوگوں نے بڑی محنت کی ہے۔ امید ہے ترجمے مل گئے ہوں گے۔ ان میں سے دو تم نے فاروقی کو بھیجے کہ نہیں۔ یہ ریاض احمد کون صاحب ہیں۔ میں ان سے واقف نہیں ہوں۔ پتہ کیا خاک بھیجوں۔ یہی حال احمد مشتاق کا ہے۔ ان کے میرے پیارے نے جب سے یہاں آیا ہے خط لکھنے کی زحمت تک گوارا نہیں کی۔ کبھی کبھی لاہور سے اس کی خیر سلیم الرحمٰن اور کبھی انتظار حسین سے مل جاتی ہے۔ اس سال میری تین کتابیں نکلی ہیں چوتھی پریس میں ہے۔ ان میں سے عبداللہ حسین کے ترجم وہی جو کینیڈا میں چھپی ہے قابل دید ہے۔ جلد ہی تمہیں بھجواؤں گا۔ سنا ہے تمہاری طرف ایک بین الاقوامی اردو کانفرنس ہو رہی ہے۔ ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کو دعوت نامہ بھجوایا گیا ہے اور نہیں بھیجا گیا تو صرف مجھے۔ یہ عین زیادتی ہے میرے لئے کانفرنس میں شرکت سے زیادہ اہمیت دوستوں سے ملاقات ہے۔ (محمد عمر میمن)

محبی شہریار! سلام مسنون۔

ایک عرصے سے آپ کی خیر خبر معلوم نہ ہوئی۔ میں نے "بازدید" کی ایک جلد شمس الرحمٰن فاروقی کے ذریعے بھجوائی تھی۔ اُمید ہے مل گئی ہوگی۔ شاید میں نے گزشتہ خط میں "شعر و حکمت" کے بارے آپ سے دریافت کیا تھا کہ اس کا تازہ شمارہ کب تک شائع ہونے کی توقع ہے۔ سرور صاحب سے آپ کی ملاقات ضرور ہوتی ہوگی۔ ان کے پتے سے مجھے مطلع کیجئے گا۔ جنوری 1991ء میں میرا ہندوستان، پاکستان آنے کا ارادہ ہے۔ دو تین ہفتے علی گڑھ میں قیام رہے گا۔ دوست احباب سے ملنے کی بڑی تمنا ہے۔ (منیب الرحمٰن)

مکرمی شہریار صاحب! آداب۔

تازہ مجموعے کی شکل میں آپ کا ارسال کردہ تحفہ ملا۔ دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ پڑھ کر اور بھی نہال ہوا۔ کیا کہئے واہ صاحب واہ۔ بر جستہ تحسین ناشناس سے آپ کو کوفت ہوتی ہوگی، لیکن میں آپ کی شاعری کا بے حد مداح ہوں، آج سے نہیں ایک عرصے سے۔ بلکہ میں نے پہلا مضمون جو نویں جماعت کے طالب علم کے طور پر لکھا تھا اس میں بھی آپ کی ایک نظم پوری quote کی تھی۔ مجھے یہ کتاب پا کر بے حد مسرت ہوئی ہے اس لئے اور بھی زیادہ کہ آپ نے یاد رکھا اور اس عنایت کے قابل سمجھا۔ ایک بار پھر بے حد شکریہ۔

(آصف فرخی)

ڈیئر شہریار۔

سال نو اور "ساتواں در" کی اشاعت پر دلی مبارک باد قبول کیجئے۔ خط کا جواب جلد نہ دے سکا جو گناہ مجھ سے سرزد ہوا ہے اس پر سخت شرمندگی ہے اور ندامت ہے۔ مصروفیت کا عذر آپ کو خط نہ لکھنے کا جواز فراہم نہیں کرتا۔ آپ کی کتاب بہت اچھی چھپی ہے گردپوش اس قدر معیاری نہیں ہے جس قدر ہونا چاہئے تھا۔ اگر ممکن ہو تو اسے دوبارہ چھپوا لیجئے۔ میں نے آپ کو خط نہیں لکھا اور آپ بھی خوش ہوں ہے کیا خیام کی زبان میں پوچھ سکتا ہوں:

من بد کنم و تو بد مکافات دہی
پس فرق میان من و تو چیست بگو

(مغنی تبسم)

شہریار بھیا! آداب۔

آپ مجھے اچھے بلکہ بہت اچھے لگتے ہیں اور آپ کی شاعری تو دل کو پہلے بھی چھوتی تھی اب بھی چھوتی ہے۔ علی گڑھ جانے کو بہت جی کرتا ہے۔ وہاں کے لوگوں سے ملنے، ٹہلا کرنے اور یونیورسٹی کے ہر ہر شعبے کی یاد شدت سے آتی ہے۔ اب تو ہر شعبے میں پبلک ریلیشنگ گھس آئی ہے جس کے باعث خراب سے خراب تر شاعروں کی توقیر معاشرے نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔ انہیں معلوم نہیں کہ عزت اور توقیر کہیں اور طے ہوتی ہے۔ شاعری تو ایسی چیز ہے جو خدا، انسان اور کائنات کے درمیان گنجلک رشتوں کا دعائیہ بن جاتی ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو ان ساعتوں میں دست دعا دراز کرتے ہیں۔ خدا آپ کو خوش رکھے کہ قحط الرجالی کے اس دور میں آپ کا دم غنیمت ہے۔ (سلیم کوثر)

براہِ راست

گلزار جاوید

گلزار جاوید صاحب آپ کا سوالنامہ ملا۔ میں نے کبھی کسی امتحان کے پرچے کو دوبارہ نہیں پڑھا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے جوابات کو پڑھنے والا صرف ایک شخص ہوگا اور اس کی رائے نمبروں کی صورت میں ظاہر ہوگی۔ آپ کے سوالات کے جوابات بہت لوگ پڑھیں گے۔ میری شاعری کے بارے میں پڑھنے والوں کی جو بھی رائے ہو، ان جوابات سے میرے رسوا ہونے کا قوی امکان ہے۔ آپ شاید چاہتے بھی یہی ہیں۔ اسی لئے آپ نے بہت کھود کرید کے میری ذاتی زندگی کے بارے میں سوالات کئے ہیں۔ میں صرف ان سوالوں کے جواب دے رہا ہوں جن کے جواب میرے خیال میں ضروری ہیں۔ میری زندگی کو میرے ان دو شعروں کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے۔

۱۔ ہر قدم پہ موڑ تھے ہر موڑ پہ منظر نئے
عمر کی ایک ایک ساعت حرفِ حیرانی ہوئی

۲۔ اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں سبھی آخر میں
حاصلِ سیرِ جہاں کچھ نہیں حیرانی ہے

شہریار

☆ کچھ وضاحت خاندانی نام کے ساتھ لفظ کنور کی ہو جائے تو قارئین آپ کے خاندانی پس منظر سے باخبر ہو سکتے ہیں؟

☆☆ مجھے اپنے خاندان کے بارے میں اتنا معلوم ہے کہ ہم لوگوں کا شجرہ پرتھوی راج چوہان تک جاتا ہے۔ ہمارے کسی پرکھے نے اولیا محمد فقیر سے اولادِ نرینہ نہ ہونے کا دکھ بیان کیا۔ اس کی دعا سے جو بیٹا پیدا ہوا اس کو مشرف بہ اسلام کیا گیا اور اسی نسبت سے ہم اولیا خانی راجپوت کہلاتے ہیں۔ ہم لوگوں کی ایک کمزوری ہے کہ ہمارے زیادہ تر بزرگ اپنے مسلمان ہونے کو کوئی عجب سمجھتے ہیں۔ لیکن فخر راجپوت ہونے پر کرتے ہیں۔ شادیوں اور رشتوں میں اب بھی ہندوستان میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ خاندان کھرا راجپوت ہو۔ میں ہندوستان میں شاید پہلا آدمی (راجپوت) ہوں جس نے غیر راجپوت سے شادی کی۔ کنور میرے راجپوت ہونے کا ثبوت ہے۔ نام کے ساتھ خان اس لئے لکھا جاتا ہے کہ یہ خطاب ہمارے کسی بزرگ کو ملا تھا۔ میں نے اپنے چچا سے سنا ہے کہ میرے پردادا فوج میں رسالدار تھے۔ میرے دادا تھانے دار تھے۔ میرے باپ بھی تھانے دار تھے۔ بڑے بھائی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ کاش کی اور قد کے اعتبار سے مجھے بھی تھانے دار ہونا تھا۔ میں کیسے کب اور کیوں شاعر ہو گیا اس کا کوئی شافی جواب میرے پاس آج بھی نہیں ہے۔ عام تخلیق کاروں کی طرح میں اپنے آپ کو کوئی ایسی خاص مخلوق نہیں سمجھتا جو اپنے رویوں اور سوچ میں عام انسانوں سے مختلف ہو۔ بلکہ میں بالکل ایک عام آدمی ہوں اور عام آدمی کی طرح دنیا کی اچھی چیزیں اچھی لگتی ہیں اور بری چیز بری۔ میں نے مشق اور مہارت سے اپنے ردعمل کے اظہار میں خود کو عام آدمی سے الگ کر لیا ہے لیکن ہمیشہ اور ہر وقت ایسا نہیں کر پاتا۔ میری ازدواجی زندگی کی ناکامی کا بنیادی سبب میرا بہت زیادہ عام آدمی ہونا تھا۔

☆ نوجوانی میں بیڈمنٹن اور دیگر صحت مند سرگرمیوں سے آشنا نوجوان تاش جیسے غیر صحت مند کھیل کا رسیا اور بادہ خواری میں کیونکر گرفتار ہوا اور اس کے اثرات کس شکل میں ظاہر ہوئے؟

☆☆ گلزار صاحب! کھیل میری زندگی کا محور و مرکز رہا ہے۔ میرے کھیلنے کو میرے باپ نے ناپسند نہیں کیا۔ میں نے بھی اپنے بچوں میں کھیل سے دلچسپی جنون کی حد تک پیدا کی۔ میرا ایک بیٹا یونیورسٹی کا کلر ہولڈر تھا، ہندوستان کی یونیورسٹیوں کی مشترکہ ٹیم کا نمایاں کھلاڑی تھا۔ اب گولف کھیلتا ہے اور ملکی کے عالمی مقابلوں میں شریک ہوتا اور انعام پاتا ہے۔ تاش ایک بہت ہی ذہانت کا کھیل ہے۔ زندگی میں Risk لینے والے جواری کی ہمت اور فطرت اس کی مثال ہیں۔ اس کو میں غیر صحت مند شمار نہیں کرتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں تاش میں اپنی دلچسپی میں توازن نہیں رکھ سکا۔ شراب نوشی کا میں کسی کو ذمہ دار نہیں سمجھتا۔ جب تک میں شراب نہیں پیتا تھا اس کو سب سے بری چیز سمجھتا تھا۔ اسی لئے میں ان لوگوں کے احساسات کو سمجھ سکتا ہوں جو اس کو برا سمجھتے ہیں۔ آج بھی میں اس کو کوئی اچھی چیز نہیں سمجھتا۔ میں نے شراب کی حمایت یا مخالفت میں کبھی شعر نہیں کہے اور نہ ہی شراب پی کر کبھی شاعری کی۔ شاعری اور شراب کا میرے خیال میں کوئی خاص تعلق نہیں لیکن اس کو کسی شاعر کے حوالے سے مسئلہ بنانے والے میری سمجھ سے باہر ہیں۔

☆ کن جذبات و احساسات کے تحت اوائل عمر میں ہی والد صاحب کی خواہش کے باوجود پولیس کی نوکری نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ آپ کے اس فیصلے کے ڈانڈے کس طور آپ کے شعری میلان سے جوڑے جا سکتے ہیں؟

☆☆ پولیس کی نوکری نہ کرنے کا فیصلہ کچھ بہت سوچا سمجھا نہیں تھا۔ لاشعور کے اسباب پر میں نے غور نہیں کیا۔ یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ اس فیصلے کے وقت میں شعر بھی نہیں کہتا تھا اور نہ ہی زندگی میں کچھ خاص بننے کا مقصد تھا۔ جہاں تک اس فیصلے کو میرے شعری میلان سے جوڑنے کا سوال ہے تو ایسا کرنا ہر طرح سے مناسب ہے کیونکہ ہر وہ عمل جو مجھ سے سرزد ہوا ہے کسی نہ کسی طرح میری ذات کا حصہ ہے جیسے میری شاعری۔

☆ خلیل الرحمن اعظمی صاحب کے ہمراہ رہائش اور قریبی تعلق کی بابت جناب بیدار بخت اور دیگر احباب کی رائے کی نسبت بہت سے سوالیہ نشان کیوں ہیں؟

☆☆ بیدار بخت علی گڑھ میں میرے ہم عصر تھے اگرچہ ہم میں ملاقات بہت بعد میں ہوئی میں نے اپنے انتخاب میں جن چہ مگوئیوں کا ذکر کیا ہے وہ ان رشتوں کے بارے میں ہر معاشرے میں ہوتی ہیں خاص طور سے اگر عمر میں تفاوت ہو۔ خلیل الرحمن اعظمی بڑے جری نڈر اور محبت کرنے والے آدمی تھے۔ مجھے ان جیسا کوئی دوسرا آج تک نظر نہیں آیا۔ بندھے ٹکے رویوں سے انہوں نے کبھی کوئی سمجھوتا نہیں کیا ان کی زندگی ایک کھلی کتاب تھی ان کا شعر ہے:

یوں تو مرنے کے لئے زہر سبھی پیتے ہیں
زندگی تیرے لئے زہر پیا ہے میں نے

یہ صرف ایک شعر نہیں زندگی کرنے کا ایک فلسفہ ہے جس پر آخری سانس تک وہ کاربند رہے۔

☆ وضاحت کے ساتھ ان حالات اور واقعات کی جانب روشنی ڈالئے جن کے سبب آپ خلیل الرحمن اعظمی کو اپنا محسن، رہبر و رہنما مانتے ہیں نیز یہ کہ عمر گذرنے کے ساتھ کبھی آپ کو اپنی رائے سے رجوع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی؟

☆☆ خلیل صاحب میرے محسن تھے بلکہ جو کچھ میں ہوں ان کی بدولت ہوں۔ گھر چھوڑنے کا فیصلہ بھی میں نے ان کے بل بوتے پر کیا۔ پولیس کی نوکری نہ کرنے کا فیصلہ میں نے خود کیا تھا یہ سوچے بغیر کہ میں کیا کروں گا لیکن خلیل صاحب نے مجھے آسرا دیتے وقت مجھ سے یہ سوال نہیں کیا تھا کہ میں کیا کروں گا۔ میں نے ان کی بہت سی باتیں اور رویے اپنائے ان کے کہے بغیر۔ خلیل صاحب نے میرے شعر پر کبھی اصلاح نہیں دی۔ میں ان کو شعر صرف اس لئے سناتا تھا کہ وہ دیکھ لیں کہ کہیں ناموزوں تو نہیں ہے کیوں کہ میں اس زمانے میں کیا آج بھی فاعلاتن فاعلات سے واقف نہیں ہوں۔ دنیاوی سمجھ بوجھ میں میرے کچھ زیادہ ہی تھی۔ رہنے سہنے اور لباس کے سلسلے میں خلیل صاحب کو میں نے کئی مشورے دیئے جو انہوں نے قبول کئے۔ مجھے خلیل صاحب کا دوست ہونے پر پہلے بھی فخر تھا اور آج بھی ہے۔ پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ۔

☆ جناب نجمہ محمود کا ذوق شوق سے نجمہ شہریار بن کر پھر سے نجمہ محمود بن جانے کے اسباب و علل اور آپ کے احساسات کیا ہیں؟

☆☆ آپ یقین کریں کہ میں نے آج تک یہ پتا چلانے کی کوشش نہیں کی کہ نجمہ نے اتنا انتہائی قدم کیوں اٹھایا۔ میں ان کو الزام نہیں دیتا لیکن میں ایک فیصدی بھی قصوروار نہیں ہوں۔ اس مسئلہ پر مزید گفتگو میرے خیال میں غیر مناسب ہے۔

☆ جناب خلیل الرحمن اعظمی کی وفات اور محترمہ نجمہ محمود سے جدائی کو آپ زندگی کے بڑے حادثات سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیا ان محسوسات میں کسی طرح کا Guilt بھی پنہاں ہو سکتا ہے؟

☆☆ ان دو شخصیتوں کا مجھ سے دور ہو جانا، واقعی میرے لئے ایک ایسا حادثہ تھا جس سے میں آج تک Reconcile نہیں کر پایا ہوں۔ Guilt جیسی کوئی چیز میں محسوس نہیں کرتا۔ میں جان بوجھ کر کسی کو دکھ نہیں پہنچاتا۔ لیکن کسی کو اپنی وجہ سے دکھی دیکھتا ہوں تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔

☆ براہ راست نشان دہی کے بغیر "ان آنکھوں کی مستی" والی محترمہ کی بابت احساسات میں ہمارے قارئین کی شرکت دلچسپی کا باعث ہوگی!

☆☆ دراصل اس عشق کے معاملے میں بہت زیادہ سنجیدہ نہیں تھا بلکہ یہ عشق ایک طرح کا ڈرامہ تھا جس کا مقصد اصل معشوق کو اپنی طرف متوجہ کرنا تھا اور یہ طریقہ یا نسخہ کامیاب رہا۔ فرصت وقت نے دی تو لکھیں گے اس کی روداد۔ کیسے طوفانوں سے نکلے پہنچے کیسے ساحل پر۔ وہ خاتون بہت اچھی ہوئی چیز تھیں۔

مرکزِ دیدہ و دل تیرا تصور تھا کبھی
آج اس بات پہ کتنی ہنسی آتی ہے ہمیں

☆ ایک تخلیق کار خصوصاً شاعر کی ملکی، سماجی اور معاشرتی حیثیت اور ذمہ داریوں کی بابت آپ زندگی کے اس موڑ پر کیا رائے دینا پسند کریں گے؟

☆☆ میں بارہا لکھ چکا ہوں اور آج بھی اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ شاعر سماج، معاشرہ سے متاثر ہوتا اور اسے متاثر کرتا ہے۔ سیاست اور زندگی ایک دوسرے سے ناگزیر طور پر متعلق ہیں۔ خوبصورت اور بہتر زندگی ہر انسان کا نصب العین ہوتی ہے۔ میری شاعری کو اسی حوالے سے پڑھا جائے۔ میری تنہائی اور اداسی کا سبب میری ذاتی محرومیاں کبھی نہیں رہیں۔

☆ اردو، ہندی، فارسی اور انگریزی میں آپ کے پسندیدہ شاعر اور ان کے آپ کی فنی زندگی پر اثرات؟

☆☆ قاضی سلیم ایک اچھے شاعر تھے، وقار صدیقی، مجید امجد، حامد عزیز مدنی، منیب الرحمن یہ سب اچھے شاعر تھے لیکن ان کی شاعری کا رخ ادب کے جس موڑ پر سامنے آئی، اس وقت یا تو ۳۶ء کے آس پاس کے شاعروں کا بول بالا تھا یا آزادی کے بعد کے شعراء پر توجہ دی جا رہی تھی۔ اچھی چیز بھی صحیح وقت پر سامنے نہ آئے تو توجہ کا مرکز نہیں بنتی۔ میرا پہلا مجموعہ ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا ادبی حلقوں میں جس طرح اس کی پذیرائی ہوئی اس سے لگتا ہے کہ جیسے پورا اردو ادب میرا انتظار کر رہا تھا۔

☆ آپ کی شاعری کی ابتدا کو قاضی سلیم صاحب نے فرٹ ٹائمنگ سے کن معنوں میں موسوم کیا تھا؟

☆☆ گلزار صاحب! یہ سوال تو انھیں لوگوں سے کرنا چاہیے جنھوں نے بقول آپ کے میرا ذکر ان شعراء کے ساتھ کیا ہے ویسے میں ان شعرا کو پسند کرتا ہوں لیکن میری شاعری کا ان شعراء سے کوئی براہ راست تعلق کبھی نہیں تھا۔

☆ آپ کی شاعری کو خلیل الرحمن اعظمی، ناصر کاظمی، مجید امجد، شن اشرف اور محمد علوی سے مماثل قرار دینے والے دراصل میں کہنا کیا چاہتے ہیں؟

☆☆ اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ شاعری کس طرح وجود میں آتی ہے تو شعر کہنے والوں کو کتنی آسانی ہوتی۔ شاعری کب اور کیسے وجود میں آتی ہے؟ اس راز کو جاننے کا جتنے لوگوں نے اب تک دعویٰ کیا ہے وہ میرے خیال میں کذب و افترا ہے۔ ہر تخلیق ایک نئے تخلیقی عمل کا نتیجہ ہوتی ہے اس لئے وہ مختلف ہوتی اور اس کا مختلف ہونا ہی اس تجربے کو پیدا کرتا ہے جو اس کا حاصل ہے۔

☆ اگر اس خیال سے اتفاق کر لیا جائے کہ شاعری خود سے اُگنے کے سبب وجود میں آتی ہے تو آپ کے ہاں اس کا اطلاق کس طور ہوتا ہے؟

☆☆ شاعری کے عناصر کی نشاندہی نقاد حضرات اپنی سہولت کے اعتبار سے کرتے ہیں۔ مکالمہ، ڈرامہ، کہانی، موسیقی، استفہام، زبان کی مختلف جہتوں اور سطحوں کا ماہرانہ استعمال، فن کے بحور و اصولوں کو متحرک اور زندہ شکلیں دینا اور نہ جانے کیا کیا۔ لیکن دراصل شاعری کے بارے میں بہت کچھ یا سب کچھ جاننے والے اچھی شاعری کرنے پر بہت کم قدرت رکھتے ہیں۔ یہ بہت سامنے کی بات ہے۔

☆ آپ کے ہاں شاعری کو مکالمے سے تعبیر کیا جاتا ہے، بیان سے یا آپ اسے کوئی اور چیز گردانتے ہیں۔ اگر اس سے مختلف بھی کوئی تصور آپ کے ذہن میں شاعری کی بابت موجود ہو تو ضرور بیان فرمائیے؟

☆☆ کیا یہ ضروری ہے کہ ہر شخص کسی رائج مکتبۂ فکر سے منسلک ہو۔ اس شخص کا اپنا مکتبۂ فکر بھی ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مجھے یہ نہ معلوم ہو کہ کیا کہنا چاہیے اور کیسے کہنا چاہیے لیکن یہ بات میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے یہ معلوم ہے کہ کیا نہیں کہنا چاہیے اور کیسے نہیں کہنا چاہیے۔

☆ آپ کے ہاں خاص طرح کا تحمل، بُردباری، ٹھہراؤ، ضبط، کم گوئی اور کم سخنی کو خلیل الرحمن اعظمی کے علاوہ کس مکتبۂ فکر سے منسوب کیا جا سکتا ہے؟

☆☆ میں علی گڑھ کا طالب علم رہا ہوں اور علی گڑھ والے ادب کی مختلف اصناف کی اہمیت اور حدود کو سمجھتے ہیں۔ میرے خیال میں غزل اور نظم ہیئتی اعتبار سے اپنی الگ الگ پہچان رکھتی ہیں۔ ہاں غنائیت کا عنصر دونوں میں پایا جاتا ہے۔

☆ آپ کے ہاں غزل اور نظم میں نمایاں فرق نہ ہونے کا سبب وہ ادبی خوف تو نہیں جو غزل کو نیم وحشی اور از کار رفتہ صنف گردانتا ہے؟

☆☆ خوف زدگی یا کسی طرح کی زدگی عام طور سے منفی معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ اگر آپ نے ان معنوں میں اس کو استعمال کیا ہے تو مجھے آپ سے سخت اختلاف ہے۔ غیر تحفظیت کے نتیجے میں پیدا ہونے والا خوف انسانی سرشت کے کئی ابعاد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جو کچھ آپ کے پاس ہے اس کو کھو جانے کا خوف بہت ہی Potent کیفیت ہے۔

☆ خالی ہڈیوں سے پیکر کی تشکیل، خوف زدگی، حجاب یا محسوس کی تلاش اور بے جسم سائے کو غیر مرئی جستجو کی بابت کچھ ارشاد فرمائیے؟

☆☆ یہ Images اور Symbols ہیں۔ ان کو نظم کے پورے ڈھانچے سے الگ کر کے ان کی تشریح کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔ یہ جہاں استعمال ہوئے ہیں وہاں ان کی معنویت پوری طرح قائم ہے۔

☆ آپ کے کلام کو پڑھنے کے بعد ایک ہارے ہوئے انسان کی روداد کا احساس جاگزیں ہوا کرتا ہے جیسے آپ کا بہت کچھ کھو چکا ہے، گم چکا ہے یا چھن چکا ہے؟

☆☆ آپ کا یہ تاثر ایک نقاد صاحب کی کچھ ایسی ہی رائے سے ملتا جلتا ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی کا ایک شعر ہے

میں جیتا تو پائی کسی سے نہ داد
میں ہارا تو گھر پر بہت بھیڑ تھی

جہاں تک میری زندگی کا سوال ہے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ زندگی میں مجھے وہ سب کچھ بغیر کسی کوشش کے ملا جس کی عام انسان خواہش کرتا ہے۔ میں بارہا یہ کہتا رہا ہوں کہ میری شاعری میری ذاتی زندگی کی روداد نہیں ہے یہ میری اس ذات کی کہانی ہے جو اپنے آس پاس، اپنے وقت اور پورے عالم سے مربوط ہے۔

☆ کیا یہ تاثر درست ہے کہ آپ وقت گزرنے کے ساتھ اپنی شاعری میں تبدیلیاں کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً کس نوعیت کی ہوا کرتی ہیں یہ تبدیلیاں؟

☆☆ بیدار بخت نے اپنے مضمون میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ بہت ابتدائی زمانے کی بات ہے جب میں نظم یا غزل کو اس وقت تک اشاعت کے لئے نہیں بھیجتا جب تک میں اس سے مطمئن نہیں ہو جاتا۔ لکھنے کے دوران کافی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی تو پہلی شکل سے آخری شکل اتنی مختلف ہوتی ہے کہ یقین کرنا دشوار ہوتا ہے۔

☆ ایک خیال یہ بھی ہے کہ آپ نے اپنی شاعری میں کافی کچھ کہنے کے باوجود بہت کچھ چھپا بھی لیا ہے یعنی آپ کی شاعری اظہار کے بجائے اخفا کی شاعری کہی جا سکتی ہے۔

☆☆ اچھی اور سچی شاعری مکمل تشریح سے انکار کرتی ہے اس لئے یہ لگتا ہے کہ جو کچھ سمجھ میں آ رہا ہے اس سے بھی کچھ زیادہ ہے جو کبھی ہو یا کسی اور کی سمجھ میں آئے گا۔ یہ شاعری کا حسن ہے۔

اس کو قریب سے دیکھ لیا تو کچھ نہ رہا
ساری کشش اس حسن میں ایک حجاب سے تھی

☆ معنی سے الگ الفاظ کا برتاؤ اور لسانی رویہ بھی قاری کو اکثر چونکاتا ہے؟

☆☆ اس کے بارے میں میں کیا کہوں۔ میرے خیال سے یہ خوبی سارے اچھے شاعروں کے یہاں پائی جاتی ہے یا پائی جانی چاہیے۔

☆ جدیدیت سے وابستگی کے باوجود اس رجحان کے مسائل کو آپ نے اس طور کیوں نہ برتا جس طور دیگر لوگ مقلدانہ طرز پر استعمال میں لاتے رہے۔ اس رویے کے باعث آپ کے نظریات کی بابت ابہام کا در آنا فطری بات ہے؟

☆☆ میں نے تنقید پڑھ کر شاعری کبھی نہیں کی۔ نہ ہی اس کا کبھی خیال کیا کہ میری شاعری بڑی شاعری یا مروجہ رجحان کی کتنی اور کیسی نمائندگی کر رہی ہے۔ میں نے وہی لکھا جو میں لکھ سکتا تھا۔

☆ وقت گزرنے کے ساتھ آپ کے ہاں خود احتسابی کا عمل شامل نظر آتا ہے۔ کبھی کبھی اس میں احتجاج کا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے مگر لہجہ پھر بھی مدھم رہتا ہے جس کے باعث قاری و ناقد آپ کے احتجاج سے باخبر ہو کر بھی اکثر بے خبر رہا کرتے ہیں!

☆☆ خود احتسابی کا عمل انفرادی نہیں ہے اجتماعی ہے ہم سب جو اپنے کو انسانیت کا ضمیر کہتے ہیں ایک منزل پر پہنچ کر اپنے ضمیر کی آواز سننا بند کر دیتے ہیں۔ اس پر شرمندہ ہونے کے بجائے اس کے لیے جواز تلاش کرتے ہیں۔

مجھ کو ملامت بس اس پہ ہے لوگ بہت خوش ہیں
اس لمحے کو کھو کر جو چمکنے والا تھا

کسی ایک کھوکھلی کرسی پر بیٹھنے کی خواہش ہمارے دانشوروں میں اب کچھ زیادہ ہی پیدا ہو گئی ہے۔ میرے احتجاج کی لے دھیمی نہیں ہاں اس کا اظہار تہذیب کے دائرے میں ضرور ہے۔

☆ آپ کے ہاں لفظی تکرار اور سرگوشی کی طلسماتی فضا نے بھی قارئین کو کنفیوز ہونے پر مجبور کیا ہے؟

☆☆ لفظی تکرار سے شاید آپ کی مراد بعض علامتوں اور استعاروں کے تواتر کے ساتھ استعمال سے ہے جیسے نیند، رات، خواب، ریت، کشتی، پانی وغیرہ۔ قاری کے کنفیوز ہونے کی اطلاع مجھے آپ سے مل رہی ہے۔ جہاں تک میں نے قاری کے خیالات اپنے بارے میں پڑھے ہیں ان میں خاصی وضاحت بلکہ بڑی قطعیت ہے۔

☆ بعض ترقی پسند ناقدین نے آپ کے ہاں موجود تہہ داری اور معنی آفرینی کو اسی طور نمایاں نہ کیا جس طور کرنا چاہیے تھا؟

☆☆ سوال اچھا ہے لیکن اس کا جواب آپ مجھ سے کیوں مانگ رہے ہیں؟

☆ ہیئتی تنقید کے نمائندہ ناقدین نے آپ کے ہاں محسوس کی جانے والی سماجی معنویت کو کیوں دانستہ یا نادانستہ نظر انداز کیا ہے؟

☆☆ نئی تنقید کی جگہ وہ تنقید ہونی چاہیے جو جدیدیت کے رجحان کی سطح ہے۔ انہوں نے ادب کے حدود کے تعین میں بڑے اہتمام کے ساتھ سماج اور معاشرے کو نکال دیا اور ادب کو پرکھنے کے لئے کچھ ایسے معیار مقرر کئے جو ترسیل کرنے والے ادب کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ میں شعر صرف اپنے لئے نہیں کہتا۔ جو یہ کہتے ہیں ان کو چاہیے کہ وہ اپنے تخلیقات اپنے تک محدود رکھا کریں۔ اس سوال کو میں نے غور سے نہیں پڑھا۔ ہیئتی تنقید کو میں نے نئی یا جدید تنقید سمجھا اور مندرجہ بالا خیالات کا اظہار کیا۔ آپ چاہیں تو انہیں حذف کر دیں۔ ہیئتی تنقید معنی سے سروکار کم رکھتی ہے اس لئے اس سے توقع مناسب نہیں کہ وہ میری شاعری کے سماجی پہلو پر کچھ کہتی۔

☆ فلمی شاعری کی بابت آپ کے محسوسات کیا ہیں۔ "امراؤ جان ادا" جیسی سدا بہار اور ہر دلعزیز فلم کے گیت لکھنے کے بعد آپ کو فلمی دنیا کا مشہور ترین اور مصروف ترین نغمہ نگار ہونا چاہیے تھا؟

☆☆ ہم اردو والوں نے مقبول ادب اور سنجیدہ ادب کے درمیان دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں۔ کرشن چندر کے افسانے "مہالکشمی کا پل" کی طرح کبھی ادب یا تو ادھر ہے یا ادھر ہے۔ شمع اور بیسویں صدی ایسے رسالے تھے جو ہزاروں کی تعداد میں چھپتے تھے۔ کرشن چندر، عصمت چغتائی کا افسانہ ان میں چھپتا تو اردو والے خاصی ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ فلم نے اردو کو مقبول بنانے میں بڑا رول ادا کیا ہے اور آج بھی کر رہی ہے۔ میں فلم کی شاعری کو برا نہیں سمجھتا لیکن اس کو ادب میں شامل کرنے میں مجھے تامل ہے۔ میں نے فلم کو کیریر اس لئے نہیں بنایا کہ میں عام آدمی تک پہنچنا چاہتا ہوں لیکن اپنی شرائط پر جو فلم کی دنیا میں ممکن نہیں۔ ہاں اگر ایسی فلمیں جن میں شاعری کی گنجائش ہو مجھے ملیں تو میں ضرور گانے لکھوں گا۔

☆ "امراؤ جان ادا" کے لازوال گیتوں اور غزلوں کا کریڈٹ شہریار صاحب اور خیام صاحب میں کس تناسب سے تقسیم کیا جانا چاہیے؟

☆☆ امراؤ جان کے گیتوں میں میرے علاوہ خیام، آشا اور مظفر کا برابر کا حصہ ہے۔ خیام صاحب کا کام یقیناً اس میں زیادہ اہم ہے۔

☆ آپ کی شاعری اب تک کتنی زبانوں میں تراجم کے ذریعے دیگر ملکوں اور قوموں تک پہنچ چکی ہے اور اس کے عوض ہونے والے تحقیقی کام کی رفتار کیا ہے؟

☆☆ اب تک جرمن، فرانسیسی، روسی اور اب چینی میں بھی ترجمے ہو چکے

ہیں۔ روس میں جدید شاعری کے مطالعے میں میرا حوالہ دیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں مراٹھی، بنگالی، پنجابی، تیلگو میں ترجمے ہوئے ہیں۔ انگریزی میں دو کتابیں آ چکی ہیں۔ ساہتیہ اکادمی اور رویا نے شائع کی ہیں۔ NBT نے ہندوستان کے سو شاعروں کا انگریزی میں ترجمہ شائع کیا ہے اس میں میری کئی نظمیں شامل ہیں۔ دیوناگری میں میری کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی انتخاب بھی شائع ہوئے ہیں۔

☆ بھارت جیسے تازہ مغرب زدہ معاشرے میں جہاں قومی زبان ہندی کو خطرات لاحق ہوں وہاں اردو زبان، اردو ادب اور اردو شاعری کے مستقبل سے کس قسم کی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں؟

☆☆ بھارت ہی نہیں پوری دنیا ایک نئی تہذیب میں رنگی جا رہی ہے آپ کا ملک بھی اس میں شامل ہے۔ یقینی طور پر تبدیلی خطرناک معلوم ہو رہی ہے اور ہے بھی لیکن یہ صورت میرے خیال میں عارضی ہے۔ ہم پھر اپنی طرف لوٹیں گے لیکن ایک نئے انداز سے الیکٹرانک میڈیا سے پرنٹ میڈیا پر جو اثر پڑا ہے وہ یقیناً اچھا نہیں ہے لیکن کیا کیا جائے:

آج کا دن ہاں بہت اچھا نہیں تسلیم
آنے والا دن بہت بہتر ہے میری رائے ہے

☆ اردو زبان کے رسم الخط کی تبدیلی کی بابت آپ کی رائے اور زبان کے مستقبل کی بابت آپ کیا ارشاد فرمانا پسند کریں گے؟

☆☆ اردو زبان اپنے موجودہ رسم الخط کے ساتھ ہی پھلے پھولے گی۔ ہندوستان میں اردو کا مستقبل ہر طرح روشن ہے۔ اردو کو خطرہ ہے تو ان اردو والوں سے جو اردو کی طرف اپنی ذمہ داری کو محسوس نہیں کرتے۔

☆ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس طرح سے اردو زبان کو لاحق خطرات کا سامنا کیا جا سکتا ہے؟

☆☆ اردو کن خطرات سے دوچار ہے اس کا علم نہیں۔ اس لئے اس مسئلہ پر کیا رائے دے سکتا ہوں۔

☆ اردو شاعری میں تجربات کی بابت آپ کا حسن ظن کیا ہے۔ مثلاً آزاد غزل یا پابند غزل، آزاد نظم، نثری نظم، نثری غزل وغیرہ وغیرہ؟

☆☆ میں ہمیشہ تجربات کو خوش آمدید کہتا رہا ہوں۔ تجربے کو اپنی فنی توانائی سے ثابت کرنا ہوگا کہ وہ کارگر تھا ہے۔

☆ آپ کو اپنے فنی سفر کی بابت کہاں تک اطمینان اور اعتماد ہے اور کہاں کہاں بے کلی اور بے اطمینانی اگر پائی جاتی ہے تو اس کا سبب اور تدارک کیا ہے؟

☆☆ گلزار صاحب یہ سوال برائے سوال معلوم ہو رہا ہے۔ بھلا کوئی آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ اپنے کام سے پوری طرح مطمئن ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میں نے اب تک جو کچھ لکھا ہے اچھا نہیں ہے۔ جی نہیں اگر ایسا ہوتا تو میں اس کو شائع نہ کرتا۔

☆ ہر تخلیق کار کے لئے شعور تخلیق کا وجود اسی قدر ضروری ہے جس قدر تخلیقی جوہر کا ہونا لازم ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ نے جس قدر اور جس موضوع کے تحت لکھا آپ کے یا آج کے نقاد نے اس کو اسی طرح سمجھا اور آگے بڑھایا۔ اگر نہیں تو اس کے اسباب؟

☆☆ آپ اس کو میرا انکسار نہ سمجھیں، میری فطرت اور مزاج میں یہ بات ہمیشہ سے رہی ہے کہ میں اپنے بارے میں زیادہ نہیں سوچتا۔ اپنی شاعری پر کوئی تنقیدی مضمون پڑھتا ہوں تو خوش ہوتا ہوں ناقد میرے شعر کو جن پہلوؤں کو اہم سمجھتا ہے اس پر اظہار خیال کرتا ہے یہ اس کا حق ہے۔

☆ تقسیم ہند سے تہذیب و تمدن کو پہنچنے والے ضعف سے اردو زبان، ادب اور شاعری پر آپ کے خیال میں کس طرح کے اثرات مرتب ہوئے اور ان کا تدارک کس شکل میں ہونا چاہیے؟

☆☆ تقسیم ہند تلخ ہی سہی ایک حقیقت ہے اس کو Sportingly تسلیم کر لینا چاہئے۔ اردو نے دونوں ملکوں میں اپنے رول کو طے کر لیا ہے۔ اردو کی ترقی موجودہ حقیقتوں کو تسلیم کرنے سے وابستہ ہے۔

☆ ہر دو جانب اپنے تخلیقی ادب کی بابت مبالغے کی حد تک خوش فہمی میں گرفتار ہونا بھی نیک شگون نہیں۔ آپ کی رائے میں کس طرف کے کس کام کو زیادہ اعتبار حاصل ہے؟

☆☆ گستاخی معاف ہو یہ کام ایک جانب ہی سے ہو رہا ہے۔ پاکستان کا کوئی اچھا ادیب ایسا نہیں ہے جس سے ہندوستان کا پڑھا لکھا آدمی واقف نہ ہو۔ یہاں کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں پاکستان کے سارے اچھے ادیب شامل ہیں۔ ان کو پاکستانی ادیب نہیں اردو ادیب کی حیثیت سے پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے لیکن پاکستان کے ادیب اور خاص طور سے نقاد ہندوستان کے اردو ادب کے بارے میں لاعلم ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ یہ افسوس کا مقام ہے۔

☆ گفتگو کے اختتام پر اردو زبان، ادب، شاعری کے حوالے سے برصغیر کے اردو داں حلقوں کی یکجائی اور یکسوئی کی بابت آپ کی خواہشات اور توقعات؟

☆☆ ادب کی سطح پر دونوں ملک خاص طور سے ہندوستانی اردو میں ہونے والی ہر سرگرمی سے واقف ہیں۔ مشاعروں، کانفرنسوں اور سیمیناروں کی وجہ سے ایک دوسرے سے ملنے کے اردو شاعروں اور ادیبوں کو کثرت سے مواقع میسر آتے ہیں۔ کتابوں کے آنے جانے پر سیاسی سطح پر معاہدوں کی سخت ضرورت ہے۔ اس وقت جو خوشگوار فضا ہے وہ ہمیشہ قائم رہے۔ یہ میری خواہش ہے۔

ہم سے خلوت گزیدہ گنہگار

گوپی چند نارنگ (دہلی بھارت)

حال ہی میں بعض نئے شاعروں نے اردو کا رشتہ ایک بار پھر ادب کے عالمی رجحانات سے جوڑ دیا ہے۔ ان میں سے دو رجحانات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جو جدید دور کے ثقافتی انتشار، آدرش کے فقدان اور انسان کے بے چہرہ ہونے کے تصور سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان کے زیرِ اثر جو نئی شاعری لکھی جا رہی ہے وہ نئی نسل کے اس انسان کی آواز ہے جس کے پاس نہ اقدار کا سرمایہ ہے نہ آدرش کا آئینہ اور جس کا وجود خود اس کے لیے ایک سوالیہ نشان بن گیا ہے۔ یہ ہر طرح کی رقیانوسیت اور روایت کے خلاف ہے۔ یہ ایسا باغی کہا گیا ہے جس کا کوئی آئیڈیل نہیں۔ اردو شاعری جدید دور کے اس جلاوطن انسان سے حال ہی میں متعارف ہوئی ہے۔ اگر ہم اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالیں اور ہم عصری تہذیب کے انتشار اور اضطراب کو سمجھنے کی کوشش کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ آسیب ہمارے دور کی خصوصیت بن چکا ہے۔ ہمارا زمانہ کلچر کے زوال، قدروں کی پامالی اور یقین کے فقدان کا زمانہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ احساس پہلے مغرب میں عام ہوا، بعد میں مشرق میں پہنچا۔ مشرق و مغرب میں جو فرق پہلے تھا وہ آج بھی ہے لیکن صنعتی تہذیب کے فروغ کی وجہ سے آج پورے عالمِ انسانیت کو ہر کہیں تقریباً ایک جیسے خطرات کا سامنا ہے۔

نئے اثرات کے تحت لکھی جانے والی شاعری مواد اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے پچھلی شاعری سے اس قدر مختلف ہے کہ پرانی ادبی اصطلاحوں اور ترکیبوں کی مدد سے اسے نہ سمجھا جا سکتا ہے اور نہ پرکھا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر یہ کہا جائے کہ یہ روایت سے منحرف کی شاعری ہے یا یہ باغیانہ شاعری ہے یا یہ کہ اس میں ایک باغی کی لے ملتی ہے تو یہ اس شاعری سے انصاف نہ ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ پرانے تنقیدی لیبل اس پر ٹھیک نہیں بیٹھتے، کیونکہ یہ نہ تو صرف عصریت کی شاعری ہے نہ ذہنی بغاوت کی، یہ نہ داخلیت کی آواز ہے نہ خارجیت کی۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں کی تقسیم بھی یہاں بیکار نظر آتی ہے۔ یہ فرار یا اقرار کی شاعری بھی نہیں۔ یہ انسان کو اس کے وجودی روپ میں دیکھنے کی جستجو ہے، یا غم اور مسرت سے الگ سمجھنے کی کوشش۔

معلوم ہوتا ہے کہ سائنس اور صنعتی ترقی نے اپنے ارتقا کا ایک دائرہ ختم کر لیا ہے اور انسان کو پھر ایک نئے چیلنج کا سامنا ہے۔ لیکن یہ چیلنج اس چیلنج سے مختلف ہے جب آج سے تقریباً دو سو سال پہلے سائنس نے انسان کو ایک نئی قوت و توانائی اور نئی زندگی کی بشارت دی تھی۔ اس وقت انسان ایک دوراہے پر کھڑا تھا۔ ایک راستہ مذہبیت کا تھا، دوسرا عقلیت کا۔ ایک قدامت کی طرف جاتا تھا، دوسرا صنعتی ترقی و مادی راحت و فراغت کی طرف، اور انسان کو ان دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ لیکن اب حالت دوسری ہے۔ اب ہم دوراہے پر نہیں کھڑے ہیں کہ دو میں سے ایک راستے کا انتخاب کر سکیں؛ بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جس راستے پر ہم چل رہے تھے، اس کی آخری حد تک پہنچ گئے ہیں اور سامنے ہر طرف دھند ہی دھند ہے۔ یہاں تک پہنچنے کے لیے انسان نے یقین اور اعتماد کی شمعوں کو کیسے کیسے فروزاں نہیں رکھا اور محنت و کوشش سے کیا کیا نہیں کیا؟ اس نے قدرت کی کلائیوں کو مروڑا، پہاڑوں کے جگر چیرے، سمندروں کو مٹھی میں بند کیا، دریاؤں کے رُخ بدلے، صحراؤں کو چمن زاروں اور چمن زاروں کو رشکِ ارضی کے نمونوں میں تبدیل کر کے رکھ دیا۔ صنعتی تہذیب کی انگلی پکڑ کر وہ تمول اور مادی آسائش کے آخری زینے تک بھی جا پہنچا لیکن اس کے دل کی ویرانی کم نہیں ہوئی بلکہ اس میں اضافہ ہی ہوا اور میکانکی زندگی کے بکھرے پن اور تیز رفتاری میں وہ خود کو بھی کھو بیٹھا۔ اس نے سمجھا تھا کہ نئے طاقتور صنعتی وسائل اور ساز و سامان سے اس کی تمام مشکلیں آسان ہو جائیں گی اور اس کے سب مسائل حل ہو جائیں گے۔ امیدوں کا وہ طلسم ٹوٹ چکا ہے۔ زندگی آج بھی موت کے منہ میں ہے۔ مسرت آج بھی گریزاں ہے۔ نگاہوں کی تشنگی، دل کے درد اور روح کے کرب کا آج بھی وہی عالم ہے۔ زندگی پر غم کا سنگین پہرہ آج بھی ہے۔ حسرت آج بھی خون کے آنسو روتی ہے اور ارمانوں کی بارات آج بھی نکلتی ہے۔

ہمارے دور کا سب سے بڑا المیہ صنعتی زندگی کی حشر سامانی ہے۔ اس سے پیدا ہونے والے انتشار میں زندگی اپنی وحدت کے احساس سے محروم ہو چکی ہے۔ زندگی کی ابتدا اور انتہا کا سراغ نہ پا سکنے اور اپنے وجود کا منصب نہ سمجھ سکنے کا احساس پہلے سے کئی گنا بڑھ چکا ہے۔ ہست و بود یا زندگی اور موت کے درمیان جو کشمکش جاری ہے اس کا بھی انسان کو پہلے سے زیادہ احساس ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی تقدیر اس کے اپنے ہاتھوں میں ہے لیکن پھر بھی وہ اپنی خوشی و غم پر قادر نہیں۔ قدم قدم پر اسے ہاں اور نہیں یا جینے اور مرنے یا مٹنے اور نہ مٹنے کے درمیان فیصلہ کرنا پڑتا ہے اور یہ فیصلہ اسے اکیلے ہی کرنا پڑتا ہے۔ اس کی پوری ذمہ داری خود اس کے سر ہے۔ گو انسان کو اس فیصلے کا پورا اختیار ہے لیکن یہ اختیار بجائے خود ایک جبر بن گیا ہے کیونکہ انسان جب تک زندہ ہے وہ اس سے بچ نہیں سکتا۔ گویا یہ ایسی صلیب ہے جس پر انسان کا وجود ہر وقت لٹکا ہوا ہے۔ اس ذہنی اضطراب میں زندگی کی کوئی چیز ویسے نظر نہیں آتی جیسے وہ اب تک نظر آیا کرتی تھی۔ نہ روشنی روشنی معلوم ہوتی ہے نہ تاریکی تاریکی۔ نئی نسل کے برافروختہ انسان کی دنیا میں نہ کوئی جذبوں کے تم

ڈھلتا ہے نہ کوئی وفاؤں کے گیت گاتا ہے۔ وصل وفراق، کامرانی وناکامی، خوشی وغم سب بے معنی اور بے رس معلوم ہوتے ہیں۔ عجیب بے حسی اور عجیب احساس کا عالم ہے۔ یہ بے حسی اور احساس اُس بے حسی اور احساس سے قطعاً مختلف ہیں جن کے لغوی اور روایتی معنوں سے ہمارے ذہن آشنا ہیں۔ یہ احساس ایک طرح کی آگہی بھی ہے۔ نئی شاعری اسی بے نام بے حسی اور آگہی کی شاعری ہے۔ یہاں اس سے متعلق مزید گفتگو کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ شہریار کے مجموعہ کلام "اسم اعظم" سے ان دو نظموں کو ایک نظر دیکھ لیا جائے:

لازوال سکوت

مہیب، لمبے، گھنے پیڑوں کی گہری شامیں
کبھی کبھی کوئی اشلوک گنگناتی تھیں
کبھی کبھی کسی بچے کا دل دھڑکتا تھا
کبھی کبھی کوئی کوئل درود پڑھتی تھی
کبھی کبھی کوئی جگنو الکھ جگاتا تھا
کبھی کبھی کوئی طائر ہوا سے لڑتا تھا
کبھی کبھی کوئی پرچھائیں چیخ پڑتی تھی
اور اس کے بعد مری آنکھ کھل گئی میں نے
سرہانے رکھے ہوئے تازہ روزنامے کی
ہر ایک سطر بڑے غور سے پڑھی لیکن
خبر کہیں بھی کسی ایسے حادثے کی نہ تھی
اور اس کے بعد میں دیوانہ وار چیخنے لگا
اور اس کے بعد ہر اک سمت لازوال سکوت
اور اس کے بعد ہر اک سمت لازوال سکوت

سائے کی موت

دن کا دروازہ ہوا بند، شب تار آئی
راستے کروٹیں لینے لگے
گلیوں میں اُداسی چھائی
سارے ہنگامے وہ سب رونقیں (دن کی ہمراز)
کوٹھڑی جیلوں میں ہوئیں قید
چلو اب نکلیں
اپنی تنہائی کے اس خول سے باہر
دیکھیں
اپنا سایہ کہاں جاتا ہے شب تار میں آج
کون سی یادوں کو چونکاتا ہے
کس پل کو صدا دیتا ہے
آج کیا کھوتا ہے کیا پاتا ہے
کس طرح چڑھتا ہے گھٹتا ہے بکھر جاتا ہے
کیسے مر جاتا ہے؟

شہریار کے یہاں ان سے مختلف نظمیں ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا لیکن ابھی ہم نئی شاعری کی فضا کی بات کر رہے تھے، وہ ان نظموں میں بتمام وکمال موجود ہے۔ ان نظموں میں جس احساس کی کارفرمائی ہے وہ آگہی کی چوٹ کھائے ہوئے ہے۔ انسان کو اپنے سفر ارتقا میں آج تک جن جن کامیابیوں اور ناکامیوں کا سامنا رہا ہے۔ یہ آگہی ایک لحاظ سے ان سب کا حاصل ضرب ہے۔ یہ صدیوں سے دیکھے ہوئے خوابوں کی شکست کی آواز ہے۔ اس نے آرزوؤں کے آنسو پونچھے ہیں، ماضی کو تاریکی کے غار میں اترتے پایا ہے اور یادوں کے قافلوں کو سکوت کے سمندر میں غرق ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔

یہ شاعری فقط "تصوراتی" کے گھسے پٹے معنوں میں تصوراتی نہیں، بلکہ اس معنی میں تصوراتی ہے کہ اس کی اپنی ایک الگ دنیا ہے اور اس کا اپنا ایک موضوع ہے جس کی کوئی حدود نہیں اور جس کی کوئی بندھی ٹکی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ اس شاعری کی اپنی کچھ علامتیں ہیں جو اسے معنویت عطا کرتی ہیں۔ میرے نزدیک اس شاعری کا جیسا اظہار شہریار کے یہاں ہوا ہے اس میں بنیادی اہمیت چار علامتوں کو حاصل ہے۔ خواب، آگہی، وقت اور موت۔ ان علامتوں پر ہمیں لغوی یا روایتی معنی مسلط کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ ان کے معنی وہی مراد لینے ہوں گے جو یہ شاعری خود انہیں عطا کرتی ہے اور جن کا ذکر آگے چل کر کیا جائے گا۔ ان میں ایک طرف خواب اور آگہی سے پیدا ہونے والے تصورات میں کشمکش ہے تو دوسری طرف وقت اور موت سے پیدا ہونے والے تصورات ایک دوسرے کے مد مقابل ہیں۔ اگر ان چار علامتوں کی بنیادی حیثیت کو تسلیم کر لیا جائے تو شہریار کے ہاں استعمال ہونے والی باقی تمام علامتیں ان ہی کے پیچھے صف بستہ نظر آئیں گی۔ سب سے پہلے نظم "خواب" کو لیجیے:

تھکی تھکی آرزو کی گٹھری ہے
رات بھر بارش ہی سے بچنے سے
ہونٹ اُمید کے پھڑکتے ہیں
پاؤں حسرت کے لڑکھڑاتے ہیں
دور پلکوں سے آنسوؤں کے قریب
نیند دامن سمیٹے بیٹھی ہے
خواب تعبیر کے شکستہ دل

آج پھر جو نئے زخم آئے ہیں

اس حسین نظم کے آٹھ مصرعوں میں سات چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے: آرزو، رات، اُمید، حسرت، نیند، تعبیر اور خواب۔ اور یہ سب کے سب آٹھو رات خواب کے ذیل میں آتے ہیں، جو اس نظم کا عنوان بھی ہے۔ اس کے بعد ان دو نظموں کو غور سے پڑھیے:

فریب در فریب

دن کے صحرا سے جب بنی جاں پر
ایک مبہم سا آسرا پا کر
ہم چلے آئے اک طرفِ شب
رات کے اس قلمرو میں
خواب کی کشتیوں کو کھیتے ہیں!

ایک منظر

نیند کی سوئی ہوئی خاموش گلیوں کو جگاتے
گنگناتے
مشعلیں پلکوں پہ اشکوں کی جلائے
چند سائے
پھر رہے تھے
رات جب ہم خواب کی دنیا سے واپس آ رہے تھے

ان دو نظموں میں سے پہلی نظم لفظ "دن" سے شروع ہوتی ہے جو آگہی کی علامت ہے اور خواب کے تصور پر ختم ہوتی ہے جو آگہی کی نفی ہے۔ اس طرح "ایک منظر" میں لفظ "سایہ" علامت ہے شعور و فراست کی یا زخم خوردہ حساس انسان کی۔ آخری مصرعے میں خواب کا ذکر ہے جسے شعور کے مدِ مقابل کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے گویا اس شاعری میں ایک طرف خوابوں، آرزوؤں اور امیدوں کی دنیا ہے اور دوسری طرف آگہی و حقائق کی۔ ان دونوں میں ایک طرح کی Polarization یعنی ربط و تضاد ہے۔ یہ شاعری مواد کی سطح پر اپنا حسن اسی کشمکش اور تضاد سے حاصل کرتی ہے۔ یہ شاعری چونکہ تنہائی اور شعور کی دھوپ میں جھلسی ہوئی ہے اس لیے اس کی نظریں سکون و عافیت کے لیے زیادہ تر "رات" کی طرف اٹھتی ہیں۔ "رات" اور "خواب" کے سلسلے کے دوسرے امیجز میں "نیند" اور "مہتاب" قابلِ ذکر ہیں۔ آگہی کی دنیا میں مہتاب کے مقابلے میں "سورج"، "نیند" کے مقابلے میں "جاگتی آنکھیں" اور "رات" کے مقابلے میں "دن" کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے کی سب سے کثیر الاستعمال علامت "سایہ" ہے گو یہ لفظ اپنے روایتی معنوں میں یعنی دھوپ کی نفی یا گوشۂ عافیت یا سکون و راحت کے لیے بھی استعمال ہوا ہے (ملاحظہ ہو نظم آشوبِ آگہی) لیکن علامت کی حیثیت سے "سایہ" کا استعمال "خواب" کی ضد کے طور پر یا زندگی کے جبر کے ہاتھوں بے بس انسان کے لیے یا شعور و فراست کے لیے ہوا ہے جیسا کہ اوپر "ایک منظر" یا "سائے کی موت" میں دکھایا گیا یا اس مختصر نظم سے ظاہر ہے:

ایک رات کا منظر

ہچکیوں کے پیچ و خم کے سلسلے
آہٹوں کے گھٹتے بڑھتے دائرے
آنسوؤں سے تر تنہائیاں
دھند میں لپٹی ہوئی سرگوشیاں
زرد رو مہتاب اور گرما کی رات
آسماں کی سمت اک سائے کے ہاتھ

یہ نظم اس قابل ہے کہ اس کا شمار شہریار کی حسین ترین مختصر نظموں میں کیا جائے۔ اس میں جتنے امیجز آئے ہیں وہ سب کے سب علامتی طور پر "سایہ" سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس شاعری میں "سایہ" کے علامتی معنوں میں بعض جگہ لفظ "پرچھائیں" بھی استعمال ہوا ہے (ملاحظہ ہو نظم پرچھائیاں)۔ آگہی کی دنیا "دن کے عذاب کی" اور "سورج" اور "دھوپ" کی دنیا ہے جبکہ "خواب" کی دنیا "نیند"، "رات" اور "مہتاب" کی دنیا ہے۔ یہ "آرزو" اور "امید" کی روشنی کا مسکن ہے جبکہ آگہی کی دنیا میں "ناامیدی"، "اداسی" اور "غم" ہے۔ آگہی کی دنیا کو "دشت" اور "صحرا" سے بھی تشبیہہ دی گئی ہے جس میں ہر طرف "خلا" یعنی "خلا" اور "سناٹا" یعنی "سناٹا" ہے۔ انسان یہاں "اجنبی" ہے اور "تنہائی" کا احساس اسے کھائے جاتا ہے اور خواب کی دنیا سے کوئی "صدا" یا "آواز" اس تک نہیں آتی۔ خواب اور آگہی کی ان دو دنیاؤں میں جو چیز ربط قائم رکھے ہوئے ہے وہ "وقت" ہے۔ اب اس کی مدد سے امیجز کے ان دو سلسلوں کے باہمی ربط و تضاد کو یوں ظاہر کیا جا سکتا ہے:

وقت (لمحہ، پل)

(سپنا) خواب	آگہی، سایہ، پرچھائیں
نیند	بیداری
رات	دن
مہتاب	سورج
آرزو اور امید کی روشنی	ناامیدی، اداسی و غم کی تیرگی، دھند اور غبار
(آواز) صدا	سناٹا، خلا، تنہائی، اکیلاپن، اجنبیت

یہ وقت ہی ہے جو خواب اور آگہی اور نیند اور بیداری اور رات اور

ان میں ایک گونہ تعلق قائم رکھے ہوئے ہے۔وقت نہ ہو تو ان کی Polarization یعنی باہمی ربط و تضاد باقی نہ رہے۔اس شاعری میں وقت ہی کو "زیست کا حاصل اور حقیقت" قرار دیا گیا ہے:

اندھے دن کو گونگی رات سے کیا نسبت ہے
گھائل چاند کی گھائل کرنوں کا سایہ
اس دھرتی کو کیوں بھاتا ہے
سورج کی سرشار شعاعیں
اس دھرتی کو کیوں ڈستی ہیں
ہر 'کل' کیوں اس 'آج' کے پیکر میں ڈھلتا ہے
اور انسان کو 'آج' اور 'کل' سے کیا ملتا ہے
کیوں ہم فانی اور امر ہیں
پل، لمحے، دن، سال، دو صدیاں
یہ سب باتیں نقلی سی ہیں
لیکن یہ ہی زیست کا حاصل اور حقیقت صرف یہی ہیں

اس شاعری میں وقت ہی وہ مرکز و محور ہے جس کے گرد یہ سلسلۂ تصورات مسلسل گردش میں ہے۔

انسان کا مقدر یہی ہے
دھوپ میں تنہائی کی جسموں کو جھلساتے رہو
وقت کے صحرا میں یونہی ٹھوکریں کھاتے رہو
(وقت کے صحرا میں)

انسان لاکھ سر مارے ماضی کو پلٹ کے نہیں آتا (وقت) انسان کو امروز و فردا کی بھی خبر نہیں ہے۔دونوں اس کی دسترس سے باہر ہیں۔(افسون امروز)۔ماضی اندھیرا ہے اور مستقبل غبار کے علاوہ کچھ نہیں۔جو کچھ ہے وہ حال ہے اور حال میں بھی لمحۂ حالیہ۔انسان دراصل لمحہ لمحہ ہی جیتا ہے۔("تضاد"، "بدوا")

جس طرح وقت خواب و آگہی کے سلسلے کو قائم رکھے ہوئے ہے اسی طرح جو چیز اسے منقطع کر دیتی ہے وہ "موت" ہے۔موت وقت کی نفی ہے۔زندگی میں وقت کے مدمقابل اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے تو وہ "موت" ہی ہے۔جتنی بڑی حقیقت وقت ہے اتنی ہی تلخ حقیقت موت بھی ہے۔ملاحظہ ہو نظم "قبرستان" سے یہ اقتباس:

جہاں ہم سے خلوت گزیدہ گنہگار بندوں کی
اک انجمن ہے
زمیں کا وہ حصہ حقیقت ہے ارض و سما کی

خودی کی شفا کی

موت ایک ایسا مسیحا ہے جو اس دور کے عذاب و کرب کے لیے شفا کا پیغام لاتا ہے۔یہ انفرادی ذمہ داری کے کھائے جانے والے احساس اور باشعور زندگی بسر کرنے کے لیے کیمیا کا کام کرتی ہے چنانچہ شاعر زہر کو اس دور کا "نیا امرت" قرار دیتا ہے:

دواؤں کی الماریوں سے سجی اک دکاں میں
مریضوں کے انبوہ میں مضمحل سا
اک انسان کھڑا ہے
جو اک نیلی کبڑی سی شیشی کے سینے پہ لکھے ہوئے
ایک اک حرف کو غور سے پڑھ رہا ہے
مگر اس پہ تو "زہر" لکھا ہوا ہے
اس انسان کو کیا مرض ہے
یہ کیسی دوا ہے؟

موت کے ذکر کے ساتھ ساتھ اس شاعری کا سلسلۂ تصورات مکمل ہو جاتا ہے۔اب اس کو مربوط طور پر یوں پیش کیا جا سکتا ہے:

وقت

موت

یہاں قاری کے ذہن میں لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوگا کہ یہ شاعری اپنی نوعیت کے اعتبار سے مثبت ہے یا منفی؟ قنوطی ہے یا رجائی؟ اس سوال کا یہ جواب کچھ عجیب سا معلوم ہوگا لیکن واقعہ یہی ہے کہ ان الفاظ کے پرانے معنی میں یہ شاعری نہ قنوطی ہے نہ رجائی۔اس سے نہ مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں نہ منفی۔یہ سوال اکثر اس لیے اٹھایا جاتا ہے کہ ہم شاعری کے بارے میں روایتی طور پر مقصدی اور اصلاحی نقطۂ نظر سے سوچنے کے عادی ہو چکے ہیں اور اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ شاعری حالی، سرسید کے دور سے لے کر اقبال و جوش و جگر تک کی شاعری سے اس لحاظ سے بالکل مختلف ہے کہ یہ براہ راست سماجی سیاسی نوعیت کی نہیں۔یہ دور آگہی کے آشوب کا دور ہے۔آج کا انسان اپنے شعور کے ہاتھوں پریشان ہے۔اس کے دکھ درد اور غم کی نوعیت بالکل دوسری ہے۔اس کی الجھنیں اور مسائل بھی پچھلے دور کے انسان کی الجھنوں اور مسائل سے مختلف ہیں۔ان کا کوئی حل ابھی اس دور کے انسان کو نہیں سوجھا۔اس لیے یہ شاعری نتائج کی یا پیغام کی شاعری نہیں۔یوں اس کے بعض جوانب ایسی کئی ہیں اور اس لحاظ سے اگر کوشش کی جائے تو اس میں مثبت اور منفی عناصر الگ الگ تلاش کر کے دکھائے جا سکتے ہیں لیکن ان سے کوئی واضح فیصلہ اخذ کرنا مناسب نہ ہوگا کیونکہ یہ اس شاعری کی معنوی وحدت کو

مجروح کرنے اور اس کے ایک حصے کو نظر انداز کر کے دوسرے کو پیش کرنے
والی بات ہوگی۔ افسوس ہے کہ اس طرح کی چند کوششیں کی بھی گئی ہیں جو ہر لحاظ
سے مضحکہ خیز ہیں اور ہماری ہمدردی کی مستحق ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ یہ
شاعری بنیادی طور پر اس دور کے زخم خوردہ انسان کی اندرونی پیاس، روحانی
کرب اور شعوری الجھنوں کی شاعری ہے۔ یہ ایک طرف خواب و آگہی اور
دوسری طرف وقت و موت کی قوتوں کے درمیان کشاکش کی شاعری ہے اور
زندگی کی معنویت کی تلاش میں سرگرم عمل ہے۔ یہ زندگی کے اصلی چہرے کو جیسا
کہ وہ غم اور مسرت کے لمحوں میں نظر آتا ہے پہچاننے کی کوشش کرتی ہے اور
حال کے لمحۂ حاضر میں جینا چاہتی ہے۔ مستقبل کی یہ شاعری قائل نہیں۔ اسے خود
نہیں معلوم کہ انسان کی اگلی منزل کیا ہوگی۔ منزل اس کے نزدیک "سراب" بھی
ہے اور "پاگل کا سپنا" بھی (آدرش)۔ چنانچہ یہ شاعری مسرت اور غم کے لمحوں
کے احساس کی شاعری ہے۔

جہاں تک ان نظموں کے فارم کا تعلق ہے اس امر کی طرف اشارہ
ضروری ہے کہ شہریار نے بے تکی جدت طرازی سے کام نہیں لیا جو اکثر نئے
شاعروں کا طرۂ امتیاز ہے لیکن جس سے غیر ضروری اشکال پیدا ہوتا ہے اور کلام
سے لطف و اثر جاتا رہتا ہے۔ شہریار نے اس سلسلے میں روایت اور جدیدیت
کے امتزاج کو ملحوظ رکھا ہے۔ ان کی مختصر نظمیں تکنیک کے اعتبار سے نہایت
کامیاب ہیں۔ ان میں سے "خواب"، "فریب در فریب" اور "ایک
منظر" کا حوالہ دیا جا چکا ہے۔ ان کے علاوہ مجموعے سے "پرچھائیاں" اور
"قرب قیامت" بھی ملاحظہ فرمائی جائیں۔ یہ تمام نظمیں معنوی وحدت کے
اعتبار سے مکمل اکائیاں ہیں اور موضوع کے تاثر کو ابھارنے میں پوری طرح
کامیاب ہیں۔

آخر میں شہریار کی غزلوں سے چند اشعار دیکھیے جن میں نئی
شاعری کے ان تمام عناصر کی کارفرمائی ایک بلیغ اشارے اور ایمائیت کے ساتھ
ملے گی جن کا ذکر نظموں کے سلسلے میں اوپر کیا جا چکا ہے:

دل ہے تو دھڑکنے کا بہانہ کوئی ڈھونڈے
پتھر کی طرح بے حس و بے جان سا کیوں ہے
ہم نے تو کوئی بات نکالی نہیں غم کی
وہ زود پشیمان، پشیمان سا کیوں ہے
زباں ملی بھی تو کس وقت بے زبانوں کو
سنانے کے لیے جب کوئی داستاں نہ رہی
لوگ سر پھوڑ کر بھی دیکھ چکے
غم کی دیوار ٹوٹتی ہی نہیں
ہوا کا جھونکا بھی جس راہ پر نہیں آتا
نہ جانے کس لیے اس راہ پر کھڑے ہیں لوگ
عجیب چیز ہے یہ وقت جس کو کہتے ہیں
کہ آنے پاتا نہیں اور بیت جاتا ہے
یہ کیا جگہ ہے دوستو یہ کون سا دیار ہے
حد نگاہ تک جہاں غبار ہی غبار ہے
ہمیں تو اپنے دل کی دھڑکنوں پہ بھی یقین نہیں
خوشا وہ لوگ جن کو دوسروں پہ اعتبار ہے
ہزار پرسش غم کی مگر نہ اشک بہے
صبا نے ضبط یہ دیکھا تو لاجواب ہوئی
ہمیں تو یاد تھی بپھری جہاں بھی
بہانہ مل گیا اس کو تغافل کا
بے تاب ہیں اور عشق کا دعویٰ نہیں ہم کو
آوارہ ہیں اور دشت کا سودا نہیں ہم کو
یا تیرے علاوہ بھی کسی شے کی طلب ہے
یا اپنی محبت پہ بھروسا نہیں ہم کو
جو چند لمحے وقت نے دے دیے ہیں ان کا کیا کریں
وہ جیب واعظ نہیں ہو رہا حیات تنگ ہے
عجیب سانحہ مجھ پر گزر گیا یارو
میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو!
وہ کون تھا وہ کہاں تھا یہ کیا ہوا تھا اسے
سنا ہے آج کوئی شخص مر گیا یارو!
نذرانہ تیرے حسن کا کیا دیں کہ اپنے پاس
لے دے کے ایک دل ہے سو ٹوٹا ہوا سا ہے
جب بھی ملتی ہے مجھے اجنبی لگتی کیوں ہے
زندگی روز نئے رنگ بدلتی کیوں ہے

ان اشعار میں جو انفرادیت اور تازگی ہے وہ عام قسم کی انفرادیت
اور تازگی سے مختلف ہے۔ ان میں سے تغزل کی جھلک ہے وہ نئی نسل کے
شاعروں کے یہاں عام ہوتی جاتی ہے۔ اس سے جہاں صنف غزل سے
ہماری محبت کا پتا چلتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غزل بھی اس کے بدلے
میں بڑی فیاضی سے کام لیتی ہے اور ہمیشہ ہماری محبت کو کئی گنا بڑھا کر ہمیں
لوٹاتی ہے۔

○

دنیا کا طالب گار نہیں

مجتبیٰ حسین (حیدرآباد دکن)

شہریار سے میری شخصی دوستی کچھ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ پانچ سال پہلے میرے دوست ڈاکٹر حسن عسکری شعبہ سماجیات میں ریڈر بن کر حیدرآباد سے علی گڑھ آئے تو ایک دن میں ان سے ملنے کے لیے یونہی علی گڑھ چلا گیا۔ شہریار بھی حسن عسکری کے یہاں یونہی چلے آئے اور میری ان سے یونہی ملاقات ہو گئی۔ جو دوستیاں بس یونہی شروع ہو جاتی ہیں وہ ہمیشہ اچھی ہوتی ہیں۔ حسن عسکری اگرچہ لندن چلے گئے ہیں لیکن جو لوگ حسن عسکری سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ حسن عسکری سے ملنے کے بعد آدمی کو کسی اور سے ملنے کی حاجت نہیں رہ جاتی۔ شہریار سے حسن عسکری کی موجودگی میں بھی ملنے کو جی چاہا۔ رات حسن عسکری کے گھر پر محفل جمی۔ عسکری نے اپنی باتوں کا جادو جگایا۔ اس کے بعد شہریار نے اپنی شاعری کا جادو کچھ اس طرح جگایا کہ ہم لوگ ساری رات جاگتے رہے۔ صبح ہونے لگی تو شہریار جانے لگے۔ میں نے پوچھا "کہاں جایئے گا؟" بولے "یونیورسٹی کلب جا رہا ہوں۔"

معلوم ہوا کہ یہ کلب جائیں گے اور تاش کھیلیں گے۔ دوسرے دن دوپہر میں حسن عسکری کے ساتھ یونیورسٹی کلب گیا تو دیکھا کہ شہریار بڑے انہماک کے ساتھ تاش کھیل رہے تھے۔ تیسرے دن میں دلی واپس ہونے لگا تو سوچا کہ شہریار سے مل لوں۔ ان کے گھر گیا تو بھابی (مسز نجمہ شہریار) نے بتایا کہ وہ یونیورسٹی کلب میں تاش کھیل رہے ہیں۔ مگر میں ان سے ملنے کے لیے یونیورسٹی کلب نہیں گیا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ وہ اسی محفل پر اسی انہماک کے ساتھ تاش کھیل رہے ہوں گے۔

شہریار سے میری پہلی ملاقات تھی۔ میں ان کی شاعری کا پرانا مداح تو تھا ہی لیکن تاش کے لیے ان کے انہماک کو دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ مجھے جو شخص تاش کے لیے اتنا سنجیدہ ہو سکتا ہے وہ دوستی کیا خاک کر سکے گا۔ مگر اس کے بعد شہریار ایک دن اچانک دلی آ گئے اور اتفاق سے میرے دفتر کے گیسٹ ہاؤس میں مقیم ہوئے۔ اس وقت انہوں نے احساس دلایا کہ جس انہماک کے ساتھ وہ تاش کھیلتے ہیں اسی انہماک کے ساتھ دوستی بھی کر سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ جب دوستی کرتے ہیں تو تاش نہیں کھیلتے اور جب تاش کھیلتے ہیں تو دوستی نہیں کرتے۔ اس کے بعد سے شہریار سے کئی ملاقاتیں علی گڑھ اور دلی میں ہو چکی ہیں۔ وہ دلی آنے والے ہوتے ہیں تو میں ان کے لیے آنکھیں بچھاتا ہوں اور جب میں علی گڑھ جانے والا ہوتا ہوں تو وہ میرے لیے آنکھیں بچھاتے ہیں۔ شہریار ایک سچے بے نیاز آدمی ہیں۔ اپنی شاعری سے بے نیاز، اپنی زندگی سے بے نیاز اور اپنے گھر سے بے نیاز۔ نہ شہرت کی طلب، نہ عہدے کی ہوس، نہ پیسے کی لالچ، نہ مرتبے کی حرص۔

میانہ آدمی عموماً اپنے گھر میں بڑا آدمی اور سماج میں ہمیشہ غیر بڑا آدمی ہونے کے سارے تصادمات برداشت کرتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب غیر بڑا آدمی فاکے میں رہتا تھا مگر اب بڑا آدمی فاکے میں رہتا ہے۔ بڑے آدمی سے لوگ ڈرتے ہیں اور جس کی خاطر بڑا آدمی بنتا ہے وہ اس کے مفادات کا تحفظ بھی کرتے ہیں جب کہ غیر بڑا آدمی زندگی کا سفر کچھ اس طرح طے کرتا ہے کہ:

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

شہریار کو میں نے ہر حلقے اور ہر گروہ میں غیر بڑا ہی پایا ہے۔ وہ ایک میانہ گھاٹ ہیں جس پر شیر اور بکری دونوں ایک ساتھ پانی پیتے ہیں۔ شہریار کی اس ادا کے باعث میں جب بھی علی گڑھ جاتا ہوں تو انہی کے پاس ٹھہرتا ہوں اور حتی المقدور انہیں نقصان پہنچاتا ہوں۔ شہریار کی جن خصوصیات کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے ان کے تقاضے کے طور پر شہریار زندگی کو بہت دھیمے انداز میں برتتے ہیں۔ نہ زندگی میں کچھ پانے کی جلدی اور نہ ہی کچھ کھونے کی عجلت۔

وہ محض شاعر نہیں ہیں۔ خود سے کبھی شعر نہیں سناتے۔ بہت اصرار کیا تو کسی غزل کے دو چار شعر سنا دیں گے۔ داد سے بے نیاز ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ کسی شعر پر داد دی جائے تو جھک جھک کر سلام نہیں کرتے۔ وہ خاص محفلیں اور خاص لمحے ہوتے ہیں جب شہریار ترنم سے کلام سناتے ہیں۔ میں نے ایسی خاص صحبتوں اور خاص لمحوں کا کافی لطف اٹھایا ہے۔ شہریار سے جب میری ملاقات ہوئی تھی تو فلموں سے ان کا تعلق پیدا نہیں ہوا تھا۔ ایک دن اچانک پتہ چلا کہ شہریار فلم "گمن" کے لیے گیت لکھ رہے ہیں۔ فلم ریلیز ہوئی تو میں نے بطور خاص یہ فلم دیکھی۔ میں فلمیں بہت کم دیکھتا ہوں اور وہ بھی صرف ایسی فلمیں دیکھتا ہوں جن کے بارے میں پتہ ہو کہ اس کے گیت یا مکالمے کسی دوست نے لکھے ہوں۔ ہمارے ایک دوست نے ایک فلم کی کہانی اور مکالمے لکھے تھے اور میرے علاوہ کئی دوستوں سے خواہش کی تھی کہ جب فلم ریلیز ہو تو اسے ضرور دیکھیں۔ دوست کا دل رکھنے کے لیے میں وقت آنے پر ہندوستانی فلمیں بھی دیکھ لیتا ہوں۔ سو ہم چار احباب مل کر یہ فلم دیکھنے گئے۔ شو کا وقت ہوا تو دیکھا کہ تھیٹر خالی ہے اور فلم کے مکالمہ نگار کے صرف چار احباب تھیٹر میں موجود ہیں۔ فلم کو ساڑھے چھ بجے شروع ہونا تھا مگر سات بجے تک بھی فلم شروع نہ ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد تھیٹر کا منیجر ہمارے پاس آیا اور ہمارے دوست کا نام لے کر کہنے لگا "آپ غالباً فلم کے مکالمہ نگار کے دوست معلوم ہوتے ہیں۔" ہم نے کہا "بے شک ہم ان کے دوست ہیں۔"

منیجر بولا "صاحب! ایک احسان اپنے دوست کی خاطر کیجیے کہ یہ فلم نہ دیکھیے۔ آپ نے جو ٹکٹ خریدے ہیں اس کے چوگنا دام میں آپ کو دینے کے لیے تیار ہوں۔ کوئی اچھی سی فلم دیکھ لیجیے۔ آپ چار احباب کے لیے فلم چلاؤں تو دو ڈھائی سو روپے خرچ آ جائے گا۔ ہم پر یہ احسان کیجیے پلیز۔"

اور اس کے بعد ہم نے منیجر سے چوگنا دام وصول کیے اور بڑی اچھی سی شام گزاری۔ شہریار کی فلم بھی اس خیال سے دیکھنے گیا تھا کہ فلم دیکھنے سے پہلے

شاید گلوکار کے چار گانا داخل جائیں اور شام اچھی گزر جائے مگر بڑی مایوسی ہوئی۔ اس دن یقین آیا کہ ہمارے احباب بھی فلموں کے لیے اچھی غزلیں اور اچھے گیت لکھ سکتے ہیں۔

میں نے سوچا تھا کہ فلموں میں گیت لکھنے کے بعد شہریار اردو ادب پر آجائیں گے اور اپنی روایتی بے نیازی سے بے نیاز ہو جائیں گے مگر میں نے دیکھا کہ فلموں میں گیت لکھنے کے باوجود وہ جوں کے توں برقرار ہیں یہ اور بات ہے کہ اب ان کی شہرت ادبی حلقوں سے نکل کر عام حلقوں میں پھیل گئی ہے کہیں یہ جاتے ہیں اور لوگوں کو پتہ چلتا ہے کہ یہ "امراؤ جان ادا" اور "گمن" والے شہریار ہیں تو فوراً فرمائش شروع ہو جاتی ہے کہ "صاحب! "گمن" یا امراؤ جان" کے گانے سنایئے۔"

ان کی غزل:

سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے
اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے

کا ریکارڈ اتنا مقبول ہوا کہ بچہ بچہ اب "سینے میں جلن" کی شکایت کرتا ہے اکثر ایسا ہوا کہ کسی بنواڑی کی دکان پر پان خرید رہے ہیں کہ اچانک ریڈیو سے شہریار کا "یہ سوالنامہ" بجنا شروع ہو گیا کہ "اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے؟" ہم نے پان کھاتے کھاتے بنواڑی کی دکان میں اطلاع دی کہ "میاں اس گانے میں جتنے مشکل سوالات پوچھے گئے ہیں ان کے پوچھنے والے صاحب یہی ہیں۔" بس پھر یہ ہوا ہے کہ بنواڑی بڑی توجہ سے پان بناتا ہے اپنے ہاتھوں سے کھلاتا ہے دو چار فاضل پان ہمارے ہاتھ میں تھماتا ہے ہمارے پسندیدہ سگریٹ کی ڈبیاں بھی دے دیتا ہے اور آخر میں ہم سے پیسے نہیں لیتا۔ پھر اس کی سمجھ میں آجاتا ہے کہ "اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے؟" شہریار ہم سے شکایت کرتے ہیں کہ ہم ان کے لیے اتنے سارے پان اور اتنی ساری ڈبیاں کیوں خرید لیتے ہیں اب انہیں کیسے بتایا جائے کہ اس سوال کا جواب خود ان ہی کے گیت میں پوشیدہ ہے۔

جب سے شہریار کے گیت مقبول ہوئے ہیں لوگ ہر محفل میں انہیں سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ چونکہ دلی میں وہ میرے ہاں ٹھہرتے ہیں اس لیے اکثر لوگوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ جب بھی دلی آئیں تو انہیں لے آؤں۔ ایک بار دلی کی ایک مشہور و معروف مغنیہ کے گھر شہریار گئے۔ مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ شہریار کی آڑ میں میری بھی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ مغنیہ نے مجھ سے پوچھا "آپ کیا کرتے ہیں؟"

میں نے کہا "شہریار کے مصرعے اٹھاتا ہوں۔"

وہ بولی "بڑے خوش نصیب ہیں آپ ورنہ ان کے مصرعے اٹھانے کی سعادت کسے نصیب ہوتی ہے۔"

بہت دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ جب جانے کا وقت آیا تو شہریار نے مغنیہ سے کہا "اگر آپ کے کچھ لانگ پلیئنگ ریکارڈ ہوں تو بجا دیجیے۔ ہم بھی آپ کی آواز سن لیں گے۔"

مغنیہ بولی "اس وقت ہمارا ریکارڈ پلیئر خراب ہے مگر میں خراب نہیں ہوں۔ میں تو آپ کے لیے گا سکتی ہوں۔"

اس کے بعد محترمہ نے ہارمونیم سنبھال کر جو گانا شروع کیا تو سماں باندھ دیا۔ اس قدر خوب صورت آواز تھی کہ بس نہ پوچھیے۔ میں داد دیتے دیتے تھک سا گیا مگر شہریار خاموش بیٹھے رہے۔ میں نے آہستہ سے کان میں کہا "یہ کیا مذاق ہے داد تو دیجیے۔" جواباً میرے کان میں بولے "کیسے داد دوں؟ کم بخت نے میری ہی غزل چھیڑ دی ہے داد کہیں اپنے کلام پر دی جاتی ہے؟"

اس رات مغنیہ موصوفہ نے بڑی دیر تک محفل جمائی اور شہریار کو داد دینے کا موقع نہ دیا۔ ساری غزلیں شہریار کی سنائیں۔

شہریار خاموشی خاموشی سے بے نیاز بیٹھے رہے۔ مغنیہ کے گھر سے باہر نکلنے کے بعد میں نے شہریار سے کہا "اب آپ اطمینان رکھیں آپ کا کلام مناسب ہاتھوں میں چلا گیا ہے۔ یہ سینہ بہ سینہ اور گوش بہ گوش زمانے میں چلتا رہے گا۔ اچھا ہی ہوا کہ آپ کا کلام ناقدوں کے ظالم ہاتھوں سے نکل کر ان نازک ہاتھوں میں پہنچ گیا ہے جہاں یہ ہمیشہ محفوظ رہے گا۔"

شہریار اس جملے کو سننے کے بعد کچھ نہ بولے صرف اتنا کہا "بھیا! صرف اتنا خیال رکھنا کہ اگر ہو سکے تو نجمہ (مسز نجمہ شہریار) سے اس بات کا ذکر نہ کرنا۔" چنانچہ میں اب تک اپنے وعدے پر قائم ہوں اور آئندہ بھی قائم رہوں گا۔ شہریار نجمہ بھابی کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بھابی کو اس کی اطلاع نہیں ہو پاتی۔ کیوں کہ ہر بے ضرر حرکت کے بعد وہ اپنے کسی نہ کسی دوست سے یہ وعدہ لے لیتے ہیں کہ وہ اس کی اطلاع نجمہ بھابی کو نہیں دے گا۔

کبھی وہ دلی آتے ہیں اور ان سے مزید دو ایک دن رکنے کے لیے کہا جائے تو نجمہ بھابی کے پریشان ہونے کا حوالہ دے کر فوراً سامان سمیٹ لیتے ہیں۔ بس یہی ایک معاملہ ہے جس میں میں نے شہریار کو فکرمند پایا ورنہ وہ زندگی کو بڑی بے فکری کے ساتھ برتنے کے عادی ہیں۔ بے فکری کی مثال یہ ہے کہ ان کے کئی شاگردوں نے پی ایچ ڈی کر لی ہے مگر یہ اب تک اس تہمت سے پاک ہیں (تازہ اطلاع یہ ہے کہ انہوں نے بالآخر پی ایچ ڈی کر لی ہے پتہ نہیں اب وہ اس ڈگری کا کیا کریں گے)

شہریار زندگی میں منصوبہ بندی کو ضروری نہیں سمجھتے۔ بہت ہی چھوٹی چھوٹی مگر ضروری باتوں کا خیال نہیں رکھتے۔ گھر پر پانچ احباب کو کھانے پر بلا ہو تو پندرہ بیس احباب کو جمع کر لیں گے۔

شہریار کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو شاگرد نہیں دوست سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اکثر شاگرد بعد میں شاعر اور ادیب میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ شہریار کی معرفت ہی علی گڑھ کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں سے میری ملاقات ہو سکی ہے۔ شہریار شاعر تو اچھے ہیں ہی مگر میں انہیں ایک اچھے انسان اور اچھے دوست کی حیثیت سے زیادہ پسند کرتا ہوں اور اسی لیے ان کی دوستی کی بڑے جتن سے حفاظت کرتا ہوں۔

دل دھڑکنے سے خفا ہے

محمد شہریار کے کلام سے منتخب اشعار
حنا محمود (علی گڑھ، بھارت)

عجب چیز ہے یہ وقت جس کو کہتے ہیں
کہ آنے پاتا نہیں اور بیت جاتا ہے

O

کیا حادثہ ہوا ہے جہاں میں کہ آج پھر
چہرہ ہر ایک شخص کا اترا ہوا ہے

O

پہلے تھا جو بھی' آج مگر کاروبارِ عشق
دنیا کے کاروبار سے ملتا ہوا سا ہے

O

ایسی دنیا میں جنوں' ایسے زمانے میں وفا
اس طرح خود کو تماشا نہ بنا مان بھی جا

O

جنوں کے نغمے' وفا کے گیت گائے ہوئے
ہماری عمر کٹی زخمِ دل چھپاتے ہوئے

O

فرصتِ وقت نے دی تو ہم بھی لکھیں گے اس کی روداد
کیسے طوفانوں سے نکلے' پہنچے کیسے ساحل پر

O

کہاں پہ ذہن وہ پرچھائیاں کریں یارو
جو تاب لا نہ سکیں روشنی کے خنجر کی

O

چھائے ہوئے تھے بادل لیکن برسے نہیں
درد بہت تھا دل میں مگر ہم روئے نہیں

O

آندھی کی زد میں شمعِ تمنا جلائی جائے
جس طرح بھی ہو لاجِ جنوں کی بچائی جائے

O

یا تجھ سے بچھڑنے کا نہیں حوصلہ مجھ میں
یا تیرے تغافل میں بھی اندازِ کرم ہے

O

یہ کم نہیں کہ طرف دار ہیں مرے کچھ لوگ
ہنر کی ورنہ یہاں کس نے داد پائی ہے

O

مانا کہ دھوپ سخت ہے' میں سر برہنہ ہوں
بے حس شجر کے سائے میں کیسے پناہ لوں

O

صدا کے سائے میں سناٹوں کو پناہ ملی
عجب کہ شہر میں چرچا نہ اس خبر کا ہوا

O

دریا دیکھ کے پیاس کو اپنی بھول گئے
تشنہ لبی وابستہ جن کی سراب سے تھی

O

برف پگھل کے بہہ گئی' دھوپ کا نام ہو گیا
لیکن یہ راز راز ہے' دھوپ کو اس سے کیا ملا

O

دل پریشاں ہو مگر آنکھ میں حیرانی نہ ہو
خواب دیکھو کہ حقیقت سے پشیمانی نہ ہو

O

کارِ دنیا سے فرومایہ محبت نکلی
اہلِ دل میں بھی بہت جینے کی حسرت نکلی

O

قطرۂ اشک سے آنکھوں کا بھرم باقی ہے
چھین لے جائے نہ اس کو بھی ہوا دنیا کی

O

o

پہلے نہائی اوس میں پھر آنسوؤں میں رات
یوں بوند بوند اُتری ہمارے گھروں میں رات

o

ہر ایک سمت خموشی ہے، رات کالی ہے
نہ جانے کون سی اُفتاد پڑنے والی ہے

o

وہ جو پیاسے تھے سمندر سے بھی پیاسے لوٹے
ان سے پوچھو کہ سرابوں میں فسوں کتنا ہے

o

ہوا چلے ورقِ آرزو پلٹ جائے
طلوع ہو کوئی چہرہ تو دھند چھٹ جائے

o

آنکھ کی یہ حسرت تھی کہ بس پوری ہوئی
آنسوؤں میں بھیگ جانے کی ہوس پوری ہوئی

o

آج بھی ہے تری دوری ہی اُداسی کا سبب
یہ الگ بات کہ پہلی سی نہیں، کچھ کم ہے

o

ورنہ سیلاب بہا لے گیا ہوتا سب کچھ
آنکھ کو ضبط کی تاکید ہے روئے کیسے

o

تیرے سوا بھی کوئی مجھے یاد آنے والا تھا
میں ورنہ یوں ہجر سے کب گھبرانے والا تھا

o

ہوا کا زور ہی کافی بہانہ ہوتا ہے
اگر چراغ کسی کو جلانا ہوتا ہے

o

یا اتنی نہ تبدیل ہوئی ہوتی یہ دنیا
یا میں نے اسے خواب میں دیکھا نہیں ہوتا

o

o

آہٹ جو سنائی دی ہے ہجر کی شب کی ہے
یہ رائے اکیلی میری نہیں ہے سب کی ہے

o

کہاں تک وقت کے دریا کو ہم ٹھہرا ہوا دیکھیں
یہ حسرت ہے کہ ان آنکھوں سے کچھ ہوتا ہوا دیکھیں

o

اک یہی شغل تھی زخموں پہ بہار آنے کی
کام کی چیز بڑی، اب کھلا، تنہائی تھی

o

کاروبارِ شق میں بس فائدہ اتنا ہوا
تجھ سے ملتا تھا کہ میں کچھ اور بھی تنہا ہوا

o

کون ان کے واسطے روشن کرے گا راستے
ہم سے بچھڑیں گی تو یہ پرچھائیاں پچھتائیں گی

o

کتنی تبدیل ہوئی کس کے لئے تبدیل ہوئی
جاننا چاہو تو ان آنکھوں سے دنیا دیکھو

o

دیکھتے ہی دیکھتے ہر شے یہاں فانی ہوئی
لمحۂ آئندہ کو کتنی پشیمانی ہوئی

o

بھوک سے رشتہ ٹوٹ گیا تو ہم بے حس ہو جائیں گے
اب کے جب بھی قحط پڑے تو فصلیں پیدا مت کرنا

o

سفر یہ ختم ہو جائے نہیں ایسا نہیں ہوگا
بہت ہوگا تو ان اشجار کا سایہ نہیں ہوگا

o

ہم خوش ہیں ہمیں دھوپ وراثت میں ملی ہے
اجداد کہیں پیڑ بھی کچھ بو گئے ہوتے

o

O

جو ہونے والا ہے اب اس کی فکر کیا کیجئے
جو ہو چکا ہے اسی پر یقیں نہیں آتا

O

ہم کو جس دن نہ زمانے سے شکایت ہوگی
خود سے شرم آئے گی یا تجھ سے ندامت ہوگی

O

چٹانیں' آنسو' عدو' آوازیں' خوشبو' لہو
وہ سب ہیں وا ہمے' یہ بھی دن کے خواب ہیں

O

بلا سبب نہیں بیزار آسمان سے ہم
خرید لائے ہیں کچھ خواب اک دکان سے ہم

O

ساکت ہیں چپ ہیں آسیب زدہ اشجار
دشمن خواب ادھر سے ہو کے گذرے ہیں

O

شام ہوتے ہی کھلی سڑکوں کی یاد آتی ہے
سوچتا روز ہوں میں گھر سے نہیں نکلوں گا

O

شہرِ جنوں میں کل تلک جو بھی تھا سب بدل گیا
مرنے کی خُو نہیں رہی جینے کا ڈھب بدل گیا

O

اب تو لے دے کے یہی کام ہے ان آنکھوں کا
جو دیکھا نہیں اُن خوابوں کی تعبیر کریں

O

سچ خود سے بھی یہ لوگ نہیں بولنے والے
اے اہلِ جنوں تم یہاں بیکار میں آئے

O

عمر کا لمبا حصہ کر کے دانائی کے نام
ہم بھی یہ سوچ رہے ہیں پاگل ہو جائیں

O

باعث وحشت جنوں کہتے ہیں سب کچھ اور ہے
وجہ سکون تو سہی غم کا سبب کچھ اور ہے

O

دل دھڑکنے سے خفا ہے اور آنکھیں نم نہیں
پیچھے مڑ کے دیکھنے کی یہ سزا کچھ کم نہیں

O

وہ دشت ہو کہ بستی سایہ سکوت کا ہے
جادو اثر سخن کو بے کار کر دیا ہے

O

میری وحشت نے عجب عہد کیا ہے اب کے
ہو نہ برہم کسی صورت بھی سکوں دنیا کا

O

بہتے دریاؤں میں پانی کی کمی دیکھنا ہے
عمر بھر مجھ کو یہی تشنہ لبی دیکھنا ہے

O

اس بات پہ کس واسطے حیران ہیں آنکھیں
پت جھڑ میں ہوتے ہیں جدا پتے شجر سے

O

لے دے کے تجھی متاعِ جاں تو نے قبول کی نہیں
اس سے زیادہ کی بساط اہلِ جنوں کی تھی نہیں

O

فراقِ یار میں حالت عجب بنا لی ہے
بدن وہی ہے پہ چنگاریوں سے خالی ہے

O

اماں کی جا مجھے اے شہر تو نے دی تو ہے
بُھلا نہ پاؤں گا صحرا کی بیکرانی کو

O

بے نام سے اک خوف سے دل کیوں ہے پریشاں
مائل بہ کرم تجھ پہ وہ ایسے نہیں ہو گا

O

O

ابھی تھا بیچ سمندر میں اب کنارے پہ ہے
یہ سارا کھیل یہ کرتب ترے اشارے پہ ہے

O

سرمایہ جاں کیا ہے تیری ہی امانت ہے
تُو دیکھ کبھی کہہ کے میں کیسے لٹاتا ہوں

O

ساحلِ خواب پہ میں کب سے کھڑا ہوں تنہا
موجِ دریائے ہوس مجھ کو بہا لے جاتی ہے

O

خدا میرے عطا کر مجھ کو گویائی کہ کہہ پاؤں
زمیں پر رات دن جو باتیں ہوتی میں نے دیکھی ہیں

O

ان دنوں میں بھی ہوں کچھ کارِ جہاں میں مصروف
بات تجھ میں بھی نہیں رہ گئی پہلے والی

O

میں پھنس گیا ہوں کہیں ریت کے بھنور میں کیا
تری مدد کا جو محتاج آج اتنا ہوں

O

جہاں میں ہونے کو اے دوست یوں تو سب ہوگا
ترے لبوں پہ مرے لب ہوں ایسا کب ہوگا

O

سرفرازئ جہاں کیوں مجھے منظور نہ تھی
کس لئے میں نے تعاقب کیا رسوائی کا

O

حافظے میں مرے بس ایک کھنڈر سا کچھ ہے
میں بناؤں تو کسی شہر کا نقشہ کیسے

O

تیرے آنے کی خبر آتے ہی ڈر لگنے لگا
غیر کا لگتا تھا جو وہ اپنا گھر لگنے لگا

O

O

قرار ہجر میں آیا سکون درد کے ساتھ
بڑا عجیب سا رشتہ ہے ایک فرد کے ساتھ

O

خامشی نے کس لئے آواز کا پیچھا کیا
اہلِ دنیا تم نہ سمجھو گے یہ ایسی بات ہے

O

پچھلی بارش میں مجھے خواہش تھی سیلاب کی
اب کے تو بتلا مجھے کیا مانگوں برسات سے

O

کسی کلی کسی مہتاب میں نہاں ہو گا
میں دشت میں ہوں تو اس وقت کہاں ہو گا

O

عبادت رات دن اک شخص کی ایسے نہیں کی تھی
کھلا ہم نے محبت آج سے پہلے نہیں کی تھی

O

اسے گناہ کہیں یا کہیں ثواب کا کام
ندی کو سونپ دیا پیاس نے سراب کا کام

O

وقت کے ہاتھوں نے جتنے داغ تھے سب دھوئے
داغ جو تجھ سے ملا ہے اک اسے دھویا نہیں

O

کہیں ذرا سا اندھیرا بھی کل کی رات نہ تھا
گواہ کوئی مگر روشنی کے ساتھ نہ تھا

O

یہ کیا ہوا کہ خوشی بھی گنگنانے لگی
گئی رُتوں کی ہر اک بات یاد آنے لگی

O

زرد پتے نحیف شاخوں پر

شمس الرحمٰن فاروقی (الہ آباد)

جدید شاعری نے شاعری یا فن پارے کے خود مکتفی اور خود مختار ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس حق میں کہ فن پارہ بنانے والی وہ چیز ہی ہیں جو اس کے اندر ہیں کوئی خارجی حوالہ چاہے وہ نظریاتی ہو یا سیاسی عقیدے کا کسی تحریر کو فن پارہ نہیں بنا سکتا۔ آزادی کے اس اعلان کو ترقی پسندوں نے "سماجی شعور کے فقدان" اور "سماجی معنویت سے انکار" کا نام دے کر رد کرنے کی کوشش کی۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ ہم سے اکثر کی وابستگی ادب کے ساتھ کچی اور گہری نہیں ہے اس لیے ان لوگوں کو ایسی شاعری بیٹھے پریشان کن معلوم ہوگی جو خارج کو داخل کے آئینے میں دیکھنے کی سعی کرتی ہے اور جو اس بات کی فکر نہیں کرتی کہ میر کے کلام میں سماجی آگہی کا ظہور رکھتا ہے اور کیا اس کے غیاب کو اس کے ظہور کا نام دے سکتے ہیں؟ جو اس بات کی فکر کرتی ہے کہ میرا کلام سچا اور ذاتی اظہار ہے یا اس پر کسی قاعدے کی رو سے تنقید ہو سکتی ہے ایسی شاعری اپنے داخلی سرچشمے کو اپنے سچ کا معیار مانتی ہے۔ جن لوگوں کے لیے شاعری کی حقیقت سکہ رائج الوقت کی سی ہے ان کے لیے شہریار کی مندرجہ ذیل نظم ناقابل قبول ہوگی۔

میں نہیں جانتا تم جانو
سیاست کی زلف اتنی الجھی ہے کہ سلجھا نہیں سکتا کوئی
بارہا کر چکا کوشش میں تو
تم بھی اپنی سی کرو
اس تگ و دو کے لیے خواب مرے حاضر ہیں
نیند ان خوابوں کے دروازوں سے لوٹ جاتی ہے
سوچا تھا کچھ کے لیے ان کا ہوا
سہل کر دے گا بہت کچھ تم پر
آسماں رنگ میں کاغذ کی ناؤ
رک گئی بہنے سے حرکت میں لاؤ
اور کیا کہنا ہے تم جانتے ہو

میں نہیں جانتا تم جانو
سیاست کی زلف
اتنی الجھی ہے کہ سلجھا نہیں سکتا کوئی

یہ نظم اس بات کا اعلان ہے کہ دنیا کی سچائیاں فریب ہیں۔ ہم لوگ سچائی کو حاصل کرنے کے لیے جو خواب دیکھتے ہیں وہ سچے ثابت نہیں ہوتے حتیٰ کہ خواب دیکھنا بھی چھوڑ دیتے ہیں اور ہم میں سے جو لوگ ان خوابوں کو حقیقت بنانے کی تگ و دو کرتے بھی ہیں تو ان کی مثال ایسے لوگوں کی ہے جو ریگستان میں کاغذ کی ناؤ چلانا چاہتے ہیں۔ اس نظم میں انسان اور اس کی دنیا کی جو صورت ہمیں دکھائی گئی ہے ممکن ہے ہمیں اس سے اتفاق نہ ہو لیکن نظم کا متکلم اسے ہمارے سامنے اپنے تجربے کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ ہم اس سے یہ سوال نہیں پوچھتے کہ تم نے کتنے تجربوں، کتنے مطالعے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے؟ انسانی فکر و عمل کا بانجھ پن ایک تجربہ یا تصور ہے۔ یہ تجربہ اس نظم کے متکلم شاعر نے داخلی یا خارجی سطح پر حاصل کیا ہے۔ نظم کی قوت اس بات میں نہیں ہے کہ یہ تجربہ آج کے انسان نے بھی مختلف صورت حالات اور مختلف داخلی منظرناموں کے حوالے سے حاصل کیا ہے (ممکن ہے یہ نظم دنیا کی سچائیوں کے بارے میں ہو بھی نہیں بلکہ کسی ذاتی نارسائی کے بارے میں ہو، اور سیاست کی الجھی ہوئی زلف دنیا کی سچائیوں کے ناکام ہونے کا استعارہ نہ ہو، بلکہ کسی ذاتی سچائی کے ناکام یا بے اثر ہونے کا استعارہ ہو۔) نظم کی قوت ان باتوں میں نہیں ہے بلکہ حسب ذیل دو باتوں میں ہے۔ (۱) متکلم کا ڈرامائی لہجہ، اس میں ایک ہلکے سے طنز کی لہر۔ دو شخصیتوں کی موجودگی، ایک متکلم اور ایک مخاطب۔ (مخاطب قاری خود ہو سکتا ہے۔) (۲) پوری نظم میں حرکت اور جنبش کا احساس ہے لیکن اس کے آہنگ اور لہجے میں تھکن اور اختتامیت ہے۔ "میں نہیں جانتا تم جانو" میں بیزاری اور مایوسی ہے جس پر طنز کی ہلکی سی تہہ چڑھی ہوئی ہے۔ دنیا والوں نے طرح طرح کے نظام فکر ایجاد کیے، جنہیں ہمہ گیر یا Totalising کہا جا سکتا ہے، یعنی ایسے نظام فکر جو انسان کے تمام دکھ درد کا علاج کرنے کا دعویٰ رکھتے ہیں، جو انسانی فکر و عمل کے ہر پہلو پر اثر انداز ہونے کی قوت کا دعویٰ رکھتے ہیں لیکن یہ تمام ہمہ گیر افکار یا نظام افکار جلد یا بدیر اپنے داخلی تضادات کا شکار ہو جاتے ہیں اور انسانی وجود کی ناؤ ویسی کی ویسی بے حس و حرکت ہے۔

شہریار کی شاعری ایسے شخص کی شاعری ہے جس کا بہت کچھ یا شاید سب کچھ کھو چکا ہے یا چھن گیا ہے۔ وہ اس صورت حال پر رائے زنی کر سکتا ہے، لیکن اس صورت حال کو بدلنے پر وہ قادر نہیں۔ بعض اوقات ایسا لگتا ہے کہ تجربے کی شدت نے عمل کی قوت چھین لی ہے۔ اس میں کسی قسم کا اخلاقی یا سیاسی تذبذب یا ڈانواں ڈول پن نہیں۔ بس ایک منزل ہے، ایک وقت ہے جو ٹھہر گیا ہے۔ ایسے بہت سے لوگ ہیں یا شاید سب لوگ ایسے ہیں، وقت جن کے لیے ٹھہرا نہیں، تجربہ جن کے لیے ایک گزرتی ہوئی فلم کی طرح ہے، کبھی کبھی وہ پردے پر ہونے والے واقعات میں ذہنی طور پر اس قدر شریک ہو جاتے ہیں کہ وہ واقعات انہیں اصلی اور خود اپنے پر گزرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ منظر انہیں اس قدر بے قابو کر دیتے ہیں کہ وہ خود ان کے ساتھ دوڑنے لگتے ہیں اور اپنے گردوپیش کے لوگوں کو وہ اپنا شریک یا حریف سمجھنے لگتے ہیں۔ شہریار کی نظموں غزلوں میں متکلم خود کو صحرا میں اکیلا ہے۔ اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے بعض اور حقائق بھی بیان کرنے پڑتے ہیں۔ مثلاً ایسا بھی ہے کہ متکلم کو اپنی صورت حال کا پوری طرح احساس اسی وقت ہوتا ہے جب وہ اپنی تنہائی کی وجہ

معلوم کرنا چاہتا ہے۔

میں پھنس گیا ہوں کہیں ریت کے بھنور میں کیا
تری مدد کا جو محتاج آج اتنا ہوں
یہ راستہ بھی گھنے جنگلوں سے گزرے گا
میں اس سفر میں اسی واسطے اکیلا ہوں
ہر ایک رنگ میں دیکھا ہے میں نے راتوں کو
میں خواب خوف سبب بے شمار جاگا ہوں

ان اشعار میں شکوہ شکایت نہیں، رنج بھی نہیں۔ ان میں خود آگہی اور ماحول کی حقیقت کو پہچاننے کی کوشش ہے۔ ان کا لہجہ ایسے شخص کا لہجہ ہے جس نے دکھ درد سہنے، لوگوں کو متوجہ کرنے اور خود کو گفتگو یا دلچسپی کا محور بنانا سیکھا ہی نہیں۔ ان اشعار میں ذرا سی شدت ہوتی تو میرا جی کی ''جاتری'' کا سا رنگ پیدا ہو جاتا، کیوں کہ ان میں جتنا انکشاف ذات ہے اتنا ہی گردوپیش کی دنیا پر تبصرہ بھی ہے لیکن میرا جی کا مسافر تلاش حقیقت اور دنیا کو سمجھنے کی کوشش سے مایوس نہیں ہوا ہے۔ اس کے یہاں سعی وجہد کی ذہنی سطح (عملی سطح نہیں) متحرک اور فعال ہے۔ مندرجہ بالا اشعار میں اختتام کا احساس ہے، کہ اس کے آگے کچھ نہیں۔

اختتام کا احساس اور یہ احساس کہ اگر اچھی چیزیں ختم ہو جاتی ہیں تو شاید بری چیزیں بھی ختم ہو جاتی ہیں شہریار کی نظم شاعری کا مرکزی خیال و تصور ہے لیکن بری چیزوں کے ختم ہونے کا احساس کسی اطمینان کی سانس، کسی جھوٹی امید کی معنوی کرن، کسی مخالف و معاند آدمی کے ختم جانے کا اعلان نہیں۔ شہریار کا متکلم جہاں کھڑا ہے وہاں یہ سب چیزیں ہی ختم ہو چکی ہیں۔

دوستی شام کے اس پار
کھڑے تھے جو لوگ
ہم نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے
کہ ان لوگوں کی
مٹھیاں بند تھیں
یہ ریت کہاں سے آئی؟

(حیران کرنے والی ایک بات)

(اب تک میں نے تین اقتباسات پیش کیے ہیں۔ تینوں میں ریت کا استعارہ ہے۔ میں حیران ہوں کہ یہ میرا غیر شعوری انتخاب تو نہیں؟ ممکن ہے پڑھنے والا اپنی آنکھ سے پڑھتا ہو، لیکن متن کی Integrity اور سالمیت کچھ تو ہوتی ہو گی؟ ورنہ اس کلام میں بار بار ریت پر اصرار کیوں؟ یہ کچھ تو معنی رکھتا ہو گا؟)

آگ جسم کب برف ہو گیا؟
سوچتا ہوں میں
اور سوچ کر اپنے آپ کے اس زوال پر
کچھ اداس سا ہو رہا ہوں میں
آسمان پہ رات کے سوا کچھ نہیں رہا
آخری دعا مانگتا ہوں

(آخری دعا مانگتا ہوں)

جب آسمان پر رات کے سوا کچھ نہیں تو دعا بھی کیا مانگی جا سکتی ہے؟ یہ اختتام کی وہ منزل ہے جہاں امیدوں کا جلا اور یاد بھی اجڑے ہوئے گھر کی طرح ہو جاتا ہے۔

کہیں بھی زیست کے آثار دکھلائی نہیں دیتے
یہی صورت رہی جو چند دن گھبرائیں گے ہم بھی
عجب وحشت تھی گھر کے سارے دروازے کھلے تھے
ہمیں معلوم تھا اک روز دھوکا کھائیں گے ہم بھی

ایسی نظمیں بھی جن میں بظاہر کامیابی ہے، ہمیں فوراً احساس دلاتی ہیں کہ یہ کامیابی دراصل شکر ہے، خود اپنے اوپر بھی اور اس پر بھی جس نے متکلم کو اس کامیابی سے ہمکنار کیا تھا۔ لہٰذا یہ کامیابی عجب غیر اطمینان بخش، ادھوری اور بالآخر ناکامی ہی معلوم ہوتی ہے۔ زندگی کے ایسے تجربے بالکل بھی شاعر نظم کرتا تو بڑی دھوم دھام کا انتظام کرتا، ہمیں طرح طرح سے احساس دلاتا کہ دیکھو بیسویں صدی کے اواخر میں زندگی یوں جیتے ہیں اور خود آگہی کو یوں بیان کرتے ہیں۔ شہریار کی شاعری کا سب سے بڑا کمال اس کا Understatement (کم بیانی یا سبک بیانی) ہے، کہ وہ اپنے کلام میں جذبات کا وزن کم ڈالتے ہیں اور اس کی رگ و پے میں بجلیاں نہیں کڑکاتے، معتدل رہتے ہیں۔ شروع میں بھی شہریار کو غیر ضروری الفاظ سے پرہیز اور کسی بات کو کہنے کے لیے کم سے کم توجہ انگیزی اختیار کرنے کی عادت تھی۔ یہ ان کی پختگی اور شاعرانہ قوت کے مزید عروج کی علامت ہے کہ اب وہ اپنی بات کو ذاتی حوالے سے کہتے ہیں تو بھی جذبات کے جھالر کو ٹانکے بغیر کہتے ہیں۔ ان کی بات اتنے فطری انداز میں، اتنے نامیاتی رنگ سے ادا ہوتی ہے کہ اعلیٰ درجے کے ستار پر کسی راگ کے بے تکلف ادا ہو جانے کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔

میرا تو ارادہ تھا
ہوٹل سیڑھیوں سے میں
آسمان تک جاؤں
تو نے اس جگہ مجھ کو
اتنی دیر تک روکا
یہ بھی بھول بیٹھا میں
میرا کیا ارادہ تھا
اس جو خدا کی میں

جسم کچھ نیا دھا   (میر اقوار ادھا)

یہ نظم "ایک اور چشمین کوئی" کی طرح کا تجزیہ ہے لیکن اس کا متکلم اب کچھ زیادہ تجربہ آشنا اور سرد و گرم چشیدہ ہے اس کے لہجے میں "ایک اور چشمین کوئی" جیسا المیاتی شدید حزن نہیں، بلکہ ہر چیز کے ادھورے پن کا کام اور سب ختم ہونے کے احساس کو دور کا طلب پر طنز اور ہر طرح کے ظلم سے اپنی برأت کا اعلان ہے۔ وجود خاکی میں جسم نیا دھا ہوتا تو اور کیا ہوتا؟ مندرجہ ذیل نظم "ایک اور چشمین کوئی" سے براہ راست یاد دلاتی ہے۔

زرد پتے نحیف شاخوں پہ
رات کے آخری کنارے سے
آنے والی مہیب آندھی کا
دیکھو! انتظار کرتے ہیں
لوگ سب اس عجیب منظر کو
بے خبر کیوں شمار کرتے ہیں   (رات کے آخری کنارے سے)

یہ منظر بالکل عجیب نہیں ہے اور ہم جیسے لوگ جو موت و زیست کے چکر کے عادی ہو چکے ہیں، ان کے لیے پت جھڑ کی آندھی اور شاخوں کی بے طاقتی بے خبر ہیں، کیوں کہ ہم لوگ قدرت اور دنیا کے ہر پہلو کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنا اور فطرت کا استحصال کرنا اپنا حق جانتے ہیں۔ لیکن متکلم کے لیے موت انتہائی حقیقت ہے۔ اس کی آندھی ایسی نہیں جس کے جھکڑوں کا لطف لیا جائے۔ اور اس سے بڑھ کر زرد پتوں کا انتظار ہے کہ ہم وہ زرد پتے ہیں جنہیں اپنے انجام کا انتظار ہے کہ زندگی ان کے لیے اب بے معنی ہو چکی ہے۔ متکلم کی آنکھ ظاہر کا پردہ چیر کر باطن کو دیکھتی ہے۔ وہ موت کی آندھی کا انتظار کرتے ہوئے پتوں کے ساتھ اگر یہ انجام کو روک نہیں سکتا، لیکن وہ ظاہر بین لوگوں سے کہہ ضرور سکتا ہے کہ زندگی اور موت کے چکروں کی شدت بھی دیکھو جو اس کے قدموں سے آ کر لپٹ گئے ہیں۔

اس بات پہ کس واسطے حیران ہیں آنکھیں
پت جھڑ میں ہوتے ہیں جدا پتے شجر سے

نحیف شاخوں پر زرد پتوں کو دیکھا اور یہ احساس ہوا کہ وہ موت جس آندھی کے منتظر ہیں ایسے ہی لوگوں کے کام ہیں جو حسین ابن علی کو تنہا موت کے منہ میں جانے دیتے ہیں۔

گزرے تھے حسین ابن علی رات ادھر سے
ہم میں سے مگر کوئی بھی نکلا نہیں گھر سے

نظم اور غزل پر یکساں قدرت شہریار کی نمایاں صفت ہے اور یہ ہے جیسے جیسے شاعر کے پاس کہنے کو کم ہوتا جاتا ہے، نظم کہنا اس کے لیے مشکل ہوتا جاتا ہے۔ غزل میں تو مروج مضامین اور پہلے کی کہی ہوئی باتوں کو الٹ پھیر کر کام چلایا جا سکتا ہے (بڑی غزل اس طرح نہیں بنتی) لیکن کامیاب غزل ضرور بن سکتی ہے) مگر نظم میں کامیاب ٹھہرایا قدم نکالنا بھی ناممکن ہے جب تک کوئی بات اپنے دل سے نکال کر کہنے کے لیے نہ ہو۔ حالیہ نظموں میں شہریار کے یہاں جسم کا احساس، اور کسی مد مقابل کے جسم کا احساس واضح ہوتا نظر آتا ہے۔ جس بات کو وہ اب تک بمشکل ہی صاف صاف کہتے تھے، اب اس کی پرچھائیں بے تکلف بعض نظموں پر پڑ رہی ہے۔

۱۔ دریائے خوں رگوں میں
بے تاب ہو رہا تھا
میں ہو رہا تھا پاگل

۲۔ .... مرے ہونٹوں نے
جسم پر تیرے بہت دیر تلک
حرف ناگفتنی تحریر کیا

۳۔ میں حصار آرزو میں مطمئن تھا
تم نے یاد آ کے
بدن کے بند کھولے
آؤ میں تم پر یوں امر ہو لوں
لب ترازو میں تمہیں تا دیر تولوں
آخری سسکی تلک میں چپ رہوں اور کچھ نہ بولوں
بس اسی ایک کام میں مشتاق ہوں میں

اس نظم میں رسائی، نارسائی، خیالی جسم اور حقیقی جسم، اپنی مضبوطی میں اپنی کمی کا شعور، کئی طرح کی پیچیدہ باتیں بیک وقت یوں حل ہوتی ہیں کہ نظم اپنی طرح کا شاہکار بن گئی ہے۔ لیکن بعض اوقات شاعر بالکل مختلف طرح کا شخص معلوم ہونے لگتا ہے کہ ساحر، دانشوری اور دانشوروں کے کھوکھلے پن کے تئیں اس کا جذبہ تحقیر اس کو سفاک بنا دیتا ہے، اور وہ شاعر جو خیالی۔ اصلی محبوب کے سامنے جھکا ہوا نظر آتا ہے، اپنے ساتھیوں کو یوں مخاطب کرتا ہے۔

انہیں زندہ رہنے کی ہوس
جو دکھائی دیتے تھے ہم قفس
کبھی روشنی کے حصار میں
کبھی جگنوؤں کی قطار میں   (ہندوستانی دانشوروں کے نام)

یہ نظم ہمارے نام نہاد دانشوروں کے نام پیغام بھی ہے اور ان کے کردار پر کھلا تبصرہ بھی۔ شاعر کا احتساب کبھی اپنے اوپر تنقید میں بھی نظر آتا ہے اور اس طرح اس کی علمی انصاف پسندی کا ثبوت ملتا ہے۔

ہنروں کے جتنے تقاضے ہیں بھولے جاتے ہیں
کہ ساتھ وقت کے لو ہم بھی بدلے جاتے ہیں

غزل میں شہریار کی محرومی اور احساس زیاں ان کی نظم سے بھی ہلکے لہجے میں معرض بیان میں آتے ہیں۔ ان کا انداز اس قدر لطیف اور لہجہ اس قدر

دیتا ہے (کبھی کبھی شعری پیکر تراشی کے باوجود) کہ اگر قاری بہت ہوشیار نہ ہو تو وہ کئی اشعار پر سے بے کھٹکے گزر جائے گا۔ شہریار استعارہ بہت کم استعمال کرتے ہیں اُن کا پورا شعر استعارے کا کام کرتا ہے

کر آن پہنچا ہے دریا ترے زوال کے وقت
جو ہم سے لوگ کنارے پہ ٹھہرے جاتے ہیں
زمیں نے ہم کو بہت دیر میں قبول کیا
جلی حروف میں یہ بات لکھے جاتے ہیں
سیاہ رات نے بے حال کر دیا مجھ کو
طویل کر نہیں پایا کسی کہانی کو
بجائے میرے کسی اور کا تقرر ہو
قبول جو کرے خوابوں کی پاسبانی کو
جینے کا حق ادا کوئی ہم سے نہیں ہوا
تاویل اس کی کیا کریں کیسے نہیں ہوا
دن ڈھلے اور شام کا دیدار ہو پھر
کام دن بھر اس لیے اٹکا کیا ہے

ان اشعار کی خوبصورتی اور ان کے حق کی تہوں تک پہنچنے کے لیے تامل کی ضرورت ہے۔ ان اشعار کے کہنے والے نے اپنا نیا ذہن و فن آستین میں چھپا رکھا ہے۔ صرف ایک بات پوری شدت سے ظاہر ہے کہ محمد علوی جیسے لوگوں کو چھوڑ کر آج شاعری کوئی ایسا ہو جو بظاہر اتنی آسانی سے "کوشش اور زور کے بغیر" اتنے relaxed انداز میں شعر کہہ سکتا ہوں۔ فرق یہ ہے کہ محمد علوی اکثر ایسی باتیں کہتے ہیں جو فوراً متوجہ کر لیتی ہیں۔ شہریار ان سے بھی الگ ہٹ کر ایسی باتیں کہتے ہیں جن میں بظاہر توجہ انگیزی نہیں ہوتی۔ شہریار جیسی شاعری کہنے کے لیے بھی اور پڑھنے کے لیے بھی خاص مشق اور تفکر درکار ہے۔

یوں تو شہریار کے کلام میں شروع سے ہی مشاقی اور پختگی کے جوہر نمایاں تھے اور ان کے یہاں بھرتی کے الفاظ ڈھیلے مصرعے شعری آہنگ کی کمی وغیرہ عیوب کا پتہ بالکل نہ تھا لیکن گزشتہ چند برسوں میں "اور خاص کر زیر نظر مجموعے کی شاعری میں بیان کے تئیں ان کا رویہ بحیثیت مجموعی کچھ مبہم جز کچھ زیادہ جرأت مندی اور کچھ زیادہ بے تکلف نظر آتا ہے۔ کچھ تو مزاج کے باعث اور کچھ یونیورسٹی میں پروفیسری کے باعث شہریار نے زبان و ہیئت میں تجربے اور تبدیلی کے سلسلے میں محتاط رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ اب وہ بندشیں آہستہ آہستہ ٹوٹتی نظر آتی ہیں۔ بحروں اور نظم کے مصرعوں کی ترتیب میں زیادہ تنوع اور غیر رسمیت کا دور دورہ ہے۔ دیسی اور بدیسی الفاظ کے مابین کسر کا اضافت بعض جگہ علامت اضافت کا حذف بعض جگہ غیر معمولی تراکیب یہ وہ خوش گوار جرأت مندانہ اقدامات ہیں جو شہریار کی شاعری میں اب جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ بعض مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ ہونٹوں سے لول بھلا ہی
میم گر اہاتھا
۲۔ پھر تری شکل نما صورت مجھے یاد آگئی
۳۔ ہوشمندی کی سیلاب کا مجھ پر دروازہ کھولے
ہم کو میسر ایسے بھی اک دو پل ہو جائیں
۴۔ آؤ میں تم پر ہوں اسرار کھولوں
لب تر از و میں تمھیں نا دیر تولوں
۵۔ اس شام افق پیشانی پر
اک بوسہ اور جڑ جائیں گے
اور رات ٹھہر تک جائیں گے
۶۔ آسمان ریگ میں کاغذ کی ناؤ

اس میں کوئی شک نہیں کہ زبان اور محاورے کے تئیں شہریار کا رویہ ابھی اور ڈھیٹ اور بے پروا ہونا چاہیے تا کہ ان کی تخلیقی قوت پورے بند پوری طرح اٹھ سکے۔ اب ان کے یہاں بحروں کا تنوع تو ہے بلکہ بعض جگہ تو وہ عروض کے تحت قاعدوں کو تھوڑا نرم کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن آہنگ میں مزید تنوع لانے کے لیے انھیں زبان میں بھی تنوع لانا ہوگا۔ انھوں نے جان بوجھ کر قاری تراکیب اور نیشنلا مانوس الفاظ سے گریز کیا ہے تو اس کا بدل مروج زبان میں تھوڑی بہت توڑ پھوڑ کی صورت میں انھیں حاصل کرنا چاہیے۔ مندرجہ ذیل اشعار اور ان کی طرح کے اور اشعار ایک مخصوص طرز کی امراج کو چھوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

کس واسطے یہ تیری توجہ کا ہے مرکز
اس شاخ کا ہر پھول تو صرصر کے لیے ہے
خوش فہمی ابھی تک تھی یہی کار جنوں میں
جو میں نہیں کر پایا کسی سے نہیں ہوگا
فرہاد و قیس جیسے ہیں ویسے دکھائی دیں
زائل تماشاگاہ میں بینائی تو نہ ہو
میرے جنوں کے لیے تیری گواہی بہت
چاک گریباں نہ کیوں میں نے سیا آج تک
بس ایک لمحے کی مہلت دے پیاسی آنکھوں کو
مرے بدن کی صراحی میں آگ بھر جائے

آخری شعر میں پیکر، استعارہ اور کنایہ تینوں غیر معمولی ہیں۔ شہریار کو یہاں تک پہنچنے میں تیس برس سے اوپر لگے ہیں۔ ہمارے زمانے میں کم شاعر ایسے ہیں جن کی تخلیقی قوت اتنے لمبے عرصے تک اتنی مستعدی سے آگے قدم بڑھاتی رہی ہے۔ دیکھیں ان کا افق کہاں جا کر ٹھہرتا ہے اور ٹھہرتا ہے بھی کہ نہیں۔

یا کچھ کسی اور کے منظر کے لیے ہے

میرے حصے کی زمیں

اسلوب احمد انصاری (علی گڑھ، بھارت)

"میرے حصے کی زمیں" شہریار کی غزلوں کی پہلی قسط ہے۔ وہ عموماً نظم کے شاعر سمجھے جاتے ہیں اور اپنا ایک منفرد اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اس لیے پیش نظر مجموعہ ایک طرح کے تحیر اور اچانک پن کا احساس پیدا کرتا ہے۔ غزل کے میدان میں بھی ان کا کارنامہ کچھ کم داد کا مستحق نہیں ہے۔ اس میں روایت کا حصہ بہت کم اور انفرادی اپج کو بیش از بیش دخل ہے۔ چوں کہ ان کی نظمیں اور غزلیں ایک ہی تخلیقی ذہن کا اظہار و انعکاس ہیں۔ اس لیے ان میں کچھ عناصر مشترک نظر آتے ہیں جو ان کے ہاں ترسیل کے Mode کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جو شے فوراً توجہ کو اپنی جانب کھینچتی ہے وہ یہ کہ ان میں ایک نوع کی خودکلامی ملتی ہے۔ ان میں گفتگو اور انکشافِ ذات کا انداز ہے۔ وہ اپنے آپ سے مخاطب معلوم ہوتے ہیں یعنی ان کا شعری پرسونا کوئی دیگر other نہیں ہے۔ ان کی غزلوں کی تعبیری فضا اور لہجے میں ایک طرح کا تنہا پن ہے۔ ان میں آرائشِ سخن کم سے کم ہے یعنی ان میں زبان کی Essentialism ملتی ہے۔ یہاں لفظ بغیر ترصیع اور خود آگہی کے سامنے آتا اور معنی کی گرہیں کھولتا ہے لیکن اس میں استعارے کا استعمال جگہ جگہ ملتا ہے اور شعری زبان کا اولین فعّال استعارہ ہی ہے۔ بیشتر غزلوں پر جس عنصر کی چھاپ لگی ہوئی ہے اسے ہم اعترافِ خود کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح غزلوں کا یہ مجموعہ ایک طرح کی اعترافی Confessional شاعری کے ذیل میں آتا ہے جو احتساب اور خودنگری کے داعیے کو آشکار کرتا ہے یعنی کھود کھود کر اپنی شخصیت، مزاج، محور، میلانات کو سامنے لانے میں کسی اہتمام و تفخیم کو دخل نہیں ہے۔ جو پرسونا ان غزلوں میں ملتا ہے وہ اپنے آپ سے الجھتا ہوا بھی نظر آتا ہے۔ شہریار کے ذہن نے اپنے گردوپیش جس کائنات کو تخلیق کر کے ہمارے روبرو پیش کیا ہے وہ ایک ملگجی فضا میں ملفوف ہے۔ اس پر برابر ناآسودگی، محرومی اور تاریکی کے سائے منڈلاتے رہتے ہیں۔ یہاں ہر شے غبار آلود نظر آتی ہے۔ نیند، خواب، رات، تنہائی ان کی شاعری کے بنیادی علائم ہیں۔ یہ حقیقت کی غارتگری سے ایک حد تک نجات دلاتے ہیں۔ تجریدیت، ریت، کنکر اور زمین کے دامن میں بکھرے ہوئے ذرے اس فضا کی تشکیل کرتے ہیں جس سے ہم برابر متصادم ہوتے رہتے ہیں۔ تجریدی طور پر انجماد کا اشاریہ بھی ہے اور بے حسی کا بھی اور Insentience کا بھی۔ ناصر کاظمی کی شاعری میں اس کا تفاعل کچھ اس طرح کا ہے۔ اسی طرح شب کی سیاہی کو افق پر پہلا طلوع ہونے والا ستارہ ایک طرح سے Nullify کرتا ہے۔ شہریار کا ذہن ایک گم کردہ راہی کا ذہن معلوم ہوتا ہے۔ تنہائی کی اداسی اور گلوگیری انھیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے اور انھیں گردوپیش کی فضا معاندانہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ صرف اجتماعی زندگی کے دباؤ اور اس کے عدم استحکام اور عدم توازن کی پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ اس کی جڑیں ان کی سائکی میں پیوست نظر آتی ہیں اور اسی لیے یہ وقتاً فوقتاً ابھر کر سطح پر نمایاں ہوتی رہتی ہیں۔ تنہائی کے احساس میں کوئی عنصر خودترحمی کا نہیں ہے اور یہی اس کا مثبت پہلو ہے کہ اس میں خودنگہداشت کا داعیہ صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہیں کہیں استفہام بھی نمایاں ہے مثلاً اس غزل میں جس کا مطلع یہ ہے:

بنیادِ جہاں میں کچھ کجی کیوں ہے
ہر شے میں کسی کی کمی کیوں ہے

یہاں شروع سے آخر تک ایک طرح کی جواب طلبی یا سبب جوئی نظر آتی ہے۔ ان غزلوں پر جو ہمہ گیر کیفیت طاری ہے وہ افسردگی یا یاس نہیں ہے۔ یہ احتسابِ خود اور جستجو کا داعیہ ہے جو رہ رہ کر اظہار کی راہ پاتا ہے۔ یہ جاننے کی جستجو کہ اشیا کی ترتیب و تنظیم ہماری خواہشات اور محرکات سے ہم آہنگ کیوں نہیں اور ہم اس میں معنی و مفہوم کیسے پیدا کریں۔ خواب کے شعری پیکروں کے سلسلے میں یہ امر لائقِ تامل ہے کہ خواب کے عالم میں اشیا کا منظر پھر اس سے مختلف نظر آتا ہے جو بیداری کی حالت میں ہوتا ہے اور خواب میں حقائق کی بازآفرینی بھی ہوتی ہے اور پیش بینی بھی۔ اسی لیے خواب دیکھنے والا شاعر ایک طرح کے Proleptic تخیل سے متصف ہوتا ہے۔ تنہائی، خواب اور تخلیق کے دائرے آپس میں ملے ہوئے ہیں اور ادبی تخلیق میں لاشعوری محرکات کا تفاعل بھی اسی قدر اہم ہے جتنا کہ شعوری محرکات کا۔ اس مسئلے پر مشہور ماہرِ نفسیات ینگ نے بڑی تفصیل اور شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ اسی طرح حافظہ بھی لاشعور کا مرکز و محور تصور کیا گیا ہے۔ دو اور شعری پیکر جو شہریار کے ہاں برابر مستعمل ہوئے ہیں۔ وہ ہیں سراب اور پرچھائیاں۔ جو وقتی طور پر امید کا طلسم باندھتی ہیں لیکن آخرکار ازالۂ سحر کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں۔ انھیں خواب اور نیند کے

Coordinates کہا جا سکتا ہے۔ شہریار کے ہاں ایک داعیہ وہ ہے جسے مرگ کی خواہش کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس کا ایک بہت موثر اظہار اس غزل میں ملتا ہے جس کا مطلع یہ ہے:

کشتیٔ جاں سے اتر جانے کو جی چاہتا ہے
ان دنوں یوں ہے کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

خواہشِ مرگ سے لبریز اس غزل پر حساس نفسیات اور عدمیت کا احساس چھایا ہوا ہے۔ ایک اور غزل جو ازاول تا آخر تنہائی کے احساس کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے، یہاں پوری کی پوری نقل کی جاتی ہے:

شبِ غم کیا کریں کیسے گزاریں
کسے آواز دیں کس کو پکاریں

سرِ بام تمنا کچھ بھی نہیں ہے
کسے آنکھوں سے اب دل میں اتاریں

وہی مبہم سی سرگوشی ہوا کی
وہی افسردہ شمعوں کی قطاریں

وہی دھندلے سے ننھے ننھے سائے
وہی سونی سسکتی رہ گزاریں

کہاں تک یادِ غم خواری کرے گی
کہاں تک زلفِ تنہائی سنواریں

مگر اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے
خلا میں اک نیا چہرہ ابھاریں

اٹھو نیندوں سے آنکھوں کو جلائیں
چلو خوابوں کی پریوں کو پکاریں

اسی موضوع پر ایک جدید غزل گو شاعر سید امین اشرف کی غزل بھی دیکھیں:

لذتِ درد نہ یارائے شکیبائی ہے
آج کچھ روٹھی ہوئی یہ شبِ تنہائی ہے

وصل کے لمحوں میں اڑی رات تری یاد مگر
دے کے دستک درِ ہمسایہ سے لوٹ آئی ہے

آخرِ شب ہے مگر نیند کہاں چاند کو آج
جیسے وہ بھی رخِ روشن کا تمنائی ہے

دھڑکنیں خاطرِ شوریدہ سے اٹھی تھیں مگر
ہم یہ سمجھے ترے قدموں کی صدا آئی ہے

لے تری دید کی لذت سے بھی محروم ہوئے
آخرش جرمِ محبت کی سزا پائی ہے

مستیٔ زلف کا سودا نہ گیا دل سے نکل
آج مدت سے یہ سرشار گھٹا چھائی ہے

شہریار کے ہاں تنہائی ایک کیفیت ہے، جس نے ان کی پوری شخصیت کا احاطہ کر رکھا ہے۔ یہ ایک غیر مرئی کیفیت ہے جس کی تجسیم کے لیے مختلف النوع محاکات استعمال کیے گئے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ وہ اس کیفیت سے گلوخلاصی کے لیے پوری جدوجہد کر رہے ہیں۔ پہلے دو اشعار شبِ غم کیا کریں، کیسے گزاریں/ کسے آواز دیں کس کو پکاریں/ سرِ بام تمنا کچھ بھی نہیں ہے/ کسے آنکھوں سے اب دل میں اتاریں، اس پورے موڈ کا ایک ہلکا سا پرتو ہے اور پھر ہوا کی مبہم سی سرگوشی، افسردہ شمعوں کی قطاریں، دھندلے سے ننھے ننھے سائے اور سونی سسکتی رہ گزاریں، تنہائی کے لیے ایسے Objective Corelatives ہیں جو ذہن کو فوراً اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ اصل مسئلہ جو بڑا اہم اور تشکیک طلب ہے، وہ زلفِ تنہائی کو سنوارنے کا ہے۔ یہ غزل ایک تمثیلی فارم ہے، اس کیفیت کے لیے جو دل و جان پر مستولی ہے اور نقطۂ انجام یہ ہے:

اٹھو آنکھوں سے نیندوں کو جلائیں
چلو خوابوں کی پریوں کو پکاریں

آخری مصرعے میں ایک طرح کی Softening نظر آتی ہے مگر یہ محض ایک التباس ہے کیوں کہ مجموعی طور سے اس غزل کا المیہ ایسی بے چارگی کا ہے جس کا تجزیہ ہمیں کافکا کے ناولوں میں ملتا ہے کہ ہم ایک ایسے شکنجے سے دوچار ہیں جس کا کوئی حل نظر نہیں آتا ہے۔ غالب کی اصطلاح

میں "دیوارِ جاں" کے لب سیاہ ابنِ اشرف کی غزل کے متن کی طرف رجوع کریں۔ یہاں بھی موضوع شبِ تنہائی ہی ہے لیکن یہاں تھمے کا احساس اس حد تک اندوہگیں نہیں ہے۔ یہ زبان کے Stylization کا ایسا نمونہ ہے کہ جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ شہریار نے زبان کی خالی ہڈیوں Bake Bones سے پیکروں کی تشکیل کر کے ابلاغ کا کام نکالا ہے۔ ابنِ اشرف کے ہاں تخیل کی زرخیزی اور وجدانی و جمالیاتی پوری ثروت و شوکت کے ساتھ بروئے کار آئی ہیں اور ہر ہر شعر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک طرح کے Resonance کو جنم دے رہا ہے اور غزل کے رموز و علائم ایسی فن کارانہ مہارت کے ساتھ استعمال میں آئے ہیں کہ پایۂ مثال غزل کا پہلا شعر:

لذتِ درد نہ پارائے شکیبائی ہے
آج کچھ روشنی ہوئی یہ شبِ تنہائی ہے

اس کے مزاج اور تقسیم کا سمجھا دے رہا ہے۔ یہاں تنہائی کے واسطے اور حرکت نے ایسی تجسیم نہیں اختیار کی ہے جو اعصاب کی شکستگی کی طرف راجع ہو۔ اس میں بیک وقت مومن اور اصغر کے رنگِ تخیل کی آب و تاب نظر آتی ہے اور محاکات کے گچھے ایک دوسرے کے اندر پیوستہ کمال پیوست ہیں۔

وصل کے لمحوں میں اتری رات تری یاد مگر
دے کے دستک در پہ میرے لوٹ آئی ہے
آخر شب ہے مگر نیند کہاں چاند کو آج
جیسے وہ بھی رخِ روشن کا تمنائی ہے

ان دو اشعار میں دوسرے اشعار کی طرح جو مخصوص Incantatory قوت ہے وہ بے مثال ہے۔ چوتھے شعر:

دھڑکنیں خاطرِ شوریدہ سے اٹھی تھیں مگر
ہم یہ سمجھے ترے قدموں کی صدا آئی ہے

اس میں ایک عنصر تو نکتہ آفرینی یعنی WIT کا ہے اور یہاں دو سمعی پیکروں کے انضمام کی بہت دل کش تصویر پیشِ نظر کر دی گئی ہے اور پانچویں شعر:

لے تری دید کی لذت سے بھی محروم ہوئے
آخرش جرمِ محبت کی سزا پائی ہے

میں پھر وہی روشنی ہوئی شبِ تنہائی کا موجب لوٹ آیا ہے۔ شبِ تنہائی، نیند، خاطرِ شوریدہ، ہجری اور حرماں نصیبی کے محرکات شہریار اور ابنِ اشرف دونوں کے ہاں مشترک ہیں۔ شہریار کی غزل میں "زلفِ تنہائی" کو سنوارنے کی ہمک اور ابنِ اشرف کے ہاں ہستی زلف کے سودا کا دل میں سمایا جانا محیط جذبے یعنی Dominating Passion کی دو مختلف شکلیں ہیں لیکن جہاں اول الذکر کے ہاں شوریدگی اور تھمے میں پھنسے رہنے کا احساس انہیں پیچ و تاب میں گرفتار رکھتا ہے، مؤخر الذکر کے ہاں برداشت کرنے اور فتح پانے کی چمک بہرحال اپنی جہت جگاتی ہے۔

شہریار کی غزلوں میں فکر سے بڑھ کر احساس کا عنصر غالب ہے۔ اسے آپ محویت استغراق کی کیفیت کہہ لیجیے۔ ان کے ہاں بیان اور ادا کا مظاہرہ اس حد تک نہیں ہے جتنا کہ سمجھاوے اور ترسیل کی اہمیت ہے لیکن اس ترسیل کا مقصد دوسروں کو اپنے جذبات اور احساسات میں شریک کرانا نہیں اور اپنے زخموں کی نمائش بھی نہیں ہے لیکن انہیں مسلسل اظہار اور انکشاف سے ضرور سروکار ہے۔ شخصیت کی وحدت کے انتشار اور بکھراؤ کے لیے وہ راکھ، ریت اور زرد پتوں کے امیج استعمال کرتے ہیں، وقت کی ڈور جب ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے اور شخصیت کا استحکام جب چور چور ہو جاتا ہے اور تنہائی کی اذیت برابر کچوکے دیتی رہتی ہے تو شاعری میں بے اطمینانی ہی نہیں بلکہ افسردگی اور اضطراب کی لہر سر اٹھاتی ہے اور گرد و پیش کا ماحول ناساز گار نظر آنے لگتا ہے اور خلا میں گھورتے رہنے کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا۔

شہریار کی غزلیں ایسی ہی کیفیت کو آشکار کرتی ہیں جن کا حوالہ ذاتی بھی ہو سکتا ہے اور خارجی حقائق کی تلخی سے بھی تعلق و ارتباط رکھتا ہے۔ ان کے ہاں کفایت لفظی اس حد تک ہے اور ارتکاز اس درجے پر ہے کہ اس میں نمو پانے کی گنجائش کم ہی نظر آتی ہے۔ یہ غزلیں چھوٹی چھوٹی تصویریں ہیں جن میں دیدہ زیبی کے ساتھ جذبات کے مدوجزر کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ان کے ہاں اظہار ریت کی حد وہیں ختم ہو جاتی ہے جہاں اس کا اختتام ضروری نظر آتا ہے۔ لیکن ان میں ایک طرح کی Full-Throatedness کی کمی کا احساس لابدی ہے۔ اس کا سبب غزل کے فارم کی محدودیت بھی ہو سکتی ہے اور ان کے ذاتی الجھاوے یعنی Dilemma کی نوعیت کا تقاضا اور اصرار بھی۔ غزل کا فارم تو بہرحال اپنا ایک مخصوص سانچا اور پیٹرن رکھتا ہے۔ شہریار کی نظموں میں بھی ایک طرح کی جزرسی نظر آتی ہے۔ مختصر اور طویل نظمیں اپنا الگ منظر نامہ رکھتی ہیں اور اسی طرح مختصر اور طویل غزلیں بھی اپنے اختصاص کی حامل ہوتی ہیں لیکن اس پر مستزاد یہ بھی شہریار کے ہاں کم گوئی کا تاثر رہ رہ کر ابھرتا ہے اور توانائی اور وفور کی ارزانی کا بھی۔ اسی بات کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ جذبے اور احساس کو اس حد تک محدود کر دیتے ہیں کہ ان کے مضمرات کم سے کم ہو جاتے ہیں اور ان کی قوتِ نمو بھی۔ یہ ایک طرح کی ہنرمندی پر بھی دال ہے اور ایک طرح

کی تحدید کی چغلی بھی کھاتی ہے جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا شہریار کی غزلوں کی کائنات چھوٹی چھوٹی تصویروں کی یک جائی سے تشکیل پاتی ہے اور یہ وہ تجربے میں تجربات کی بڑی کھری یعنی Authentic پیشکش سے عبارت ہے ان کے یہاں جذبات سے زیادہ ان کے انعکاس کا فارم اہمیت رکھتا ہے جس پر پڑھنے والے کی نظریں بھی رکتی ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہمارے اردگرد پرچھائیں ہی پرچھائیں ہیں ان کا ذہن ان کا تعاقب کرتا رہتا ہے۔ یہ سب غزلیں مل کر ایک خود نوشت سوانح حیات کے اجزا معلوم ہوتی ہیں۔ یہاں کسی تیسرے آدمی کا گزر نہیں۔ یہ ایک سعی ہے ان جزیروں سے باہر آنے کی جن میں فی الحال شاعر کی ذات محبوس ہے یا بالفاظ دیگر یہ جذبات کے مواد کو ایک فارم میں ڈھالنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ اس مجموعے میں چوبیس کے قریب غزلیں ہیں ان میں وہ جن کے مطلعے حسب ذیل ہیں خاص طور سے توجہ طلب ہیں:

دل دھڑکنے سے خفا ہے اور آنکھیں نم نہیں
پیچھے مڑ کے دیکھنے کی یہ سزا کچھ کم نہیں

کشتیٔ جاں سے اتر جانے کو جی چاہتا ہے
ان دنوں یوں ہے کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

راتیں لوگوں سنو بے کراں ہو گئیں
مشعلیں جتنی تھیں سب دھواں ہو گئیں

خوش بو کا جسم سائے کا پیکر نظر تو آئے
دل جس کو ڈھونڈتا ہے وہ منظر نظر تو آئے

ہوائے کوئے جاناں بس اتنا کام کر جانا
مرا یہ دل کبھی خالی ہو تو اس کو خوں سے بھر جانا

سرخی ذرا سی خواب کے تحریر پہ دیکھ کر
سب رو رہے ہیں چادرِ شب سر پہ دیکھ کر

اور تری یاد نہیں آئی تھی
ایک دو بار طبیعت ذرا گھبرائی تھی

نیند کی اوس سے پلکوں کو بھگوئے کیسے
جاگنا جس کا مقدر ہو وہ سوئے کیسے

بہتے دریاؤں میں پانی کی کمی دیکھا ہے
عمر بھر تجھ کو بھی تشنہ لبی دیکھا ہے

آنکھوں سے خوں چھلکتا رہا دل دکھا رہا
اور اس پہ بھی کسی سے نہ مجھ کو گلا رہا

آندھی کی زد میں شمعِ تمنا جلائی جائے
جس طرح بھی ہو لاج جنوں کی بچائی جائے

عہدِ گل کے بھی آثار ہوا لے جاتی
زرد پتوں کو بہت دور اڑا لے جاتی

سفر کا نشہ چڑھا ہے تو کیوں اتر جائے
مزا تو جب ہے کوئی لوٹ کے نہ گھر جائے

شہریار کی غزلوں میں ایک ندرت اور انفرادیت ہے۔ ان سب غزلوں میں جن کے مطلعے اوپر دیے گئے ' اپنی بات ' اپنی ڈھنگ سے کہنے کا انداز ہے جو ذہن پر فوری اثر چھوڑتا ہے۔ بہت سے ایسے کائنات ہیں جو ان کی نظموں اور غزلوں میں مشترک ہیں ان غزلوں میں جو داخلیت ہے وہ غزل کی شاعری میں کمیاب ہے یہاں جذباتی کیفیات کے اظہار میں ایک ٹھہراؤ ہے یہاں Idealization اتنا گہرا نہیں ہے جتنا کہ عام طور سے غزل سے مختص ہے۔ ہمارے زمانے کے بہت بڑے شاعر ڈبلیو۔ بی۔ ییٹس نے لکھا تھا کہ شاعری اپنی ذات سے الجھنے سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی زبان تخیل کی زبان ہے۔ اپنے آپ سے الجھنے کا عمل یہاں قدم قدم پر ہے۔ اسی طرح صرف جذبات اور احساسات کی ترسیل اور ان کا ابلاغ کافی نہیں ہے بلکہ آرٹ کی دنیا میں ایسی تجسیم اور ایسے فارم کا ابھارنا ' جسے غور و فکر کا محور بنایا جا سکے۔ یہ سب غزلیں مل کر ایک ایسی کائنات کو جنم دیتی ہیں جسے کسی غزل کو کسی مخصوص کائنات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں عناصر یعنی جذبات کا فارم بھی اور اپنی مخصوص کائنات کے نقوش بھی میرے حصے کی زمین میں موجود ہیں اور یہی ہمارے ردِعمل کو متعین کرتے ہیں۔

وحشت کا سبب

حضرت شہریار کے غزلیہ کلام سے مختصر انتخاب

صفوت علی صفوت (نیوارک)

O

سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے
اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے

دل ہے تو دھڑکنے کا بہانہ کوئی ڈھونڈے
پتھر کی طرح بے حس و بے جان سا کیوں ہے

تنہائی کی یہ کون سی منزل ہے رفیقو!
تاحدِ نظر ایک بیابان سا کیوں ہے

ہم نے تو کوئی بات نکالی نہیں غم کی
وہ زود پشیمان' پشیمان سا کیوں ہے

کیا کوئی نئی بات نظر آتی ہے ہم میں
آئینہ ہمیں دیکھ کے حیران سا کیوں ہے

O

O

عجیب سانحہ مجھ پر گزر گیا یارو
میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو

ہر ایک نقش تمنا کا ہو گیا دُھندلا
ہر ایک زخم مرے دل کا بھر گیا یارو

بھٹک رہی تھی جو کشتی وہ غرق آب ہوئی
چڑھا ہوا تھا جو دریا اتر گیا یارو

وہ کون تھا' وہ کہاں کا تھا' کیا ہوا تھا اُسے
سُنا ہے آج کوئی شخص مر گیا یارو

میں جس کو لکھنے کے ارمان میں جیا اب تک
ورق ورق وہ فسانہ بکھر گیا یارو

O

○

جب بھی ملتی ہے مجھے اجنبی لگتی کیوں ہے
زندگی روز نئے رنگ بدلتی کیوں ہے

دھوپ کے قہر کا ڈر ہے تو دیارِ شب سے
سربرہنہ کوئی پرچھائیں نکلتی کیوں ہے

مجھ کو اپنا نہ کہا اس کا گلا تجھ سے نہیں
اس کا شکوہ ہے کہ بیگانہ سمجھتی کیوں ہے

تجھ سے مل کر بھی نہ تنہائی مٹے گی میری
دل میں رہ رہ کے یہی بات کھٹکتی کیوں ہے

مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو مری وحشت کا سبب
بوئے آوارہ سے پوچھو کہ بھٹکتی کیوں ہے

○

○

تجھ سے بچھڑے ہیں تو اب کس سے ملاتی ہے ہمیں
زندگی دیکھیے کیا رنگ دکھاتی ہے ہمیں

مرکزِ دیدہ و دل تیرا تصور تھا کبھی
آج اس بات پہ کتنی ہنسی آتی ہے ہمیں

پھر کہیں خواب و حقیقت کا تصادم ہو گا
پھر کوئی منزلِ بے نام بُلاتی ہے ہمیں

دل میں وہ درد نہ آنکھوں میں وہ طغیانی ہے
جانے کس سمت یہ دنیا لیے جاتی ہے ہمیں

گردشِ وقت کا کتنا بڑا احساں ہے کہ آج
یہ زمیں چاند سے بہتر نظر آتی ہے ہمیں

○

O

یہ کیا جگہ ہے دوستو' یہ کون سا دیار ہے
حدِ نگاہ تک جہاں غبار ہی غبار ہے

ہر ایک جسم روح کے عذاب سے نڈھال ہے
ہر ایک آنکھ شبنمی' ہر ایک دل فگار ہے

ہمیں تو اپنے دل کی دھڑکنوں پہ بھی یقیں نہیں
خوشا وہ لوگ جن کو دوسروں پہ اعتبار ہے

نہ جس کا نام ہے کوئی' نہ جس کی شکل ہے کوئی
اک ایسی شئے کا کیوں ہمیں ازل سے انتظار ہے

O

متاعِ عمر ہی کیا' جاتی رائیگاں یوں بھی
ادا ہوا نہ مگر قرضِ دوستاں یوں بھی

ضرور کیا تھا کہ تم بھی کرو کرم سے گریز
ہمیں تو یاد تھی بے مہریٔ جہاں یوں بھی

بہانہ مل گیا اِس کو ترے تغافل کا
وگرنہ دل کو تو ہونا تھا بدگماں یوں بھی

زبانِ غیر کو دیتے ہیں درسِ طرزِ سخن
ستم نصیب کیا کرتے ہیں فغاں یوں بھی

O

O

وحشت میری کتنی راس آئی مجھ کو
اک عالم کی سیر کرا لائی مجھ کو

میں جینے سے باز نہ آؤں گا یارو!
دیوانہ سمجھو یا سودائی مجھ کو

شہرت کے اس سحر سے جلد نجات ملے
ڈھونڈھ رہی ہے کب سے رسوائی مجھ کو

بزمِ ناز سے خالی ہاتھ اٹھوں کیسے
مل جائے تھوڑی سی تنہائی مجھ کو

تیرا بدل کہہ سکتیں جس کو یہ آنکھیں
خوابوں نے وہ شکل نہ دکھلائی مجھ کو

O

o

جستجو جس کی تھی اس کو تو نہ پایا ہم نے
اس بہانے سے مگر دیکھ لی دنیا ہم نے

سب کا احوال وہی ہے جو ہمارا ہے آج
یہ الگ بات کہ شکوہ کیا تنہا ہم نے

خود پشیمان ہوئے نے اسے شرمندہ کیا
عشق کی وضع کو کیا خوب نبھایا ہم نے

کون سا قہر یہ آنکھوں پہ ہوا ہے نازل
ایک مدت سے کوئی خواب نہ دیکھا ہم نے

عمر بھر سچ ہی کہا' سچ کے سوا کچھ نہ کہا
اجر کیا اس کا ملے گا یہ نہ سوچا ہم نے

o

o

معبدِ زیست میں بت کی مثال جڑے ہوں گے
یہ ننھے بچے جس روز بڑے ہوں گے

اتنے دکھی' اس درجہ اداس جو سائے ہیں
رات کے دشت میں تیز ہوا سے لڑے ہوں گے

دھوپ کے قہر کی لذت کے شیدائی ہیں
یہ اشجار بھی خواب سے چونک پڑے ہوں گے

ہم کو خلا کی وسعت سے فرصت نہ ملی
لاکھ خزانے اس دھرتی میں گڑے ہوں گے

وہ دن ہو گا آخری دن ہم سب کے لیے
آئینہ دیکھنے جب ہم لوگ کھڑے ہوں گے

o

O

دھوپ کے دشت میں بے سایہ شجر میں ہم تھے
منہمک پھر بھی سرابوں کے سفر میں ہم تھے

منتشر کر چکی آندھی تو یہ معلوم ہوا
اک بگولے کی طرح ریت کے گھر میں ہم تھے

تیری آواز کے جادو نے خبردار کیا
نا سمجھ تھے کہ بلاؤں کے اثر میں ہم تھے

نا شناسائی رہے دریائے ہوس کی کوئی موج
بادباں جسم کے کھولے کہ بھنور میں ہم تھے

یہ ترے قُرب کا اعجاز ہے ورنہ پہلے
طاق اتنے کہاں جینے کے ہنر میں ہم تھے

O

O

نشاط غم بھی ملا' رنج شادمانی بھی
مگر وہ لمحے بہت مختصر تھے فانی بھی

کھلی ہے آنکھ کہاں' کون موڑ ہے یارو
دیارِ خواب کی باقی نہیں نشانی بھی

رگوں میں ریت کی اک اور تہ جمی دیکھو
کہ پہلے جیسی نہیں خون میں روانی بھی

بھٹک رہے ہیں تعاقب میں اب سرابوں کے
ملا نہ جن کو سمندر سے بوند پانی بھی

زمیں بھی ہم سے بہت دُور ہوتی جاتی ہے
ڈرا رہی ہے خلاؤں کی بیکرانی بھی

طویل ہونے لگی ہیں اسی لیے راتیں
کہ لوگ سُنتے سُناتے نہیں کہانی بھی

O

O

آئینہ بن کے اسے خود میں اُترتا دیکھو
ہر بُنِ مو سے بلاؤں کو گزرتا دیکھو

تا کہ سرسبز ہوں پھر کھیتیاں آوازوں کی
نغمۂ جاں کو خلاؤں میں بکھرتا دیکھو

ریت بے فیض تھی، بے مہر مگر ریت نہ تھی
ریت کے غم میں بگولوں کو بچھڑتا دیکھو

تابِ نظارہ ہے آنکھوں میں تو آنکھیں کھولو
شہر اک خوابوں کا، خوابوں میں اُبھرتا دیکھو

O

میں زندہ ہوں اس کا مجھ کو کچھ تو یقیں آئے
بے آباد مکانِ دل میں کوئی مکیں آئے

اب جو حال پہ مستقبل کا سایہ رہتا ہے
بچھڑے لوگوں کا احسان ہے یاد نہیں آئے

دھول بھری دوپہر سے رشتہ پھر سے قائم ہو
کوئی جتن کہ ختم خلا ہو اور زمیں آئے

یہ جو سفر کی سرشاری ہے کچھ دن اور رہے
آتا ہی ہے موڑ کوئی تو آگے کہیں آئے

O

O

تمام خلقِ خدا دیکھ کے یہ حیراں ہے
کہ سارا شہر مرے خواب سے پریشاں ہے

میں اس سفر میں کسی موڑ پر نہیں ٹھہرا
رہا خیال کہ وہ وادیٔ غزالاں ہے

یہ ایک میں کہ تری آرزو ہی سب کچھ ہے
وہ ایک تو کہ مرے سائے سے گریزاں ہے

تو حافظے سے ترا نام کیوں نہیں مٹتا
جو یاد رکھنا ہے مشکل بھلانا آساں ہے

میں اس کتاب کے کس باب کو پڑھوں پہلے
وصال جس کا ہے مضموں فراق عنواں ہے

O

o

عشق کہیئے کہ ہوس اس کی بدولت کچھ ہے
راکھ کے ڈھیر میں چنگاری کی صورت کچھ ہے

عمر بھر مَیں کبھی سیراب نہیں ہو سکتا
چشمِ جاناں میں ہے کچھ میری ضرورت کچھ ہے

میری تنہائی سے جلتی ہے مری دشمن ہے
پوچھے دنیا سے کوئی مجھ سے عداوت کچھ ہے

تیز آندھی میں اندھیروں کے ستم سہتے رہے
رات کو پھر بھی چراغوں سے شکایت کچھ ہے

میری بربادی میں کچھ ہاتھ نہیں ہے تیرا
مجھ کو بھی کہنے کی اے دوست اجازت کچھ ہے

زندگی سے ابھی رشتہ نہیں ٹوٹا میرا
کل کا احوال تھا کچھ، آج کی حالت کچھ ہے

آج کی رات میں گھوموں گا کھلی سڑکوں پر
آج کی رات مجھے خوابوں سے فرصت کچھ ہے

o

o

بڑھا دے مری وحشتیں چاک میرا گریبان کر دے
کوئی ہے جو یہ زندگی کا سفر مجھ پہ آسان کر دے

مجھے نیند مت دے کہ میں خواب سے منحرف ہو گیا ہوں
مگر رات بھر جاگنے کے لئے کوئی سامان کر دے

مرے دل کے اجڑے مکاں کو مکینوں سے محروم رکھا
بہت ہو چکا اب کسی شخص کو اس میں مہمان کر دے

مری رات کیوں اتنی تاریک ہوتی چلی جا رہی ہے
سبب اس کا کچھ بھی نہیں میں ہوں یہ کہہ کے حیران کر دے

دکھائی نہ دی آج تک دیکھنے کو جہاں دیکھ ڈالا
کوئی شکل ایسی کہ جو آئینوں کو پشیمان کر دے

o

o

جاں پھر سے لرز اٹھی دل درد سے بھر آیا
اک ایسا نیا منظر آنکھوں کو نظر آیا

ہر گام پہ رستے میں تھیں دھوپ کی دیواریں
مجھ جیسا برہنہ سر ان سے بھی گزر آیا

دریا تری موجوں کی انگڑائیاں گنتا ہوں
پیاسا ہوں مقدر میں یہ ایک ہنر آیا

بیدار دریچوں پر دستک سی سنائی دی
جب جب کبھی بھولے سے میں لوٹ کے گھر آیا

پہلے تجھے دیکھا تھا پرچھائیں کی صورت میں
پھر جسم ترا میری رگ رگ میں اتر آیا

o

o

میں چاہتا ہوں نہ آئیں عذاب آئیں گے
یہ جتنے لوگ ہیں زیرِعتاب آئیں گے

اس اک خبر سے سراسیمہ ہیں سبھی کہ یہاں
نہ رات ہوگی نہ آنکھوں میں خواب آئیں گے

ذرا سی دیر ہے خوشبو و رنگ کا میلہ
خزاں کی زد میں ابھی یہ گلاب آئیں گے

ہر ایک موڑ پہ ایک حشر سا بپا ہو گا
ہر ایک لمحہ نئے انقلاب آئیں گے

پلٹ کے آئے نہیں کیوں جنوں کی وادی سے
جنہیں یہ زعم تھا وہ کامیاب آئیں گے

o

O

وہ جو وہاں اک عکس ہے سہما ہوا ڈرا ہوا
دیکھا ہے اس نے غور سے سورج کو ڈوبتا ہوا

تکتا ہوں کتنی دیر سے دریا کو میں قریب سے
رشتہ ہر ایک ختم کیا پانی سے پیاس کا ہوا

ہونٹوں سے آگے کا سفر بہتر ہے ملتوی کریں
وہ بھی ہے کچھ نڈھال سا میں بھی ہوں کچھ تھکا ہوا

کل اک برہنہ شاخ سے پاگل ہوا لپٹ گئی
دیکھا تھا خود یہ سانحہ لگتا ہے جو سنا ہوا

پیروں کے نیچے سے مرے کب کی زمیں نکل گئی
جینا ہے اور یا نہیں اب تک نہ فیصلہ ہوا

O

O

جنوں کے جتنے تقاضے ہیں بھولے جاتے ہیں
کہ ساتھ وقت کے لو ہم بھی بدلے جاتے ہیں

ضرور ہم سے ہوئی ہے کہیں پہ کوتاہی
تمام شہر میں سناٹے پھیلے جاتے ہیں

کہ آن پہونچا ہے دریا ترے زوال کا وقت
جو ہم سے لوگ کنارے پہ ٹھہرے جاتے ہیں

زمیں نے ہم کو بہت دیر میں قبول کیا
جلی حروف میں یہ بات لکھے جاتے ہیں

وہی کہ جس سے تعلق برائے نام ہے اب
اُسی کا راستہ دن رات دیکھے جاتے ہیں

O

o

کشتیِ جاں سے اتر جانے کو جی چاہتا ہے
ان دنوں یوں ہے کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

گھر میں یاد آتی تھی کل دشت کی وسعت ہم کو
دشت میں آئے تو گھر جانے کو جی چاہتا ہے

کوئی صورت ہو کہ پھر آگ رگ و پے میں بجے
راکھ بننے کو بکھر جانے کو جی چاہتا ہے

کیسی مجبوری و لاچاری ہے اس کوچے میں
جا نہیں سکتا مگر جانے کو جی چاہتا ہے

قرب پھر تیرا میسر ہو کہ اے راحتِ جاں
آخری حد سے گذر جانے کو جی چاہتا ہے

o

o

دل میں طوفان ہے اور آنکھوں میں طغیانی ہے
زندگی ہم نے مگر ہار نہیں مانی ہے

غمزدہ وہ بھی ہیں دشوار ہے مرنا جن کو
وہ بھی شاکی ہیں جنہیں جینے کی آسانی ہے

دور تک ریت کا تپتا ہوا صحرا تھا جہاں
پیاس کا کس کی کرشمہ ہے وہاں پانی ہے

جستجو تیرے علاوہ بھی کسی کی ہے ہمیں
جیسے دنیا میں کہیں کوئی ترا ثانی ہے

اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں سبھی آخر میں
حاصلِ سیرِ جہاں کچھ نہیں حیرانی ہے

o

o

جو بات کرنے کی تھی کاش میں نے کی ہوتی
تمام شہر میں اک دھوم سی مچی ہوتی

بدن تمام گلابوں سے ڈھک گیا ہوتا
مرے لبوں نے اگر آبیاری کی ہوتی

بس اتنا ہوتا مرے دونوں ہاتھ بھر جاتے
ترے خزانے میں بتلا کوئی کمی ہوتی

فضا میں دور تلک سانسوں کے شرر اڑتے
زمیں پہ دور تلک چاندنی بچھی ہوتی

میں اس طرح نہ جہنم کی سیڑھیاں چڑھتا
ہوس کو میری جو تونے ہوا نہ دی ہوتی

o

o

تمہارے شہر میں کچھ بھی ہوا نہیں ہے کیا
کہ تم نے چیخوں کو سچ مچ سنا نہیں ہے کیا

تمام خلقِ خدا اس جگہ رکی کیوں ہے
یہاں سے آگے کوئی راستہ نہیں ہے کیا

لہولہان سبھی کر رہے ہیں سورج کو
کسی کو خوف یہاں رات کا نہیں ہے کیا

میں ایک عرصے سے حیران ہوں کہ حاکمِ شہر
جو ہو رہا ہے اسے دیکھتا نہیں ہے کیا

اجاڑتے ہیں جو نادان اسے اجڑنے دو
کہ اجڑا شہر دوبارہ بسا نہیں ہے کیا

o

O

حقیقت ہوں کہ بس اک واہما ہوں
یہ پوچھا جا رہا ہے مجھ سے کیا ہوں

بہت خوش اجنبی لوگوں سے مل کر
ہوا ہوں دوستو اکثر ہوا ہوں

یہاں سے کوئی گذرے گا نہیں کیا
کہ مدت سے یہاں تنہا کھڑا ہوں

کہاں پہ ساتھ چھوڑا یادِ جاناں
سکوتِ شام سے ڈرنے لگا ہوں

مجھے اب بھی ہیں سورج سے امیدیں
اندھیروتم سے جو میں لڑ رہا ہوں

کہوں گر ساتھ دیں الفاظ میرا
میں ان آنکھوں سے جو کچھ دیکھتا ہوں

O

O

دوست احباب کی نظروں میں برا ہو گیا میں
وقت کی بات ہے کیا ہوا تھا کیا ہو گیا میں

دل کے دروازے کو وا رکھنے کی عادت تھی مجھے
یاد نہیں آتا کب کس سے جدا ہو گیا میں

کیسے تو سنتا بڑا شور تھا سناٹوں کا
دور سے آتی ہوئی ایسی صدا ہو گیا میں

کیا سبب اس کا تھا خود مجھ کو بھی معلوم نہیں
رات خوش آ گئی اور دن سے خفا ہو گیا میں

بھولے بسرے ہوئے لوگوں میں کشش اب بھی ہے
ان کا ذکر آیا کہ پھر نغمہ سرا ہو گیا میں

O

شکوہ کوئی دریا کی روانی سے نہیں ہے

بیدار بخت (کینیڈا)

کچھ دن ہوئے کراچی کے اخبار ڈان میں شہریار پر ایک مضمون چھپا جو ان کے ایک مداح نے لکھا تھا۔ مضمون نگار نے شروع میں اس کا اعتراف کیا کہ شہریار کی ادبی حیثیت ایک "فلمی شاعر" کے مرتبے سے بہت زیادہ بلند ہے مگر مضمون میں سوائے فلموں، فلم والوں اور غزل گانے والوں کے اور کوئی بات نہ تھی۔ میں نے شکایتاً شہریار سے اس مضمون کا ذکر کیا کہ اس میں ان کی غیر فلمی شاعری کا کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔ شہریار کے جواب میں کوئی تلخی نہیں تھی۔ "یہی انہوں نے جو مجھ سے پوچھا میں نے جواب دے دیا۔" مجھے خیال آیا کہ یہ بے نیازی تو شہریار کی شخصیت کی خاصیت بھی ہے اور ان کی شاعری کی وجہ امتیاز بھی۔ مجروح سلطان پوری جیسے تیز مزاج والے شاعر سے کوئی نامہ نگار ایسے سوال کرتا جو شہریار سے کیے گئے تو جوابات شاید ناقابل اشاعت ہوتے۔ مگر شہریار تو زندگی اور شاعری دونوں میں کم بیانی کے قائل ہیں۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی، انہوں نے "خود کو گفتگو یا دھیمی کا شور بنانا سیکھا ہی نہیں۔"

علی گڑھ میں شہریار کی یونیورسٹی تعلیم کا عرصہ تقریباً وہی تھا جو میرا تھا مگر ان سے بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی۔ میں انہیں ایک چھریرے بدن کے خوب رو کھلاڑی کی حیثیت سے جانتا تھا، جو گھنٹوں این آر ایس سی کلب میں بیڈمنٹن کھیلا کرتا تھا۔ ہمارے ایک کامریڈ دوست انہیں کنور صاحب کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ شاعر شہریار سے میری پہلی ملاقات علی گڑھ میگزین میں ہوئی جو 1960 یا 1961ء میں چھپا تھا۔ ان کی دو مختصر نظمیں آل احمد سرور، اختر الایمان، سلام مچھلی شہری، منیب الرحمٰن اور خلیل الرحمٰن اعظمی کی نظموں کے ساتھ چھپنے کی وجہ سے خاص توجہ کی طالب ہوئیں، اور ان کے ادبی مرتبے کا خاطر خواہ رعب پڑا۔ ایک نظم "شہر اور گاؤں" کے عنوان سے چھپی تھی اور دوسری "فقدان" کے عنوان سے۔ "شہر اور گاؤں" اس طرح شائع ہوئی تھی:

یہاں کیا ہے بجز تیرگی ہے
خلا ہے آنکھیں ہیں تشنگی ہے
یہاں جس کے لیے آئے تھے وہ شے
کسی قیمت پہ بھی ملتی نہیں ہے
جو اپنے ساتھ ہم لائے تھے وہ بھی
یہیں کھو جائے گا گر کی نہ جلدی
چلو جلدی چلو اپنے مکاں کے
کواڑوں کی جبیں پر ثبت ہو گی
کوئی دستک ابھی بچے دنوں کی
یہاں کیا ہے بجز تیرگی ہے
خلا ہے آنکھیں ہیں تشنگی ہے

یہ نظم اختر الایمان کی نظم "پرانی فصیل" کے آہنگ کی یاد دلاتی ہے جس کے دو مصرعے ذیل میں درج ہیں۔

یہاں امرد ہیں، سرگوشیاں ہیں، بے نیازی ہے
یہاں مفلوج تر ہیں تیز تر بازو ہواؤں کے

اختر الایمان کی طرح شہریار بھی اپنے شعر میں رد و بدل کرتے رہتے ہوں گے۔ 1965ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ "اسم اعظم" کے نام سے شائع ہوا جس میں اوپر لکھی ہوئی نظم "واپسی" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ آخری دو مصرعے جو پہلے دو مصرعوں کی تکرار تھے، حذف کر دیے گئے۔ دوسری نظم "فقدان" شعری مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ دو مصرعوں کا حذف کرنا اور ایک نظم کا شعری مجموعے میں شامل نہ کرنا شہریار کی خود احتسابی کی دلیل ہے اور نظم کا عنوان بدلنا اس پختگی کی نشاندہی کرتا ہے جس کے تحت شاعر کو اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ شعر کے معنی کو کسی حد تک محدود کرنا شعر کے درجے کو پست کرنے کے مترادف ہے۔

کنور اخلاق محمد خاں 16 جون 1936ء میں ضلع بریلی کے ایک چھوٹے سے گاؤں آنولہ میں ایک پولیس انسپکٹر کے ہاں پیدا ہوئے۔ 1948ء میں والد کے ساتھ علی گڑھ آئے اور 1954ء میں وہیں سے ہائی سکول پاس کیا۔ اس کے ایک سال بعد، جب اس خوب رو نوجوان کی عمر 19 برس کی تھی، اس نے اپنا گھر چھوڑ کر خلیل الرحمٰن اعظمی کے ساتھ رہنا شروع کر دیا۔ خلیل صاحب کی عمر اس وقت کوئی 28 سال کی تھی۔ جب میں 1956ء میں علی گڑھ گیا تو وہاں بے راہ روی کا چلن عام تو نہ تھا، مگر اشارے ضرور ہوا کرتے تھے اور اشاروں کنایوں میں اس کا ذکر بظاہر سنجیدہ لوگ بھی روا سمجھتے تھے۔ خلیل صاحب اور شہریار کی دوستی کے بارے میں بھی کچھ افواہیں علی گڑھ میں گردش کیا کرتی تھیں۔ عجب نہیں کہ کئی سال پہلے ایسی ہی افواہیں خلیل الرحمٰن اعظمی اور جذبی کے بارے میں بھی چلی ہوں، جب نوجوان خلیل الرحمٰن نے عمر میں پندرہ سال بڑے جذبی کے گھر رہنا شروع کر دیا تھا۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کی دوررس نگاہ نے کنور اخلاق محمد خاں کی خداداد طبع شاعری کو دیکھ لیا تھا۔ انہیں شعر کہنے کی ترغیب دی۔ جب شاذ تمکنت نے ان کے "قصباتی" نام پر اعتراض کیا تو کنور صاحب نے خلیل صاحب کے مشورے پر اپنا شعری نام شہریار کر لیا۔ اب شہریار ان کا خاندانی نام بھی ہو گیا ہے۔

شہریار نے پہلا شعری مجموعہ، اسم اعظم، خلیل الرحمٰن اعظمی کے نام معنون کیا یہ کہہ کر کہ: عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں۔ جب خلیل الرحمٰن

اعظمی کی تاریخ ساز کتاب 'اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک' پہلی بار 1957ء میں شائع ہوئی۔ تو انہوں نے اس کا انتساب شہریار کے نام کیا۔ 'اسم اعظم' اور خلیل صاحب کا شعری مجموعہ 'نیا عہد نامہ' تقریباً ایک ساتھ ہی شائع ہوئے۔ راہی معصوم رضا نے دونوں مجموعوں کے ناموں کے بارے میں یہ کہہ کر اعتراض کیا تھا کہ ایک نے اپنے کلام کو اسم اعظم کا رتبہ دے دیا اور دوسرے نے اپنے مجموعے کو انجیل مقدس کا نام دے دیا۔

شہریار کو خلیل الرحمن اعظمی سے اتنی شدید عقیدت اور محبت ہے جیسی شاید امیر خسرو کو اپنے پیر و مرشد نظام الدین اولیا سے رہی ہوگی۔ شہریار کا ایک جامع انتخاب ساہتیہ اکادمی نے "دھند کی روشنی" کے عنوان سے 2003ء میں چھاپا۔ اس کے مختصر سے دیباچے میں شاعر نے اعتراف کیا ہے کہ "میں جو کچھ بھی ہوں جیسا بھی ہوں وہ صرف اور صرف خلیل الرحمن اعظمی کا فیضان ہے" شہریار نے خلیل صاحب کا پس مرگ دیوان 'زندگی اے زندگی' کے نام سے ان کے شاگرد ابوالکلام قاسمی کے ساتھ مل کر ترتیب دیا۔ حال ہی میں شہریار کی مرتب کی ہوئی خلیل الرحمن اعظمی کے مضامین کی دو جلدیں مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے شائع کیں۔

"اسم اعظم" پر ابوالفضل کا تبصرہ اور 'نیا عہد نامہ' پر سردار جعفری کا تبصرہ خود ان کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالے "گفتگو" میں ایک ساتھ چھپے۔ ابوالفضل نے لکھا کہ "اسم اعظم ایک نئے اور اچھے شاعر کے تجربات و احساسات کا پہلا خوبصورت کتابی روپ ہے۔ اس میں زندگی کے اوپری پردوں کے پیچھے ہونے والے لازوال رازداری کی لے تو مدھم ہے لیکن تاثر کی دھیمی دھیمی آنچ اور فکر و خیال کی تازگی ہر جگہ نمایاں ہے۔" شہریار کے پہلے مجموعے کا پیش لفظ وحید اختر نے لکھا جس میں انہوں نے موصوف کو ایسے شاعروں میں شمار کیا تھا جنہیں 'وقت کی آواز' کہا جا سکتا ہے۔" کتاب کے فلیپ پر آل احمد سرور اور مغیث الرحمن نے بھی شہریار کی شاعری کو سراہا تھا۔ غرض یہ کہ شہریار اپنے پہلے دیوان کی اشاعت کے بعد اردو دنیا کے چند اچھے جدید شاعروں میں شمار کیے جانے لگے۔ دیوان کی اشاعت سے پہلے بھی وہ خاصے مشہور تھے۔ علی گڑھ اور یوپی، دہلی کے ادبی حلقوں میں ان کی خاصی دھوم تھی۔ عجب نہیں کہ کچھ دوشیزائیں اپنے تکیے کے نیچے ان کی تصویر نہیں تو ان کی نظمیں رکھتی ہوں گی۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے برآمدوں میں اب بھی یہ افسانوی راز سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے کہ "ان آنکھوں کی مستی کے مستانے ہزاروں ہیں" والی غزل جو بعد میں ایک فلم کے گانے کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئی ایک ایسی ہی دوشیزہ کے لیے لکھی گئی تھی۔

"اسم اعظم" کی اشاعت کے وقت شہریار انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ میں لٹریری اسسٹنٹ تھے جہاں ان کے فرائض میں انجمن کے رسائل "اردو ادب" اور "ہماری زبان" کی ادارت بھی تھی۔ 1966ء میں ان کا تقرر علی گڑھ یونیورسٹی کے اردو شعبے میں لیکچرار کے طور ہو گیا۔ اس زمانے میں آل احمد سرور اس شعبے کے صدر تھے۔ شہریار، سرور صاحب کے گھر کے فرد کی طرح تھے آج بھی سرور صاحب کی نواسی درخشندہ جلیل انھیں ماموں کہہ کر پکارتی ہے اس نسبت سے کہ سرور صاحب کے بڑے صاحبزادے صدیق احمد صدیقی شہریار کو بھائی کی طرح عزیز ہیں۔ میں نے درخشندہ کو شہریار کی صحت کے بارے میں بیٹی کی طرح فکر مند ہوتے دیکھا ہے۔ شہریار کی دوستیاں اور رفاقتیں ہمیشہ کے لیے ہوتی ہیں۔

شہریار کو ایک عشق تو شاعری سے تھا، دوسرا عشق ملیح آباد کی ایک ملیحہ نجمہ محمود سے ہوا، خود موصوف کی پیش قدمی کے باعث۔ 1968ء میں امتحان کا وقت آیا کہ جیب میں پیسے اس کی اجازت دیتے تھے کہ یا تو ملیحہ سے شادی کی جائے یا اپنا دوسرا مجموعہ چھپوایا جائے۔ معروف نقاد اور شاعر شمس الرحمن فاروقی نے شہریار کی مشکل شعری مجموعے کی اشاعت کا ذمہ لے کر آسان کر دی۔ اگر اردو دنیا میں کوئی شادی 'ادبی' ہو سکتی ہے تو وہ شہریار کی ہوئی۔ 1968ء میں ادیبوں کا ایک قافلہ، جس میں آل احمد سرور اور مغیث الرحمن جیسے کہنہ مشق ادیب بھی تھے اور شمس الرحمن فاروقی، محمود ہاشمی اور زبیر رضوی جیسے نئے ادب کے علمبردار بھی شہریار کے ساتھ ملیح آباد گیا اور نجمہ محمود کو نجمہ شہریار بنا کر واپس علی گڑھ لایا۔ اس پریوں کی کہانی کی شادی کا چرچا اردو ادبی حلقوں میں مدت تک رہا۔

1969ء میں شہریار کا دوسرا شعری مجموعہ 'ساتواں در' شمس الرحمن فاروقی کے شب خون کتاب گھر، الہ آباد نے شائع کیا۔ یہ کتاب صدیق احمد صدیقی کے نام معنون ہے مگر کتاب کے آخری تہائی کے قریب صفحے 'حرف ناز' کے عنوان سے نجمہ شہریار کے نام ہیں۔ کتاب کی پشت پر صدیق احمد صدیقی کی کھینچی ہوئی ایک نیم رخی تصویر ہے جس میں شہریار علی گڑھ کے اردو کے ایک استاد کی بجائے امریکی فلموں کے ایک اداکار نظر آتے ہیں۔ اس کتاب پر اتر پردیش کی اردو اکادمی نے ایک انعام دیا۔

شہریار کا تیسرا شعری مجموعہ 'ہجر کے موسم' کے نام سے 1978ء میں چھپا۔ انتساب نجمہ شہریار کے نام ہے، اس شعر کے ساتھ:

آنکھوں میں تیری دیکھ رہا ہوں میں اپنی شکل
یہ کوئی واہمہ، یہ کوئی خواب تو نہیں

دیباچہ خلیق انجم کا تھا، جس میں انہوں نے لکھا

'شہریار کے لب و لہجے پر زندگی کی ناہمواریوں، ناکامیوں اور یاسیت کی تلخی اور درشتی کی گہری پرچھائیاں ہیں۔ ان کے ہونٹوں پر کھلی ہوئی طنزیہ مسکراہٹ بھی اس لب و لہجے میں شامل ہے، جس کی وجہ سے تلخی میں شدت پیدا ہو گئی ہے لیکن یہ تلخی ان حدود کو پار نہیں کرتی جہاں فن کار پر قنوطی یا یاسیت پسند ہونے کا الزام عائد ہوتا ہے۔ شہریار اپنے دھیمے اور گنگناتے لب و لہجے

آواز کی جرأت مندی اور مستقبل پر بھرپور اعتماد کے اظہار سے اس کمی کو ہمارے لیے گوارا بنا دیتے ہیں۔"

1974ء سے 1981ء تک Indian Council for Cultural Relations نے چار جلدوں میں ہندوستان کی 14 زبانوں کی موجودہ شاعری کے انتخاب کا انگریزی ترجمہ چھاپا۔ اردو شاعری کا انتخاب جسے گوپی چند نارنگ نے کیا، چوتھی جلد میں شامل ہے۔ کتاب میں شہریار کی چھ نظموں کا ترجمہ بھی ہے اور نارنگ صاحب کا جدید شاعری پر ایک بسوط مقالہ بھی۔ اس مقالے کے ایک اقتباس کا اردو ترجمہ نیچے درج ہے:

"شہریار کو اس کی فکر نہیں ہے کہ ان کے شعر میں پیغام یا فیصلے ہوں۔ وہ اس روحانی کرب اور نفسیاتی کش مکش کا اظہار کرتے ہیں جس سے آج کا ذہنی آدمی دوچار ہے۔ ہم وقت اور موت کی بے رحم چکیوں کے درمیان معلق ہونے کے باوجود حال کے لمحے میں جینے پر مجبور ہیں۔ شہریار دکھ و درد کے مختصر لمحوں میں زندگی کے اصلی چہرے کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

شہریار کی کم بیانی پر ستر والوں کی کم گوئی نے جنم پایا جس کے نتیجے میں ان کی مختصر نظمیں وجود میں آئی ہوں گی۔ اردو میں مختصر نظموں کو رائج کرنے والے اختر الایمان تھے۔ ان کی مختصر نظمیں چٹکلوں کی حیثیت سے تو بہت کامیاب رہیں، مگر بڑی نظمیں نہ بن سکیں۔ انھیں شاعر نے بقول خود "چلتے پھرتے" لکھا تھا۔ اس کے برعکس منیر نیازی اور شہریار کی بہت سی مختصر نظموں کا شمار اردو کی بڑی نظموں میں کیا جا سکتا ہے۔ مجھے اختر الایمان کی مختصر نظمیں ایسی لگتی ہیں جسے مصوری یا معماری کی اصطلاح میں فارسی میں "بے رنگ" کہتے ہیں، یعنی وہ خاکہ جو مصور یا معمار تصویر یا عمارت بنانے سے پہلے کھینچتا ہے۔

(حیرت ہے کہ اردو والے اکثر غالب کے اس فارسی شعر میں "بے رنگ" کو پھیکا اور بے لطف کے معنی میں لیتے ہیں:

فارسی بیں تا ببینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است

اگر "بے رنگ" والے شعر کو قطعے کے اگلے شعر کے ساتھ پڑھا جائے تو بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہ لفظ مصوری کی ایک فارسی اصطلاح کے طور استعمال ہوا ہے جو غالب کے زمانے میں تو مروج تھی ہی (مثلاً بہار عجم، 1894ء)، آج بھی ایرانی لغتوں میں اسی طرح مستعمل ہے (مثلاً ڈاکٹر معین کی فرہنگ فارسی، 2003ء):

فارسی بیں تا بدانی کاندر اقلیم خیال
مانی و ارژنگم و آں نسخہ ارژنگ من است

اوپر لکھے ہوئے شعر میں غالب نے اپنے فارسی کلام کو مانی کی تصاویر کے مجموعے ارژنگ سے مماثلت دی ہے، جسے روایت کے مطابق مانی آسمانی صحیفہ کہتا تھا۔ گویا ارژنگ جیسا صحیفہ ہوا۔ خیر غالب کے شعر پر بات پھر کبھی!)

اختر الایمان کی مختصر نظموں کے برعکس شہریار (اور منیر نیازی) کی مختصر نظمیں مجھے ان جدید مصوروں کی یاد دلاتی ہیں جو کسی ایک منظر کو مختصر کرنے کے لیے سوجتن کرتے ہیں۔ ایک مثال مشہور امریکی مصور بارنیٹ نیومن (Barnett Newman, 1905-1970) کی ایک پینٹنگ کی ہے جس کا عنوان ہے Voice of Fire۔ یہ ۸ فٹ چوڑی اور کوئی ۱۸ فٹ اونچی پینٹنگ صرف تین سیدھی لمبی پٹیوں پر مبنی ہے جن میں سے بیچ کی گہری سرخ ہے اور باقی دو نیلی۔ 1990ء میں پہلے جب کینیڈا کی نیشنل گیلری نے اس پینٹنگ کو کوئی دو کروڑ ڈالر میں خریدا تو عوام اور پارلیمنٹ میں بڑی لے دے ہوئی تھی۔ مگر آرٹ کے واقف کاروں نے اس پینٹنگ کی بہت تعریف کی، یہ کہہ کر کہ تین رنگین پٹیاں تو بچہ بھی بنا سکتا ہے مگر جب ایک بڑا آرٹسٹ یہی عمل کرے اور اس کا عنوان بھی مقرر کر دے تو اس کی ایمائیت میں شبہ نہیں کیا جانا چاہیے۔ کچھ شارحین نے کہا کہ "آگ کی آواز" کا اشارہ عبرانی اور عیسائی صحیفوں کے اس واقعے سے ماخوذ ہے جس میں رب کے حکم سے حضرت موسیٰ نے جب اپنا عصا بحر قلزم کی طرف بڑھایا تو سمندر کے پانیوں کے بیچ فصل ہو گئی اور ایک خشک راستہ بن گیا کہ بنی اسرائیل پار جا سکیں۔ جب فرعون اور اس کی فوجوں نے پیچھا کرنا چاہا تو رب نے "آگ اور بادل کے اونچے ستون" سے حضرت موسیٰ کو پھر حکم دیا کہ اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر پھیلائیں۔ فوراً سمندر کے پانیوں نے فرعون اور اس کی فوج کو غرق کر دیا۔ ان شارحین کا کہنا ہے کہ نیلی پٹیاں فصل کیے گئے پانیوں کی علامت ہیں اور سرخ پٹی فرعون اور اس کی فوج یعنی برائی کی موت کی۔ خدا جانے نیومن کا منشا کیا تھا مگر اس پر دانشور متفق ہیں کہ یہ پینٹنگ مذاق نہیں ہے، کسی بڑے منظر کا مختصر ترین عکس ہے۔ یہ پینٹنگ اب بھی کینیڈا کی نیشنل آرٹ گیلری میں ایک ممتاز مقام پر لگی ہوئی ہے اور اس کے سامنے ہمیشہ ایک چھوٹی موٹی بھیڑ لگی رہتی ہے۔

شہریار کی بظاہر سادہ مختصر نظموں کے پیچھے بھی بہت اکتساب رہا ہوگا۔ مثال کے طور پر ان کی نظم "میرا تو ارادہ تھا" دیکھیے:

میرا تو ارادہ تھا
وقت سیڑھیوں سے میں
آسمان تک جاؤں
تو نے اس جگہ مجھ کو

اتنی دیر تک رو کا

یہ بھی بھول بیٹھا میں

میرا کیا ارادہ تھا

اس وجود خاکی میں

جسم کچھ نیا دہ تھا

ظاہر ہے اتنی بڑی نظم ''چلتے پھرتے'' نہ لکھی گئی ہوگی۔ اس نظم میں جنسی اشارے خاص توجہ چاہتے ہیں۔ ویسے جنسی اشارے شہریار کی شاعری میں اکثر ملتے ہیں مگر اس لطف سے کہ عامیانہ نہیں ہو پاتے مثلاً نیچے لکھے ہوئے شعر کے سامنے کے مضمون کو اگر کوئی معمولی شاعر نظم کرتا تو عجب نہ تھا کہ اس شعر کا شمار فحش لٹریچر میں ہوتا۔

ہونٹوں سے آگے کا سفر بہتر ہے ملتوی کریں

وہ بھی ہے کچھ نڈھال سا میں بھی ہوں کچھ تھکا ہوا

اسی ضمن میں شہریار کی ایک اور اچھی مثال ہے:

مرے ہونٹوں نے

جسم پر تیرے بہت دیر تلک

حرف نا گفتنی تحریر کیا

شہریار کی دوستیاں تو ہمیشہ کی ہوتی مگر اختلاف کو بھول جاتے ہیں۔ 1975ء میں انہوں نے شعر و حکمت کے اداریے میں لکھا کہ ''پچھلے دس سال ہمارے ادب کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہم ادب کے فنی یا کھلے لفظوں میں ادب کے غیر مقصدی اور غیر افادی پہلو پر زور دیتے رہے ہیں۔ ہمارا یہ انداز نظر ایک غیر ادبی صورت حال کا ناگزیر ردعمل تھا' اور ردعمل کسی نہ کسی صورت میں انتہاپسندی کا شکار ہو جاتا ہے'' سردار جعفری سمجھے کہ ''غیر ادبی صورت حال'' کا اشارہ ترقی پسند تحریک کی طرف تھا۔ انہوں نے اپنے رسالے ''گفتگو'' میں شہریار اور ''ان کے قبیلے'' کے شاعروں اور ادیبوں کے خلاف بہت سخت الفاظ میں ایک اداریہ لکھا۔ یہ بھی لکھا کہ ''میں ذاتی طور پر یہ محسوس کرتا ہوں کہ شہریار کے دل میں ایک اچھا شاعر خوابیدہ ہے۔ غیر مقصدیت اسے بیدار نہیں ہونے دیتی۔'' ان الفاظ کے بعد شہریار کے دل میں سردار جعفری کے خلاف ہمیشہ کے لیے کدورت بیٹھ جانی چاہیے تھی مگر شاید بہت لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو کہ شہریار اس گیان پیٹھ انعام کی جیوری میں تھے جس نے سردار جعفری کو یہ گراں قدر انعام دیا۔ نہ صرف یہ کہ شہریار اس جیوری کے ممبر تھے بلکہ یہ بھی کہ جعفری صاحب کا نام بھی انہوں نے ہی تجویز کیا تھا اس بنا پر کہ ان کے خیال میں ''سردار جعفری ہی اس وقت ایک ایسے ادیب اور شاعر تھے جن کو یہ ایوارڈ ملنا چاہیے تھا۔''

شہریار نظری اختلافات کو رشتوں میں حائل نہیں ہونے دیتے۔

جذبی کی وفات سے کچھ مہینے پہلے مجھے ان سے ملانے لے گئے۔ وہ شہریار کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ باتوں باتوں میں فخر الایمان کا ذکر آیا تو جذبی صاحب نے ان کی شاعری کا ذکر کچھ اہانت سے کیا۔ شہریار نے کہا ''جذبی صاحب آپ بہت متعصب آدمی ہیں۔'' پھر باتیں ایسے ہی ہوتی رہیں جیسے کوئی اختلاف ہوا ہی نہ ہو۔

میرے سامنے جذبی صاحب نے فرمائش کی: ''کنور صاحب' نئی غزل سنایئے۔'' شہریار نے غزل سنائی۔ ایک شعر تھا:

تو پھر بتاؤ سمندر صدا کو کیوں سنتے

ہماری پیاس کا رشتہ تھا جب سراب کے ساتھ

جذبی صاحب نے ٹوکا' پہلا مصرعہ یوں کہیے:

تو پھر بتاؤ سمندر ہماری کیوں سنتے

انہوں نے غور نہیں کیا کہ سمندر۔ صدا کا مرکب سمندر کی صدا کے لیے تھا۔ شہریار نے ان سنی کر دی۔

1983ء میں علی گڑھ یونیورسٹی نے شہریار کو لیکچرر سے ریڈر بنا دیا۔ اب تک ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی بالترتیب ہمایوں فریدوں اور صبا پیدا ہو چکے تھے۔ نجمہ شہریار گرلز کالج میں انگریزی کی لیکچرر ہو گئی تھیں۔ شہریار دودھ پور کا کیمپ یونیورسٹی کے مکان میں آرام سے رہ رہا تھا۔ بظاہر ازدواجی زندگی ٹھیک ٹھاک چل رہی تھی مگر دراڑیں پڑنے لگے تھے' جن کی ایک وجہ تو شہریار کی شراب اور تاش کی لت تھی اور دوسری نجمہ شہریار کا تیکھا اور ذرا سخت مزاج بھی تھا۔ مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے 1980ء میں لکھے ہوئے شہریار کے خاکے میں دلّی کی ایک شام کا ذکر کیا جب انہوں نے اور شہریار نے ایک شام ایک مخنیہ کا گانا سننے میں گزاری۔ چلتے وقت شہریار نے مجتبیٰ حسین سے درخواست کی اس شام کا ذکر نجمہ سے نہ کریں۔ مجتبیٰ حسین نے اپنے مخصوص انداز میں لکھا کہ میں اب بھی اپنے وعدے پر قائم ہوں اور آئندہ بھی قائم رہوں گا! شاید شہریار کو اس بات کا احساس تھا کہ ان کی بیوی ان پر بہت بھروسا نہیں کرتیں۔ 1990ء کے قریب حبیب الرحمٰن جب امریکہ سے علی گڑھ گئے تو ایک شام شہریار کے گھر بھی گئے تو نجمہ نے بتایا کہ وہ دو روز سے گھر نہیں آئے کہ کلب میں تاش کھیل رہے تھے۔

1985ء میں شہریار کا چوتھا شعری مجموعہ ''خواب کا در بند ہے'' آل احمد سرور کے مختصر تبصرے کے ساتھ شائع ہوا۔ سرور صاحب نے لکھا کہ ''شہریار رہ رو ترقی کی راہ پر گامزن ہیں اور اردو شاعری کو ان سے ابھی بہت کچھ توقعات ہیں۔ خدا کرے کہ وہ فکر اور تکان سے محفوظ رہیں۔'' اس مجموعے پر انہیں 1987ء میں ساہتیہ اکادمی نے اپنے معتبر انعام سے نوازا۔ اس کتاب کا انتساب وجے کمار بجاج اور ''پہلے عشق'' کے نام تھا۔ گمان غالب ہے کہ پہلا

عشق "ان آنکھوں کی مستی" کی غزل والی ملکہ جہاں حسن و عشق بھی ہو سکتی ہے۔ ویسے کتاب کا کاپی رائٹ نجمہ کے نام تھا اور کتاب کے آخر میں شاعر نے اپنی بیوی کا شکریہ ان الفاظ میں ادا کیا: "اپنی بیوی نجمہ شہریار کا (شکریہ) جو اس مجموعے میں شامل اکثر چیزوں کی پہلی سامع ہیں۔" ساجدہ اکادمی کی دعوت پر میں نے اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کینیڈین شاعرہ ولیزلی ڈوین کے ساتھ کیا۔ ترجمے کی یہ کتاب 1990ء میں چھپی، جس کے ایک آدھ سال بعد میں پہلی دفعہ شہریار سے ممبئی میں اختر الایمان کے گھر ملا۔ مجھے یاد ہے اس روز شہریار نے ذرا زیادہ ہی پی لی تھی۔ جب ان کے جانے کا وقت آیا تو اختر الایمان نے مجھ سے کہا کہ میں شہریار کو ٹیکسی میں بٹھا دوں۔ اس دن ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دوست بنا لیا اور یہ رشتہ اب بھی قائم ہے۔ بالمشافہ ملاقات تو کبھی کبھی ہوتی ہے مگر فون پر گپیں اور بحثیں اکثر ہو جاتی ہیں۔

1987ء میں یونیورسٹی نے انھیں پروفیسر کا عہدہ دیا۔ یہ بات ذرا حیرت انگیز ہے اس لیے کہ عام طور علی گڑھ جیسی اہم یونیورسٹیوں میں لٹریچر کے استادوں کو پوری پروفیسری تنقید کی دو چار کتابیں لکھنے کے بعد ہی ملتی ہے۔ شہریار کہتے ہیں وہ صرف اپنی شاعری کی وجہ سے پروفیسر بنے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنی دوسری ادبی خدمات کے تجزیے میں بخل سے کام لے رہے ہیں۔ انہوں نے ادبی مضامین بھی لکھے ہیں، ترجمے بھی کیے ہیں، کتابیں بھی مرتب کی ہیں اور اپنی تمام ادبی زندگی میں ادبی رسالوں کی ادارت بھی کی ہے۔ مدت ہوئی مغنی تبسم کے ساتھ انہوں نے شعر و حکمت کے نام سے ایک رسالہ شروع کیا تھا۔ یہ رسالہ جو اب بھی نکل رہا ہے، اردو ادب میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔

بی اے مکمل کرنے کے بعد ہماری بیٹی ثناثا ایک سال کے لیے علی گڑھ پڑھنے گئی۔ کسی وجہ سے اس کے داخلے کے کاغذات وقت پر داخل دفتر نہ ہو سکے۔ ثناثا کو داخلہ دلانے میں جو تگ و دو شہریار نے کی، وہ صرف ایک مخلص دوست ہی کر سکتا ہے۔ نجمہ شہریار، ثناثا کی جماعت کو انگریزی پڑھاتی تھیں مگر طالب علموں میں اپنی کڑی مزاجی کی وجہ سے بہت مقبول نہ تھیں۔

1995ء تک شہریار کی ازدواجی زندگی کے دونوں رخ ایک ناقابل عبور خلیج بن گئے۔ اس سال نجمہ نے خلع مانگا اور 27 سال کی عمر کی پریم کی داستان والی شادی ایک ناگوار خواب بن گئی۔ اب نجمہ شہریار پھر سے نجمہ محمود ہو گئی ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ شادی بھی نجمہ کی پیش قدمی سے ہوئی تھی اور علیحدگی بھی ان کے ایما پر۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی وفات اور نجمہ سے طلاق غالباً شہریار کی زندگی کے سب سے بڑے سانحے تھے۔ ایک نظم "مغنی تبسم کے نام" میں انہوں نے اپنے المیوں کا ذکر کیا ہے:

اے عزیز از جان مغنی
تیری پرچھائیں ہوں لیکن کتنا تنہا ہوں میں
اعظمی کا مرنا، نجمہ کا بچھڑنا
تیرے بل ہوتے پہ سب کچھ سہہ گیا

اب بھی کسی جلسے میں نجمہ کا ذکر نکل آئے تو شہریار کی آنکھیں چھلکنے لگتی ہیں۔

شہریار مشاعروں میں پڑھتے ہیں مگر ایسی بے دلی سے کہ لگتا ہے کہ بیگار ٹال رہے ہوں اور اکثر شعر بھی ایسے پڑھتے ہیں جو سامع پر فوراً منکشف نہیں ہوتے۔ اس کے باوجود مشاعروں میں ان کی بڑی مانگ ہے۔ میرا خیال ہے کہ مشاعروں میں شہریار کی مقبولیت کی بنیادی وجہ ادب میں ان کا رتبہ ہے جو اردو ادبی حلقوں کے باہر بھی پہچانا جاتا ہے۔ ان کے سب شعری مجموعے دیوناگری لپی میں، بغیر مشکل الفاظ کی تشریح کے، اردو مجموعوں سے بہت زیادہ تعداد میں چھپ چکے ہیں۔

شہریار کی مقبولیت میں تھوڑا بہت ہاتھ ان کے دو چار فلموں کے گانوں کا بھی ہے۔ ان کے مداح اور علی گڑھ کے سابق طالب علم مظفر علی نے ایک فلم "گمن" بنائی جس میں ان کی "اسم اعظم" کی دو غزلیں گانوں کے طور لی گئیں:

سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے
اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے

عجب سانحہ مجھ پر گزر گیا یارو
میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو

میں اس فلم کے بارے میں تو زیادہ نہیں جانتا مگر دوست بتاتے ہیں کہ ایک زمانے میں اس کے "گانے" خواص و عوام کو ازبر ہو گئے تھے۔ مظفر علی کی ایک اور فلم "امراؤ جان" میں سارے گانے شہریار کے تھے، جن کی مقبولیت کوئی دو دہائیوں کے بعد بھی کم نہیں ہوئی۔ فلم "انجمن" کے کچھ گانے بھی شہریار نے لکھے تھے، اس کا ایک دوگانا مجھے بہت پسند ہے، جس میں ایک دلکش آواز شبانہ اعظمی کی ہے، جو کسی ایسی الھڑ لڑکی کی لگتی ہے جو سریلی تو بے حد ہو مگر جس کی آواز ریاض سے پختہ نہ ہوئی ہو۔

گلاب جسم کا یونہی نہیں کھلا ہو گا
ہوا نے پہلے تجھے، پھر مجھے چھوا ہو گا

شبانہ کی سحر انگیز آواز اس شعر کے معنی کو مجسم کر دیتی ہے:

شریر شوخ کرن مجھ کو چوم لیتی ہے
ضرور اس میں اشارہ ترا چھپا ہو گا

اس فلم کا ایک اور خوب صورت گیت شبانہ نے گایا ہے:

تجھ سے ہوتی بھی تو کیا ہوتی شکایت مجھ کو

تیرے ملنے سے ملی درد کی راحت مجھ کو

سنا ہے کہ "انجمن" کبھی ریلیز نہیں ہوئی۔ میں حیران اس بات پر ہوں کہ یہ گانے مقبولِ عام کیوں نہ ہوئے اور اس بات پر بھی کہ شہریار نے انہیں اپنے شعری اثاثے میں شامل کیوں نہ کیا۔

1995ء میں شہریار کا پانچواں شعری مجموعہ "نیند کی کرچیں" کے نام سے چھپا۔ اس میں دیباچہ شمس الرحمٰن فاروقی کا ہے۔ میرے خیال میں شہریار کی شاعری کو پوری طرح سمجھنے کے لیے فاروقی صاحب کا یہ مضمون ضرور پڑھنا چاہیے اور دوسرا ان کا وہ مضمون بھی جو "سکوتِ سنگ اور صدائے درد" کے عنوان سے شعر و حکمت کے دورِ سوم کی پانچویں کتاب (جنوری 2003ء) کے گوشۂ شہریار میں ہے۔

"نیند کی کرچیں" وجے کار سجاد اور شہریار کے دوسرے بیٹے فریدوں شہریار کے نام معنون ہے۔ کالی رات ہمایوں شہریار اور ناز شہریار کے نام ہے۔

یونیورسٹی سے 1996ء میں ریٹائر ہونے کے بعد شہریار کے کئی شعری مجموعے اردو اور دیوناگری لپی میں منظرِ عام پر آئے۔ ان کتابوں کی تفصیل نیچے درج ہے۔

میرے حصے کی زمین (دیوناگری میں کلیات) 1998ء امتیاز احمد کا دیباچہ، انتساب گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی اور مغنی تبسم کے نام۔

میرے حصے کی زمین، حصہ دوم (غزلوں کا کلیات) 1999ء ابوالکلام قاسمی کا دیباچہ، انتساب وجے کار سجاد کے نام۔

حاصلِ سیرِ جہاں (کلیات) 2001ء خود اپنا آدھے صفحے کا دیباچہ، انتساب وجے کار سجاد کے نام۔

دھند کی روشنی (انتخاب) 2003ء خود اپنا دو صفحے کا دیباچہ، انتساب کسی کے نام نہیں۔

شام ہونے والی ہے (اردو میں نیا مجموعہ) 2004ء خود اپنا ایک صفحے کا دیباچہ، انتساب وجے کار سجاد کے نام۔

شام ہونے والی ہے (دیوناگری میں نیا مجموعہ) 2005ء جناب حید تقوی کا دیباچہ، انتساب وجے کار سے سجاد کے نام۔

ملا رہوں گا خواب میں (دیوناگری میں غزلوں، نظموں کا انتخاب) مرتبہ کمار کا دیباچہ، انتساب کسی کے نام نہیں۔

میں وجے کار سجاد سے کبھی نہیں ملا مگر ملنے کی خواہش ضرور ہے کہ دیکھیں تو سہی کون "مستشرق ہے اس پردۂ زنگاری میں" کہ جس کے نام اتنی کتابیں منسوب ہوئی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ شہریار کی دیوناگری میں چھپی (اور بکی ہوئی) کتابوں کی تعداد ان کی اردو میں چھپی ہوئی کتابوں سے بہت زیادہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اچھے اردو ادب کا مستقبل ہندوستان میں ابھی بہت تاریک نہیں ہے۔

1972ء میں خلیل الرحمٰن اعظمی نے نجیب الرحمٰن اور وحید اختر کے تعاون سے "نئی نظم کا سفر" کے نام سے جدید نظم کا ایک بے لاگ انتخاب شائع کیا۔ اس میں شہریار کی یہ نظمیں شامل ہیں: نیا امرت، اپنی یاد میں، دائرہ، گندم سے ہوری پہلی نظم "اسمِ اعظم" سے ہے اور دوسری نظمیں "ساتواں در" سے۔

گوپی چند نارنگ کے انتخاب (1981ء) میں شہریار کی ان نظموں کے تراجم ہیں: ایک لمحے سے دوسرے لمحے تک (اسمِ اعظم)، قریب دور قریب (اسمِ اعظم)، اصل واقعہ (ساتواں در)، نیا عذاب نیا دن (اسمِ اعظم)، دھند کا (اسمِ اعظم) اور رات، دن اور پھر رات (ساتواں در)۔

شہریار کی نظموں کے ایک اچھے انتخاب کا قابلِ قدر انگریزی ترجمہ رخشندہ جلیل نے کیا ہے۔ کتابی شکل میں یہ انتخاب Through the Closed Doorway کے نام سے 2004ء میں چھپا۔

عزیز احمد اور آل احمد سرور کا ترتیب دیا ہوا انجمن ترقی اردو کا شاعری کا "انتخاب جدید" 1943ء میں علی گڑھ سے چھپا۔ اس انتخاب کا "حصہ دوم" وزیر آغا، انور سدید اور سجاد نقوی نے مرتب کیا، جو 1981ء میں کراچی سے چھپا۔ وزیر آغا نے اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ "1947ء کے بعد کے ابھرنے والے اردو شعرا میں سے صرف ان لوگوں کو شامل کیا ہے جو سرزمین پاکستان سے متعلق تھے۔" اس فیصلے کے پس پشت یہ مجبوری کارفرما تھی کہ "بھارت کے تمام اردو شعرا تک ہماری رسائی نہ ہو سکی۔" ظاہر ہے کہ شہریار کا کلام اس انتخاب میں نہیں ہے۔

شہریار آج کل علی گڑھ یونیورسٹی کے قریب ایک کئی منزلہ عمارت کے ایک چھوٹے سے مگر آرام دہ فلیٹ میں رہتے ہیں۔ روز شام کو سات بجے سے گیارہ ساڑھے بجے رات تک علی گڑھ شہر کے ایک کلب میں برج ضرور کھیلتے ہیں۔ شراب پینا چھوڑ دیا ہے کہ "اب اس میں لطف نہیں آتا۔" دوستوں سے رابطہ رکھنے کے لیے موبائل فون ہر وقت ساتھ رکھتے ہیں۔ فرصت کے باوجود شعر کہنے کی رفتار وہ نہیں ہے جو پہلے تھی۔ مشاعرے خوب پڑھتے ہیں۔ یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ اب نہ صرف بے دلی سے نہیں پڑھتے بلکہ مشاعروں کے شاعروں کی طرح تھوڑی بہت ڈرامہ بازی بھی کرنے لگے ہیں۔

شہریار نے "دھند کی روشنی" کے دیباچے میں پڑھنے والوں کو تنبیہ کی ہے کہ "چالیس سال سے زیادہ عرصے پر پھیلی ہوئی اس شاعری کو صرف آج کی شاعری سمجھ کر نہ پڑھیے، یہ شاعری بہت سے گزرے ہوئے پلوں سے اٹوٹ رشتہ بھی رکھتی ہے۔" معین احسن جذبی کی 1941ء میں لکھی ہوئی مشہورِ زمانہ چھ بندی نظم "موت" کا پہلا بند ہر اردو شعر سے دلچسپی رکھنے والے شخص کو یاد ہو

گا:

اپنی سوئی ہوئی دنیا کو جگا لوں تو چلوں
اپنے غم خانے میں اک دھوم مچا لوں تو چلوں
اور اک جام مئے تلخ چڑھا لوں تو چلوں
ابھی چلتا ہوں ذرا خود کو سنبھالوں تو چلوں

جذبی کی نظم سے اگر ایک آدھ بند نکال بھی دیا جائے تو نظم کے اثر میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ شہریار نے جذبی کے مضمون کو "سوت" کے عنوان ہی سے اس طرح نظم کیا ہے:

ابھی نہیں ابھی زنجیرِ خواب برہم ہے
ابھی نہیں ابھی دامن کے چاک کا غم ہے
ابھی نہیں ابھی دربازہے امیدوں کا
ابھی نہیں ابھی سینے کا داغ جلتا ہے
ابھی نہیں ابھی پلکوں پہ خوں مچلتا ہے
ابھی نہیں ابھی کم بخت دل دھڑکتا ہے

یہ خوب صورت نظم شہریار کے پہلے مجموعے "اسم اعظم" کی ہے گویا 1965ء سے پہلے کی لکھی ہوئی۔ انہوں نے اپنا چراغ جذبی کے چراغ سے روشن کیا مگر اس اہتمام کے ساتھ کہ اپنے چراغ کی لو کل کے چراغ کی لو سے اونچی رکھی۔ ادب سے دلچسپی رکھنے والے کم لوگ ہی اس بات سے اختلاف کریں گے کہ جذبی کی نظم کے برعکس شہریار کی مختصر نظم میں سے کوئی مصرع نظم کا اثر زائل کیے بغیر خارج نہیں کیا جا سکتا۔

شہریار کی شاعری میں نیند کے آنکھوں سے روٹھے رہنا کا استعارہ بار بار آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ خود کم چاہتے ہیں کہ زندگی کا لطف کھلی آنکھوں سے لے سکیں۔ خدا جانے ان استعاروں کی حقیقت کیا ہے مگر میں اتنا جانتا ہوں کہ ان کے فون جو آتے ہیں تو ہندوستان میں یا تو علی الصبح ہوتی یا گہری رات۔ وقت جو بھی ہو ان سے بات کر کے طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ ان کے شعر تو مدت سے میرے دمساز ہیں۔ ان کی غزلوں کے بہت سے شعر مجھے ازبر ہیں جن میں سے کچھ بغیر کسی ترتیب کے نیچے لکھتا ہوں۔

بچھڑے لوگوں سے ملاقات کبھی پھر ہوگی
دل میں امید تو کافی ہے یقیں کچھ کم ہے

زندگی جیسی توقع تھی نہیں کچھ کم ہے
ہر گھڑی ہوتا ہے احساس کہیں کچھ کم ہے

راتوں کو جاگنے کے سوا اور کیا کیا
آنکھیں اگر ملیں تھیں کوئی خواب دیکھتے

پہلے نہائی دوں میں پھر آنسوؤں میں رات
پھر چھو چھو اتری ہمارے گھروں میں رات

گزرے تھے حسین ابن علی رات ادھر سے
ہم میں سے مگر کوئی بھی نکلا نہیں گھر سے

نکلا تھا میں صدائے جرس کی تلاش میں
دھوکے سے اس سکوت کے صحرا میں آ گیا

مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو مری وحشت کا سبب
بوئے آوارہ سے پوچھو کہ بھٹکتی کیوں ہے

شکوہ کوئی دریا کی روانی سے نہیں ہے
رشتہ ہی مری پیاس کا پانی سے نہیں ہے

اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں سبھی آخر میں
حاصلِ سیر جہاں کچھ نہیں حیرانی ہے

شہریار کا 2001ء تک کا مکمل کلام علی گڑھ سے "حاصلِ سیر جہاں" کے نام سے چھپا تھا۔ یہ نام اوپر لکھے ہوئے شعر سے ماخوذ ہے۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ ان کا 2005ء تک کا مکمل کلام پاکستان کا معتبر ادارہ سنگِ میل پبلیکیشنز "سورج کو نکلتا دیکھوں" کے عنوان سے چھاپ رہا ہے۔ اس کتاب کے چھپنے سے ان پاکستانی احباب کی شکایت کچھ رفع ہو جائے گی جن کی رسائی ہندوستان کی اچھی اردو شاعری تک نہیں تھی۔ اس مجموعے کا نام شہریار نے اپنے اس شعر سے لیا ہے:

ایک ہی دھن ہے کہ اس رات کو ڈھلتا دیکھوں
اپنی ان آنکھوں سے سورج کو نکلتا دیکھوں

گزشتہ چالیس سالوں سے میں مغرب میں مقیم ہوں۔ اردو کی کتابیں تو خیر ملتی رہتی ہیں مگر "اردو" دوستوں سے ملاقات کے مواقع کبھی کبھی ملتے ہیں۔ دسمبر 2005ء اور جنوری 2006ء کے دوران مجھے دہلی میں رہنے کا موقع ملا۔ اس قیام کی سب سے خوشگوار یادیں شہریار سے تفصیلی ملاقاتوں کی ہیں۔ ان سے مل کر میرا خون بڑھتا ہے۔ خدا انہیں تا دیر سلامت و صحت مند رکھے اور ان کا قلم ایسے ہی رواں رہے۔

حاصلِ سیرِ جہاں

شمیم حنفی (دہلی بھارت)

اشعار کے پانچ چھوٹے چھوٹے مجموعوں کی اس ایک کتاب کا نام شہریار نے "حاصلِ سیرِ جہاں" رکھا ہے جو اپنے آپ میں یہ نام ایک بلیغ استعارہ، ایک شعری بیان بھی ہے۔ مطلب یہ کہ چاروں سمتوں میں چاہے جہاں تک ہو آؤ، لوٹ کر آخر میں اپنی ہی ہستی کے مرکز پر آنا ہوگا۔ بہ قول سورداس:

"جیسے اڑ جہاج کا پنچھی پھر جہاج میں آئے"

بہت دنوں پہلے سوامی رام کرشن پرم ہنس کی وچن مالا میں ایک کہانی پڑھی تھی جس کے واسطے سے سوامی جی نے اپنے شردھالوؤں کو یہ بتایا تھا کہ پورب پچھم اتر دکھن تمام دشاؤں میں بھٹکنے کے بعد بالآخر ہم اپنی ہی طرف واپس آتے ہیں۔

شہریار کے اشعار کی پہلی کتاب "اسمِ اعظم" ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ ان دنوں اس میلان کی توثیق ہونے لگی تھی، کچھ تو ترقی پسندی کے اجتماعی مزاج کے ردِعمل کی شکل میں اور کچھ ایک گہرے، اندرونی اور اداس احساسِ شکست کے نتیجے میں۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد کا مجموعی ماحول، انسان کی Irrationality (عدمِ تعقل) اور ازلی و ابدی تنہائی کا احساس ترقی یافتہ یورپ سے کہیں زیادہ ہندوستان تک ایک روایت کی تلاش میں تھا۔ اس وقت کی صورتِ حال کا کچھ اندازہ ۱۹۶۵ء کے آس پاس رونما ہونے والی تخلیقی سرگرمیوں اور نئی حسیت کو فکری اساس مہیا کرنے والی بعض کتابوں کے عنوان سے لگایا جا سکتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ خلیل الرحمن اعظمی کا دوسرا شعری مجموعہ "نیا عہد نامہ" چھپا تو راہی معصوم رضا نے ایک مضمون میں اس بات کا بہت مذاق اڑایا کہ نئے شاعر پر اب نئے عہد نامے وارد ہوتے ہیں اور اسے ایک نئے "اسمِ اعظم" کی تلاش ہے لیکن نئی حسیت سے اختلاف اور ایک نیا شعری محاورہ وضع کرنے والے شاعروں کی صلاحیت سے انکار کے باوجود منظر نامہ بہرحال تبدیل ہو رہا تھا۔ ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ ہمارے نئے شعرا کا مکالمہ مغرب سے بھی جاری تھا۔ جیوویز کی باتیں کم ہوتی تھیں۔ نیا شعر اور نیا فکشن پڑھنے اور اسے اپنے احساسات میں جذب کرنے کا میلان زیادہ تھا۔ ہندوستان میں رسالہ "شب خون" کی اشاعت بھی انہی دنوں شروع ہوئی۔ گنس برگ نے ہندوستان کا سفر کیا۔ گرگری کورسو، جارج میکلیور، فرلنگ ہیٹی کی کتابیں ہمارے یہاں بھی چھپنے لگیں۔ گنس برگ کی طویل نظم "Howl" کے بعد اردو اور دوسری ہندوستانی زبانوں میں بھی طویل نظم کے چلن نے زور پکڑا۔ ملے رائے چودھری کی نظم "زخم" اور عمیق حنفی کی "سند باد" کو ایک نئے ادبی منشور کے طور پر بھی دیکھا گیا۔ خلیل الرحمن اعظمی، وحید اختر، باقر مہدی، عمیق حنفی، شمس الرحمن فاروقی، بلراج کومل کے مضامین "شب خون" (الٰہ آباد)، "صبا" (حیدرآباد)، "کتاب" (لکھنو) اور "آئینہ" (بمبئی) کے مباحث اور مذاکروں میں سجاد ظہیر، سردار جعفری، سید احتشام حسین سے لے کر نئے لکھنے والوں تک ایک ہی سرگرمی کے ساتھ شریک ہوتے تھے جو بیسویں صدی کی ساتویں دہائی کے مزاج اور ماحول کا صاف پتا دیتا ہے۔ نسیم ایزیکیل بمبئی سے Poetry India نکالتے تھے جس میں شمال اور جنوب کی مختلف زبانوں کے ساتھ اردو کے نئے شاعروں کا کلام بھی برابر چھپتا تھا اور اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا تھا کہ تمام زبانوں کے نئے شعرا کے ساتھ اردو کا نیا شاعر بھی ایک نئی سطح پر اپنے آپ سے اور اپنے زمانے سے ہم کلام ہے۔ یاد کیجیے کہ بنگال میں اس دہائی کو The Burning Seventies کا نام دیا گیا تھا اور بھوکی پیڑھی کے شاعر جن میں بعضوں نے آگے چل کر بہت نام کمایا، ان کے علاوہ دگمبر کویوں کی ایک پرجوش نسل اسی پس منظر سے نمودار ہوئی۔ کہ قیامت کی تخلیقی چہل پہل تھی اور اختلافِ افکار کے اظہار میں نئے پرانے سب دیانت دار دکھائی دیتے تھے۔ احتشام حسین نے انہی دنوں لکھا کہ ادیب جب اصولوں کے لیے نہیں لڑتے تو گروہی اور منصب کی دوڑ شروع ہو جاتی ہے۔

شہریار کے تذکرے میں یہ باتیں اس لیے یاد آگئیں کہ اس دور کے غالب شعری اسلوب اور عام و مقبول آہنگ سے الگ شہریار نے اپنی ایک الگ دنیا بسائی تھی۔ ان کی شاعری اور شخصیت دونوں غیر متنازعہ بنے اپنی نرم آواز اور دھیمے پن کی وجہ سے۔ بہت سے پرجوش لکھنے والے جلد ہی تھک گئے۔ بہ قول محمود ایاز ریس میں تھکے ہوئے گھوڑوں کی ایک پوری صف بھی شامل تھی۔ چنانچہ دس پانچ چھلکانے والی نظموں کے بعد ان کا دامن خالی دکھائی دیا۔ اب ان کا خیال آتا ہے تو ان کی پرانی کمائی کے باعث۔ نئے ستاروں کے ابھرنے اور ڈوبنے کا یہ منظر ایک طرف، دوسری طرف نئی کے لکھنے والے ایسے بھی تھے جن کی دنیا بہت پرسوز بھری پری اور پھیلی ہوئی نہ سہی مگر ان میں اپنے کو سنبھالے رکھنے کی صلاحیت غیر معمولی تھی۔ ایسے لکھنے والوں میں شہریار کئی وجہوں سے منفرد اور ممتاز کہے جا سکتے ہیں۔

شہریار کی شاعری نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہ اپنی نفسیاتی کرواہٹ، اپنی معاشرتی ابتری اور آدرشوں کی شکست کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ صورتِ حال شہریار کے ہم عصروں میں بالعموم دیکھی جا سکتی

ہے۔ شہریار کی شاعری کا آہنگ بھی سریلا اور ذائقہ میٹھا تو نہیں ہے لیکن ضبط کی ایک اندرونی کیفیت نے انہیں گویا بنا دیا ہے۔ شہریار اپنے شخصی اور اجتماعی آشوب کا تذکرہ بھی بیشتر سنبھل کر کرتے ہیں۔ اپنی آواز دھیمی رکھتے ہیں، لہجہ متوازن۔ اسی لیے اپنی غم آلودگی اور سوز کے باوجود ان کی شاعری میں دنیا سے بیزاری اور اپنے آپ سے دوری کا رنگ نہیں ابھرتا۔ ''اسم اعظم'' کی ایک نظم ہے ''موت'':

ابھی نہیں، ابھی زنجیر خواب برہم ہے
ابھی نہیں، ابھی دامن کے چاک کا غم ہے
ابھی نہیں، ابھی در باز ہے امیدوں کا
ابھی نہیں، ابھی سینے کا داغ جلتا ہے
ابھی نہیں، ابھی پلکوں پہ خوں مچلتا ہے
ابھی نہیں، ابھی کمبخت دل دھڑکتا ہے

ایک بے ڈھنگے، بدہیئت، معاشرتی ماحول کے ادراک سے جنم لینے والی یہ خوب صورت نظم اس عہد کے گھٹن زدہ رویوں سے حیران کن حد تک آزاد ہے۔ شہریار کی غزلوں میں طرز احساس کے تیکھے پن کے باوجود خاصا رچا ہوا کلاسیکی شعور ملتا ہے اور غزل کی روایت کے استحکام اور جبر کے پیش نظر یہ بات انہونی نہیں کہی جا سکتی لیکن شہریار کی نظموں میں جو تہذیب ذات اور تناسب کا انداز موجود ہے اسے معمولی نہیں کہا جا سکتا۔ ایک دبا دبا سا انسانی سوز، دردمندی کی ایک مستقل کیفیت، وضع احتیاط کی ایک خودکار کوشش، شہریار کی شاعری کو اپنے ماحول سے شرابور رکھتے ہوئے بھی اسے ایک آزاد، قائم بالذات اور ہر زمانے کے لیے معنی خیز منظر کی شکل دیتی ہے۔ شہریار کا سب سے بڑا کمال ان کی لسانی کفایت شعاری اور جذباتی خود مختاری میں مضمر ہے۔ وہ اپنی آواز کو اپنے تجربے کو اپنے شدید ترین ردعمل کو اور ان سب کا احاطہ کرنے والے بے حد شفاف اور شخصی اسلوب کو پل بھر کے لیے بھی بے حجاب نہیں ہونے دیتے۔ خواب اور حقیقت کی ایک ازلی اور ابدی Dialectics ایک گہرے باطنی تصادم اور پیکار کی حصاربندی میں اپنی حیات کی تمام تر شمولیت کے ساتھ بھی شہریار اپنے تجربے کا وقار قائم رکھتے ہیں۔ اسے کبھی بے قابو نہیں ہونے دیتے۔ ایک سوچی سمجھی سطح سے اوپر نہیں جانے دیتے۔ جذبے کا اسراف اور لفظوں کا اسراف جو شہریار کے بیشتر معاصرین کے ساتھ پرچھائیں کی طرح لگا ہوا ہے شہریار کی شاعری میں اس کی گنجائش کبھی نہیں نکلتی۔ ان کی نظموں میں کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری سے تجربوں کا بیان ہے، بیان کا تجربہ نہیں ہے۔ جہاں تہاں سے کچھ مثالیں دیکھتے ہیں:

وہ جو آسماں پہ ستارہ ہے
اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لو
اسے اپنے ہونٹوں سے چوم لو
اسے اپنے ہاتھوں سے توڑ لو
کہ اسی پہ حملہ ہے رات کا

.... تنبیہ (ساتواں در)

پھول پتیاں شاخیں
ہونٹ، ہاتھ اور آنکھیں
موج خوں، صدائے دل
ماہتاب اور سورج
تجھ میں سب کے سب
وقت کی کماں میں اب
تیر ہی نہیں کوئی

...... مکمل لاتحفظ (ساتواں در)

یہ بستر تنہائی
جی میں ہے لپیٹوں میں
اے رات، وجود اپنا
بکھرا دے تو سینوں میں
اس آدھے بدن والی
پرچھائیں کو دکھلا دے
میں آگ میں جلتا ہوں
تو اوس میں نہلا دے

...... اشارات (خواب کا در بند ہے)

زرد پتے نحیف شاخوں پر
رات کے آخری کنارے سے
آنے والی مہیب آندھی کا
دیکھ لو انتظار کرتے ہیں
لوگ سب اس عجیب منظر کو
بے ضرر کیوں شمار کرتے ہیں

.... رات کے آخری کنارے سے (نیند کی کرچیں)

آخر میں دو اور چھوٹی چھوٹی نظمیں جن کا جمالیاتی ذائقہ اب تک پڑھی جانے والی مثالوں سے بہت الگ ہے۔ ان میں کسی طرح کی رومانی فسردگی کے بجائے خطر اور دہشت کا عنصر حاوی ہے۔ گزشتہ نظمیں آپ رکوں

سے بنی ہوئی اور مبہم تصویروں سے عبارت ہیں۔ اس کے برعکس اب جو نظمیں آپ سنیں گے ان کی سطح پُرسکون ہوتے ہوئے بھی اندر ہی اندر ایک دبا عذاب اور وحشت کا احساس ہوتا ہے۔ شہریار نے پہلی نظم میں طنز کا زاویہ اختیار کرنے کے باوجود اپنے لہجے میں کسی طرح کی تلخی یا شکایت پیدا نہیں ہونے دی۔ ملاحظہ ہو:

انھیں زندہ رہنے کی تھی ہوس
جو دکھائی دیتے تھے ہم نفس
کبھی روشنی کے حصار میں
کبھی جگنوؤں کی قطار میں

.....ہندوستانی دانشوروں کے نام (نیند کی کرچیں)

دوسری نظم اس طرح ہے:

شب کی ساری صراحیاں خالی
ہو چکیں جب، تو صبح کا سورج
میرے ہونٹوں کے پاس آیا، کہا
"رات کو قطرہ قطرہ پینے سے
پیاس بجھتی نہیں ہے بڑھتی ہے
ثبت کر ہونٹ میرے ہونٹوں پر
اور اس پیاس سے رہائی پا"

......پیاس سے رہائی (نیند کی کرچیں)

ان نظموں کی تشریح کر کے میں اس لطف کو غارت نہیں کرنا چاہتا جس کا مجھے احساس ان نظموں کو پڑھتے وقت ہوا تھا۔ شہریار اپنے تجربے کو پھیلانے سے زیادہ اسے سمیٹنے پر دھیان دیتے ہیں۔ جذبے کی شدت پیدا ہونے لگتی ہے تو چپ چاپ ایک علاقۂ سکوت (Silence Zone) میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے ان نظموں میں جتنا کچھ کہا گیا ہے اس سے کہیں زیادہ چھپایا گیا ہے۔ اسلوبِ عشق کی طرح شاعری کے اسلوب کا پاس رکھنا ہر کس و ناکس کے حصے میں نہیں آتا۔ یوں بھی شہریار کی شاعری کا بہت بڑا حصہ ان کی جذباتی، ذہنی، اعصابی واردات کے بیان کے بجائے اس کے اخفا کی ایک مسلسل کوشش کا نتیجہ ہے۔ بقول ناصر کاظمی:

"تا آخر یہ کے دل پر جو بھی گزر رہا ہوتا اگر تجربہ نہیں بنتا تو شخص چیخ پکارتا ہے"

شہریار کی شاعری رقت خیزی، خود رحمی، خود ترحمی (self glorification)، تشدد اور مبالغے کے عناصر سے یکسر پاک ہے۔ یہ معاشرے کا تنہا آدمی جو ساتویں دہائی میں بڑی ہائے واویلا کے ساتھ نمودار ہوا اور اپنی تنہائی، بے حصولی، احساسِ شکست اور ابتری کے احساس سے بوجھل بہت جلد مشکل خیز بن گیا تو اسی لیے اس کے پاس کہنے کے لیے باتیں کم تھیں اور سوچنے کی اسے عادت نہیں تھی۔ صرف جذبے کا تند و تیز لاوا کہاں تک جا سکتا تھا۔ شہریار اپنے تجربے کی آنچ اور تجربے کے بھلا اظہار کی اذیت سے پڑھنے والوں کو بالعموم بچائے رکھتے ہیں۔ بے شک، اس سودے میں "اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں"۔ یہی وجہ ہے کہ شہریار کے یہاں جذبہ ایک داخلی تنظیم کے باعث ایک طرح کی جاں گداز سوچ میں، ایک احساس میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ان کی نظموں میں کبھی ہم اس جذبے کی شبیہ Still Life کے طور پر دیکھتے ہیں، کبھی تجربے کی ایک حرکی (Kinetic) اور اندر ہی اندر کھلتی ہوئی، کھد بدتی ہوئی حقیقت کے طور پر۔

یہی خوبصورتی شہریار کی غزلوں میں بھی نمایاں ہے۔ اپنے تخلیقی ضبط کی وجہ سے یہ غزلیں نئی حسیت کے شور شرابے اور نئی غزل کی بھیڑ بھاڑ میں الگ سی پہچانی جاتی ہیں۔ ان میں ایک زمانے کے عام چلن کے مطابق نہ تو میر صاحب کے تتبع کی کوشش کی گئی ہے نہ کلاسیکی اساتذہ میں کسی اور کا رنگ جھلکتا ہے۔ ایک چھوٹا سا شب چراغ ہے، اپنی آگہی اور اپنے احساس کا جس کی روشنی میں شہریار ادھر سے ادھر چلتے ہوئے جلتے بجھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ تفصیل میں جانے سے بہتر یہ ہوگا کہ یہاں ایک نمائندہ غزل کے کچھ شعر نقل کر کے بات ختم کر دی جائے۔ تو یہ شعر سنیے:

زندگی جیسی توقع تھی نہیں، کچھ کم ہے
ہر گھڑی ہوتا ہے احساس کہیں کچھ کم ہے
گھر کی تعمیر تصور ہی میں ہو سکتی ہے
اپنے نقشے کے مطابق یہ زمیں کچھ کم ہے
بچھڑے لوگوں سے ملاقات کبھی پھر ہوگی
دل میں امید تو کافی ہے یقیں کچھ کم ہے
اب جدھر دیکھیے لگتا ہے کہ اس دنیا میں
کہیں کچھ چیز زیادہ ہے کہیں کچھ کم ہے
آج بھی ہے تری دوری ہی اداسی کا سبب
یہ الگ بات کہ پہلی سی نہیں، کچھ کم ہے

شہریار اس طرح کی نظمیں غزلیں کہنے میں اپنے زیادہ تر ہم عصروں کے برعکس ابھی بہت سرگرم ہیں۔ پھر کلیات کے نام سے اس کتاب کی اشاعت قبل از وقت ہی کہی جانی چاہیے۔ لہٰذا مجھے تو "حاصلِ سیرِ جہاں" کو اس حیثیت سے قبول کرنا منظور نہیں ہے۔

برہنہ تیرگی

جناب شہریار کے نظمیہ کلام سے مختصر انتخاب
فیصل عظیم (کناڈا)

واپسی

یہاں کیا ہے برہنہ تیرگی ہے
خلا ہے' آہٹیں ہیں' تشنگی ہے
یہاں جس کے لیے آئے تھے وہ شئے
کسی قیمت پہ بھی ملتی نہیں ہے
جو اپنے ساتھ ہم لائے تھے وہ بھی
یہیں کھو جائے گا گر کی نہ جلدی
چلو جلدی چلو اپنے مکاں کے
کواڑوں کی جبیں پر ثبت ہو گی
کوئی دستک ابھی بیتے دنوں کی

O

گیت کا جنم

میں جو ہوں آج کی شب کل نہ ہوں گا
میں کچھ ایسی نئی باتیں کہوں گا
میں شاید سب کو دیوانہ لگوں گا
صدا جو کھو گئی تھی میری' مجھ سے
ملے گی مدتوں کے بعد پھر سے

O

زیست کا حاصل اور حقیقت

اندھے دن کو گونگی رات سے کیا نسبت ہے
گھائل چاند کی گھبائی کرنوں کا سایہ
اس دھرتی کو کیوں بھاتا ہے
سورج کی سرشار شعاعیں
اس دھرتی کو کیوں ڈستی ہیں
ہر 'کل' کیوں اس 'آج' کے پیکر میں ڈھلتا ہے
اور انسان کو 'آج اور کل' سے کیا ملتا ہے
کیوں ہم فانی اور امر ہیں
پل' لمحے' دن' سال اور صدیاں
یہ سب باتیں بہکی سی ہیں
لیکن اپنی زیست کا حاصل اور حقیقت صرف یہی ہیں

O

التجا

کہاں ہو' کہاں ہو'
نئی صبح کی مہرباں نرم کرنو
مرا جسم مجھ سے بغاوت پہ آمادہ ہے
کانپتی ہے مری روح
آؤ بچاؤ
مجھے شب کے زنداں سے باہر نکالو
میں دن کے سمندر کی گہرائیاں ناپنا چاہتا ہوں!

دن کا عذاب

وہ ڈھلا دن' وہ اٹھا پردۂ شام
چشمِ امید چھلکنے لگی بھرنے لگے جام
آ بچیں سایوں سے' دلِ درد کے دامن سے ہوا محوِ کلام
نکہتِ زلفِ شب و روزِ گذشتہ کی صدا
راہِ تنہائی پہ آہستہ خرام

وہ بجھا داغ' وہ شعلہ ہوا سرد
وادیٔ خواب ہوا' ختم ہوئی شورشِ درد
ہر طرف نیند کی گرد

وہ چھٹی دُھند' وہ سورج کی شعاعوں کی پکار
تیر کی طرح سے چبھنے لگی اور سارا خمار
ایک پل میں ہوا یوں ختم کہ جیسے کوئی خواب
اور پھر دن کا عذاب

O

خوابوں کا بھکاری

اپنے معمول کے مطابق ہم
آج بھی روز کی طرح یوں ہی
دن کے ہمراہ بے خیالی میں
وادیٔ شام سے گذرتے ہوئے
رات کی سرحدوں کو چھو لیں گے
نیند کے در کو کھٹکھٹائیں گے
لاکھ روئیں گے گڑگڑائیں گے
کاسۂ چشم میں مگر اک خواب
آج کی رات بھی نہ پائیں گے

خطرے کا سائرن

تمام شہر آگ کی لپیٹ میں ہے بھاگیے
حضور کب سے میٹھی نیند سو رہے ہیں جاگیے
سماں ہے روزِ حشر کا' نگاہ تو اٹھایئے
لگی ہوئی ہے آنکھ پر جو دوربیں ہٹایئے

دراز ہی میں بند رہنے دیجئے تمام خواب
کھلی ہے جو کتاب میز پر نہ بند کیجئے
اتاریئے نہ کھونٹیوں سے خواہشوں کے پیرہن
بکھر گئے ہیں فرش پر ہوائے تند و تیز سے
ورق وہ تازہ روزنامے کے بھی مت سمیٹیے
گھڑی کی سوئیوں کی سمت دیکھنے سے فائدہ

لباسِ خواب کو بدلنے کا نہیں ہے وقت اب
تمام اہلِ شہر' شہر چھوڑ کر چلے گئے
جھکے ہوئے ہیں سرعظیم بلڈنگوں کے دیکھیے
اب اور کچھ نہ دیکھیے' اب اور کچھ نہ سوچیے
تمام شہر آگ کی لپیٹ میں ہے بھاگیے

O

عہد حاضر کی دل ربا مخلوق

زرد بلبوں کے بازوؤں میں اسیر
سخت' بے جان' لمبی کالی سڑک
اپنی بے نور دھندلی آنکھوں سے
پڑھ رہی ہے نوشتۂ تقدیر

بند کمروں کے گھپ اندھیروں میں
بلیاں پی رہی ہیں دودھ کے جام
ہوٹلوں سینما گھروں کے قریب
چمچماتی ہوئی نئی کاریں
اور پنواڑیوں کی دوکانیں
اور کچھ ٹولیاں فقیروں کی
'پرس' والوں کے انتظار میں ہیں

ادھ پھٹے پوسٹروں کے پیراہن
آہنی بلڈنگوں کے جسموں پر
کتنے دلکش دکھائی دیتے ہیں
بس کی بے حس نشستوں پر بیٹھی
دن کے بازار سے خریدی ہوئی
آرزوؤ' غم' امیدؤ محرومی
نیند کی گولیاں' گلاب کے پھول
کیلےٴ امرودؤ سنگترےٴ چاول
پینٹ' گڑیا' شیمز' چوہے دان
ایک اک شے کا کر رہی ہے حساب
عہد حاضر کی دل ربا مخلوق

O

دھند کی حکومت

وہ صلیب کا سایہ
اب نظر نہیں آتا
وہ نحیف سا نقطہ
اب ہوا میں لرزاں ہے
وہ ادھوری پرچھائیں
اپنے سے پشیماں ہے
وہ جھلکتا سناٹا
بے لباس و عریاں ہے
اب تو اس افق پر بھی
دھند کی حکومت ہے
اب تو بند لب کھولو
اب تو چیخ کر رو لو

O

ایک نظم

مائل بہ کرم ہیں راتیں
آنکھوں سے کہو اب مانگیں
خوابوں کے سوا جو چاہیں

O

خوابِ حسین کے وارثوں سے

میں مانتا ہوں
تم خوابِ حسین کے وارث ہو
میں جانتا ہوں
تم پیاس کی شدت میں بھی سراب کو دریا نہیں کہنے والے
تسلیم مجھے
جس رہ میں نشیب و فراز نہیں
وہ راہ جنوں کی راہ نہیں
یہ راز مگر بتلاؤ مجھے
تلوار کا سایہ سر کی بلندی کے درپے ہے
کوزۂ زیست میں قطرۂ آبِ امید نہیں ہے
پھر بھی شہادت کے اعزاز کے لائق تم میں کوئی نہیں ہے

O

ایک سیاسی نظم

مگر بے ذائقہ ہونٹوں سے
تم نے سخت چٹانوں کو چوما تھا
وہ ان کی کھردراہٹ نوک نکلی چھاتیاں
تیزابیت، نمکین کائی
سب کی لذت سے رہے ناآشنا بچے تمہارے
اسی باعث تو ان کے جسم میں خوں کی جگہ پانی کی گردش ہے
اسی باعث وہ اپنی نفرتوں کے خود ہدف ہیں
اور دشمن ان پہ ہنستے ہیں

O

پچھتاوا

چاند کے جسم کا آدھا سایہ
دشت کے دل کا بگولہ کوئی
یا وہی تیز ہوا کا جھونکا
کوئی تو رات کی دیوار گرانے آتا

میں نے بھٹکی ہوئی آوازوں کو
خودکشی کرنے سے روکا بے کار
سبز اشجار پہ سورج کی برہنہ کرنیں
آج پھر ناچیں گی، گائیں گی
اسی صورت سے
دن کی نفرت کا ہدف صرف مرا سایہ نہیں
میری آواز بھی ہے
میں نے بھٹکی ہوئی آوازوں کو
خودکشی کرنے سے روکا بے کار

O

فنا کی تصویر

(اپنے بڑے بھائی کے انتقال پر)

بے آواز بدن کا سایہ
ان شاخوں کے پیچھے ڈوبا
جن سے دھند جنم لیتی ہے
چاند بھی جن سے خوفزدہ سورج بھی شاکی
شاخیں بڑھتی پھیلتی شاخیں
آڑی ترچھی پتلی شاخیں
ریشم کے تاروں کی صورت اُلجھی شاخیں
ان شاخوں کے پیچھے دیکھو کیا انوکھا
روئی کے گالے آس پاس اور ان کے تعاقب
میں ننھی باہوں کے ہالے
اوس کی بوند کا بوجھ نہیں اُٹھتا آنکھوں سے
مت کھولو زنجیریں پاگل تیز ہوا کی
رُک جاؤ بن جانے دو تصویر فنا کی

O

زندہ رہنے کی شرط
ہر ایک شخص اپنے حصے کا عذاب خود سہے
کوئی نہ اس کا ساتھ دے
زمیں پہ زندہ رہنے کی یہ ایک پہلی شرط ہے

O

اعتراف

(ہندوستانی دانشوروں سے)

ہم بہت بُزدل ہیں
ہم اقرار کرتے ہیں
آسمانوں سے اُدھر لے جا کے ہم کو پھینک دو
نیچے بہت نیچے
مگر یہ التجا ہے
ہاتھ، آنکھیں، کان، لب
باقی رہیں یا ختم ہو جائیں
بس اک یہ ریڑھ کی ہڈی نہ ٹوٹے
رینگتے رہنے کی یہ عادت نہ چھوٹے

O

نجمہ[1] کے لئے ایک نظم

کیا سوچتی ہو
دیوارِ فراموشی سے اُدھر کیا دیکھتی
آئینۂ خواب میں آنے والے لمحوں کے منظر دیکھو
آنگن میں پرانے نیم کے پیڑ کے سائے میں
بچپن کے جہاز میں بیٹھی ہوئی ننھی چڑیا
کیوں اُڑتی نہیں
جنگل کی طرف جانے والی وہ ایک اکیلی پگڈنڈی
کیوں مُڑتی نہیں
ٹوٹی زنجیر صداؤں کی کیوں جُڑتی نہیں
اک سُرخ گلاب لگا لو اپنے جوڑے میں
اور پھر سوچو

1 میری بیوی نجمہ شہریار
2 میرا بیٹا ہمایوں شہریار

خلیل الرحمن اعظمی کی یاد میں

اب سفر کرچکو موقوف
ذرا دم لے لو
پاؤں کی گرد کی ہر تہہ سے
اجازت مانگو
ان ببولوں کے تلے بیٹھ کے
بس یہ سوچو
کس کی آواز تھی
کیوں اس نے بلایا تھا تمہیں
دشت تنہائی کی بھی آخری حد آپہنچی

(۲)

ہرے پیڑ کی ساری شاخیں
پت جھڑ کے آنے کا مژدہ دیتی ہیں
سارے پتے اک اک کر کے
زرد دنوں سے مل جائیں گے
آنکھوں میں جتنے آنسو ہیں
پلکوں سے باہر آجائیں
یہ منظر کتنا اچھا ہے
ہم نے صدیوں میں دیکھا ہے

(۳)

بہار کے دنوں کی یاد
دھوپ میں جھلس گئی
کہ زرد پھول دور دور کھل اٹھے
زمیں پہ اب کوئی جگہ نہیں بچی
کہاں پہ خواہشوں کے بیج بوؤں میں
مجھے تو بس اس ایک فیصلے کا اختیار ہے
ہنسو کہ اور روؤں میں

مژدۂ انقلاب

ہوا بن کے جو قید ہیں بوتلوں کے بدن میں
وہ سب دیو ہیں
خوف و نفرتوں کے
وہ سب دیو اک روز آزاد ہوں گے
وہ سب دیو جس روز آزاد ہوں گے
تو اس شہر کا ایک اک فرد خود سے پشیمان ہوگا
طلسم ہوس ٹوٹ جانے پہ حیران ہوگا
نگاہیں کبھی آسمانوں کی جانب اٹھیں گی
کبھی ہاتھ کوئی اشارہ کریں گے
کبھی ہونٹ کچھ بولنے کا ارادہ کریں گے
مگر کچھ نہ ہوگا
فقط جنگ ہوگی
ہر اک سمت سے بارش سنگ ہوگی

O

اتنی روشنی

نہ جانے کیا ہوا دیوار و در کو
میں کن آنکھوں سے دیکھوں اپنے گھر کو
کہیں بھی دھندلا رہی نہیں ہے
ہر اک کمرے میں اتنی روشنی ہے
کہ کچھ بھی دیکھنا ممکن نہیں ہے

O

سوگندھی
(منتخب کلام)

بدی بھری یہ بوریاں
نہ جانے کون موڑ تک
ہمارے ساتھ جائیں گی
سفید چادروں میں کس نے رات کو چھپالیا
ہماری بلیوں سے کس نے اپنے عضو عضو کو سجالیا
کہ آج ناف کے قریب خواہشوں کی بھیڑ ہے
ادھر وہ گنبدوں کی گونج
جنگلوں کو جانے والے راستے

پلٹ پڑے
تری گلی میں ہر طرف سے آرہے ہیں بھیڑیے
کواڑ کھول دیکھ کیسا جشن ہے
ہوا بھرا وہ چاند
سات ناچ نیچے آگیا
غذا ملے گی چونٹیوں کو تیرا کام ہوگیا
ہمارے ناخنوں کے میل سے
تیرے بدن کے گھاؤ بھر گئے
یہ حادثہ بھی ہوگیا
مگر کہاں سے بیچ میں یہ آسمان آگیا

o

زندہ رہنے کا یہ احساس

ریت مٹھی میں کبھی ٹھہری ہے
پیاس سے اس کو علاقہ کیا ہے
عمر کا کتنا بڑا حصہ گنوا بیٹھا میں
جانتے بوجھتے کردار ڈرامے کا بنا
اور اس رول کو سب کہتے ہیں
ہوشیاری سے نبھایا میں نے
ہنسنے کے جتنے مقام آئے ہنسا
بس مجھے رونے کی ساعت پہ خجل ہونا پڑا
جانے کیوں رونے کے ہر لمحے کو
ٹال دیتا ہوں کسی اگلی گھڑی پر
دل میں خوف و نفرت کو سجالیتا ہوں
مجھ کو یہ دنیا بھلی لگتی ہے
بھیڑ میں اجنبی لگنے میں مزا آتا ہے
آشنا چہروں کے بدلے ہوئے تیور مجھ کو
حال سے ماضی میں لے جاتے ہیں
کہنیاں زخمی ہیں اور گھٹنوں پر
کچھ خراشوں کے نشاں
سوندھی مٹی کی مہک کھینچے لیے جاتی ہے
تتلیاں، پھول، ہوا، چاندنی، کنکر پتھر
سب مرے ساتھ میں ہیں
سانس بے خوفی سے لیتا ہوں میں

o

سنکھ بجنے کی گھڑی

آنکھ مندر کے کلس پر رکھو
سنکھ بجنے کی گھڑی آتی ہے
دیوداسی کے قدم رک رک کر
آگے بڑھتے ہیں
زمیں کے نیچے
گائے کو سینگ بدلنے کی بڑی جلدی ہے
بوالہوس آنکھوں نے پھر جال بنا
رال ٹپکاتی زباں پھر ہوئی مصروف سفر
جسم کے کھردرے کچھ نرم علاقوں کا سفر
سادھنا بھنگ نہ ہو اب کے بھی
زور سے چیخ کے اشلوک
پجاری نے پڑھے
آنکھ مندر کے کلس پر رکھی

O

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی فریاد

مجاوروں کی بھیڑ نے
مجھے پھر ایک قبر میں بدل دیا
میں کہہ رہا ہوں دیر سے 'میں زندہ ہوں
مری صدا میں بازگشت کیوں نہیں
مرے خدا مجھے سزائیں جتنی دے
پہ یوں نہیں

O

مغنی تبسم کے نام

اے عزیز از جان مغنی
تیری پرچھائی ہوں لیکن کتنا اتراتا ہوں میں
اعظمی[1] کا مرنا' نجری[2] کا بچھڑنا
تیرے بل بوتے پہ یہ سب سہہ گیا
بھول کر بھی یہ خیال آیا نہیں مجھ کو
کہ تنہا رہ گیا
تیری الفت میں عجب جادو اثر ہے
تیری پرچھائیں رہوں جب تک جیوں
یہ چاہتا ہوں
اے خدا
چھوٹی سی کتنی بے ضرر یہ آرزو ہے
آرزو یہ میں نے کی ہے
اس بھروسے پر کہ تو ہے

1 خلیل الرحمن اعظمی
2 نجر شہریار

O

بدن کے آس پاس

لبوں پہ ریت ہاتھوں میں گلاب
اور کانوں میں کسی ندی کی کانپتی صدا
یہ ساری اجنبی فضا
مرے بدن کے آس پاس آج کون ہے

O

سفر کی ابتدا نئے سرے سے ہو

سفر کی ابتدا نئے سرے سے ہو
کہ آگے کے تمام موڑ وہ نہیں ہیں
چیونٹیوں نے ہاتھیوں کی سونڈ میں پناہ لی
تھکے تھکے سے لگ رہے ہو
دھند کے غلاف میں ادھر وہ چاند رنگ آسمان سے
تمہیں صدائیں دے رہا ہے سن رہے ہو
تمہاری یادداشت کا کوئی ورق نہیں بچا
تو کیا ہوا
گذشتہ روز و شب سے آج مختلف ہے
آنے والا کل کے انتظار کا
سجاؤ خواب آنکھ میں
جلاؤ پھر سے آفتاب آنکھ میں
سفر کی ابتدا نئے سرے سے ہو

O

لمبی چپ کا نتیجہ

مرے دل کی خوف حکایت میں
یہ بات کہیں پر درج کرو
مجھے اپنی صدا سننے کی سزا
ملی لمبی چپ کی صورت میں
مرے بولنے میں جو لکنت ہے
اس لمبی چپ کا نتیجہ ہے

O

عذاب کی لذت

پھر ریت بھرے دستانے پہنے بچوں کا
اک لمبا جلوس نکلتے دیکھنے والے ہو
آنکھوں کو کالی لمبی رات سے دھو ڈالو
تم خوش قسمت ہو ایسے عذاب کی لذت
پھر تم چکھو گے

O

سزا کی خواہش

میں نے تیرے جسم کے ہوتے
کیوں کچھ دیکھا
مجھ کو سزا اس کی دی جائے

O

صحرا کی حدوں میں داخل

صحرا کی حدوں میں داخل
جو لوگ نہیں ہو پائے
شہروں کی بہت سی یادیں
ہمراہ لئے آئے تھے

O

رینگنے والے لوگ

چلتے چلتے رینگنے والے یہ لوگ
رینگنے میں ان کے وہ دم خم نہیں
ایسا لگتا ہے کہ ان کو ذلتیں
مستحق مقدار سے کچھ کم ملیں

عجیب سانحہ مجھ پر گزر گیا

سرور الہدیٰ
(شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)

شہریار کی غزل جہاں نئی غزل کے خدوخال کا ایک اہم حوالہ ہے وہیں دوسری طرف کلاسیکی غزل سے بھی اس کا مضبوط رشتہ قائم ہے۔ مضمون اور معنی آفرینی نے شہریار کی غزل کو اثر آفرینی سے کبھی دور نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ شہریار باوجود نئی غزل کے نمائندہ شاعر ہونے کے اپنی ایک الگ شناخت رکھتے ہیں۔ شہریار کا پہلا شعری مجموعہ اسم اعظم (۱۹۶۵ء) میں آیا تھا۔ جدیدیت کے زمانے میں جو اہم شعری مجموعے شائع ہوئے اور جن سے جدیدیت کو فکری و فنی اساس ملی اس میں "اسم اعظم" کا نام بھی ہے۔ اس مجموعے کی غزلوں میں جو سبک آہنگی ہے وہ شہریار کی غزل کو ناصر کاظمی کی غزل سے قریب کرتی ہے۔ اسم اعظم کے مندرجہ ذیل اشعار بہت مقبول ہوئے اگرچہ ان میں معنی کی جہتیں نہیں مگر ان میں احساس کی سطح پر ایک نیا پن ضرور ہے:

تنہائی کی یہ کون سی منزل ہے رفیقو
تاحد نظر ایک بیابان سا کیوں ہے

لوگ سر پھوڑ کر بھی دیکھ چکے
غم کی دیوار ٹوٹتی ہی نہیں

یہ کیا جگہ ہے دوستو یہ کون سا دیار ہے
حد نگاہ تک جہاں غبار ہی غبار ہے

کوئی ہے جو ہمیں دو چار پل کو اپنا لے
زبان سوکھ گئی یہ صدا لگاتے ہوئے

عجیب سانحہ مجھ پر گزر گیا یارو
میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو

جب بھی ملتی ہے مجھے اجنبی لگتی کیوں ہے
زندگی روز نئے رنگ بدلتی کیوں ہے

یہ تمام اشعار مختلف ناقدین کی تحریروں میں مل جاتے ہیں آخر ایسا کیوں ہے کہ شہریار پر لکھتے ہوئے ناقدین کو یہی اشعار کیوں کر یاد آتے ہیں۔ اس کا جواب شاید یہ ہو سکتا ہے کہ یہ مضامین اس دور کی غزل میں حاوی رجحان کی شکل میں سامنے آئے۔ اور شہریار نے ان کی پیشکش میں اثر آفرینی کا خاص خیال رکھا۔ خواب اور شکست خواب نے شعرا کو کبھی قنوطی بنا دیا تھا تو کبھی باغی۔ شہریار کی غزل جس سطح پر بھی اپنے عہد کی حسیت کو پیش کرنے میں کامیاب ہوئی اس سے واضح ہے کہ شاعر اپنے تخلیقی عمل پر پہرے بٹھانے کا قائل نہیں۔ زندگی جب اور جس طرح اس کے سامنے آتی ہے اس کو وہ اسی شکل میں دیکھنا اور سمجھنا چاہتا ہے۔ جب شہریار نے کہا تھا:

سینے میں جلن آنکھ میں طوفان سا کیوں ہے
اس شہر کا ہر شخص پریشان سا کیوں ہے
تنہائی کی یہ کون سی منزل ہے رفیقو
تاحد نظر ایک بیابان سا کیوں ہے

تو گویا وہ اپنے عہد کی سماجی و عصری حسیت کا اظہار کر رہے تھے۔ اگرچہ مطلع کا شعر ایک مجموعی نوعیت کا ہے مگر یہ ہمارے عہد کی بہت بڑی حقیقت کو پیش کرتا ہے۔ ہم لاکھ اس سے انکار کریں کہ ہر شخص کے سینے میں نہ تو جلن ہو سکتی ہے اور نہ ہی آنکھ میں طوفان۔ شاعر نے یہ نہیں بتایا کہ سینے میں جلن اور آنکھ میں طوفان کی وجہ کیا ہے۔ لہٰذا ہر شخص کی پریشانی کے اسباب مختلف ہو سکتے ہیں۔ شاعر "سینے میں جلن آنکھ میں طوفان سا کیوں ہے" کو زندگی کے ایک حتمی رویے کے ساتھ وابستہ کر دیا ورنہ تو سینے کی جلن اور آنکھ کے طوفان کو کسی اعلیٰ مقصد کی حصولیابی کے تناظر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ شہریار کی اسم اعظم کی غزل میں نہ تو تراکیب کی کثرت ہے اور نہ استعارے کی۔ وہ نہایت سادگی سے اپنے جذبے کا اظہار کرتے ہیں مگر اس سادگی میں بھی شعر کی معنویت برقرار رہتی ہے:

لوگ سر پھوڑ کر بھی دیکھ چکے
غم کی دیوار ٹوٹتی ہی نہیں

اس شعر میں عصری سچائی تو ہو سکتی ہے مگر غم کی دیوار زندگی کے طویل سفر کی دشواریوں کا استعارہ بن جاتی ہے۔ اس لیے زندگی اور وقت کے اس سفر میں نہ جانے کیسی کیسی طاقتیں پیدا اور ریزہ ریزہ ہو گئیں۔ سر سے دیوار کو توڑنے کی خواہش اور کوشش دراصل اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ سر سے دیوار کو توڑنا غصہ اور جھنجھلاہٹ کا اظہار ہے۔ غم کی بہت سی صورتیں ہیں ان کے نشانات نئی غزل میں بکھرے پڑے ہیں۔ کہیں تو شعری غم کی مجموعی کیفیت کا بیان ہے جیسا کہ ہم اوپر کے شعر میں دیکھ چکے ہیں "غم کی دیوار ٹوٹتی ہی نہیں" جب انسان خود کو اجنبی محسوس کرنے لگتا ہے تو شدت سے اس کو کسی ہم خیال اور ہم نوا کی ضرورت محسوس ہوتی ہے شہریار کا یہ شعر اسی احساس اجنبیت کا

پیدا ہوتا ہے:

کوئی ہے جو ہمیں دو چار پل کو اپنالے
زبان سوکھ گئی یہ صدا لگاتے ہوئے

اس شعر میں ایک ایسی چاہت بھی موجود ہے جو کسی شخص کی بے وفائی اور بے اعتنائی کا ردِعمل ہو سکتی ہے لیکن اس شعر سے نئے معاشرے میں ایک انسان کی بے چارگی اور بے گانگی ظاہر ہوتی ہے بھرے شہر میں ایک شخص آواز لگاتے ہوئے تھک جاتا ہے وہ اس بات کا متقاضی نہیں ہے کہ کوئی اسے ہمیشہ کے لیے اپنالے بلکہ وہ دو چار پل کو اپنانے کی صدا بلند کرتا ہے "دو چار پل" کے فقرے سے نئی زندگی کی بے حسی اور مصروفیت کا نقشہ بھی سامنے آجاتا ہے نئی غزل میں اگر کوئی مضمون یا کوئی ترکیب پرانی غزل سے مستعار ہے تو بھی اس میں احساس کی فضا نئی ہوتی ہے مثلاً شہریار کے درج ذیل شعر میں دیارِ دل، بزمِ دوستاں زیرِ آسماں کی ترکیب دیکھیے:

دیارِ دل نہ رہا بزمِ دوستاں نہ رہی
اماں کی کوئی جگہ زیرِ آسماں نہ رہی

احساس کی نئی فضا "اماں کی کوئی جگہ" کے ٹکڑے سے پیدا ہوتی ہے فانی نے ذرا دوسرے انداز سے کہا ہے:

عتاب تھا کسی لمحے کا اک زمانے پر
کسی کو چین نہ باہر تھا اور نہ گھر میں تھا

شہریار کی ایک غزل جس کا مطلع اوپر پیش کیا گیا ہے وہ جذبات و احساسات کے ایسے تسلسل کا پتہ دیتی ہے جس کا تعلق زندگی کی محرومیوں سے ہے:

دیارِ دل نہ رہا بزمِ دوستاں نہ رہی
اماں کی کوئی جگہ زیرِ آسماں نہ رہی
رواں ہیں آج بھی رگ رگ میں خون کی موجیں
مگر وہ ایک خلش وہ متاعِ جاں نہ رہی
لٹے ہیں غموں کے اندھیروں میں کس کی خاطر ہم
کوئی کرن بھی تو اس دل میں ضوفشاں نہ رہی
میں اس کو دیکھ کے آنکھوں کا نور کھو بیٹھا
یہ زندگی مری آنکھوں سے کیوں نہاں نہ رہی

یہ غزل زندگی کے ایک بدلے ہوئے رویے کی طرف اشارہ کرتی ہے جیسے زندگی بغیر کسی مقصد کے آگے بڑھتی جا رہی ہے اور رنگ و نور کے داخل ہونے کی تمام راہیں مسدود ہوں۔ یوں تو یہ اشعار غزل کے روایتی محبوب کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ جب وقت بدلتا ہے اور حالات کروٹ لیتے ہیں تو اس کا اثر زندگی کے تمام معاملات پر ہوتا ہے شاعر جس خلش کو متاعِ جاں کہتا ہے یا جس منظر کو دیکھنے سے اپنی آنکھوں کی روشنی کے ختم ہو جانے کا شکوہ کرتا ہے وہ محض وہم و گمان نہیں:

میں اس کو دیکھ کے آنکھوں کا نور کھو بیٹھا
یہ زندگی مری آنکھوں سے کیوں نہاں نہ رہی

"اس کو" سے شاعر کی مراد کیا ہے؟ اس بارے میں قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس شعر میں نہ تو کوئی مشکل لفظ ہے اور نہ ہی کوئی ترکیب ہے مگر لفظ "اس کو" اور "زندگی" شعر میں معنی کے عمل کو محدود نہیں کرتے۔ زندگی محبوب کا استعارہ بھی ہے اور انسانی زندگی کے لیے سفر کی علامت بھی۔ آخر وہ کون سی شے تھی جس کو دیکھنے کی تاب نہ لانے کی وجہ سے شاعر آنکھوں کا نور کھو بیٹھا۔ اصل میں زندگی جتنا راز کھولتی ہے اس سے کہیں زیادہ وہ چھپا لیتی ہے۔ زندگی کی بعض حقیقتیں اس وقت سامنے آتی ہیں جب انسان بہت کچھ گنوا چکا ہوتا ہے شہریار کی بعض غزلوں میں ایک داخلی ربط نظر آتا ہے یہ داخلی ربط شہریار کی بہت بڑی طاقت ہے ہر شعر ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود ایک ہی فکری محور کا پتہ دیتا ہے۔ زندگی کے ٹھہراؤ، سراسیمگی اور انسان کے بے دست و پائی ان سب کو شہریار نے اس غزل میں بند کر دیا ہے:

ہوا کے لمحے کبھی سایوں سے لڑتے ہیں لوگ
بہت عظیم ہیں یارو بہت بڑے ہیں لوگ
اسی طرح سے کہیں جسم جل اٹھیں شاید
سلگتی ریت پہ یہ سوچ کر کھڑے ہیں لوگ
سنا ہے اگلے زمانے میں سنگ و آہن تھے
ہمارے عہد میں تو مٹی کے گھڑے ہیں لوگ
ہوا کا جھونکا بھی جس راہ پر نہیں آتا
نہ جانے کس لیے اس راہ میں کھڑے ہیں لوگ

اس غزل میں شاعر کی ذات عام لوگوں سے الگ نہیں ہے شہریار نے اس غزل میں معاشرے اور فرد کی جو تصویر پیش کی ہیں ان سے یہ ابہام بھی دور ہو جاتا ہے کہ نئی غزل ذات کے کھول میں بند ہے۔ آپ اس غزل کو عصری دستاویز کہیے مگر بے روح بیانیہ نہیں کہہ سکتے۔ غزل کا مطلع دیکھیے کہ اس میں انسان کی بے پناہ طاقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

ہوا کے لمحے کبھی سایوں سے لڑتے ہیں لوگ
بہت عظیم ہیں یارو بہت بڑے ہیں لوگ

لفظ "کبھی" ہمیں حال سے ماضی کی طرف لے جاتا ہے۔ ثانی مصرعہ میں 'بہت عظیم ہیں یارو بہت بڑے ہیں لوگ' سے ظاہر ہے کہ شاعر اپنے وقت کے لوگوں سے مخاطب ہے کہ دیکھو وہ لوگ کیسے تھے جنہوں نے ہواؤں اور سایوں سے مقابلہ کیا۔ مطلع کے بعد دوسرا اور تیسرا اور چوتھا شعر پڑھیے تو وہ مطلع

کے شعر کا لازمی نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ "اسم اعظم" کی بعض غزلیں مکمل طور پر میرے اس دعوے کی دلیل فراہم کرتی ہیں کہ وہ عصری زندگی کے خوبصورت اظہار کے ساتھ ساتھ داخلی طور پر مربوط بھی ہیں۔ مثلاً اسی غزل کو بھی دیکھیے:

یہ کیا جگہ ہے دوستو یہ کون سا دیار ہے
حد نگاہ تک جہاں غبار ہی غبار ہے
ہر ایک جسم روح کے عذاب سے نڈھال ہے
ہر ایک آنکھ شبنمی ہر ایک دل فگار ہے
ہمیں تو اپنے دل کی دھڑکنوں پہ بھی یقین نہیں
خوشا وہ لوگ جن کو دوسروں پہ اعتبار ہے
نہ جس کا نام ہے کوئی نہ جس کی شکل ہے کوئی
اک ایسی شے کا کیوں ہمیں ازل سے انتظار ہے

مطلع کا شعر "غبار ہی غبار ہے" کے ٹکڑے کی وجہ سے نئی معنویت اختیار کر لیتا ہے۔ "یہ کیا جگہ ہے دوستو یہ کون سا دیار ہے" سے شعر کا مضمون نیا نہیں ہو سکتا تھا لفظ "جہاں" نے بھی شعر کو سہارا دے رکھا ہے۔ جہاں کے ایک معنی مقام اور دوسرا معنی دنیا ہے۔ "جہاں" سے دنیا مراد لینے کے لیے حد نگاہ تک کے بعد کو ملانا پڑے گا۔ علامہ اقبال نے بھی لفظ جہاں کو خوب استعمال کیا ہے:

جو بھی جہاں تھا
وہم و گماں تھا

دوسرے شعر میں شاعر جسم پر روح کے عذاب کی بات کرتا ہے اور اس کے ثانی مصرعے میں آنکھ شبنمی کہتا ہے۔ لفظ شبنمی سے ایک ایسا منظر ابھرتا ہے جس میں دل فگار شخص کا ٹوٹا ہوا نڈھال وجود نمایاں ہو جاتا ہے۔ شہریار کے جن شعروں کی تشریح کی گئی ہے ان کے مضامین پرانے ہو سکتے ہیں مگر دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اس میں جدت پیدا کرنے کے لیے شاعر نے کن شعری وسائل کو اختیار کیا ہے۔ شہریار نئی غزل کے نمائندہ شاعر ہیں ان کے یہاں زندگی کی پہنائیوں کے ساتھ ساتھ وہ تمام باتیں نظر آتی ہیں جن سے ایک حساس شخص گزرتا ہے۔ زندگی صرف رونے کا نام نہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ رونے کو کوئی دوسرا نام دیا جائے۔ "اسم اعظم" کے دیباچہ میں وحید اختر نے لکھا ہے

"شہریار کے موضوعات وہی ہیں جو آج کے بیشتر شاعروں کے موضوعات ہیں:
"اپنی ذات' اس کی زخم شماری' خواب دیکھنے اور ان کی تعبیر ڈھونڈنے کا عمل' عشق اور اس جذبے کی مختلف و متنوع تصویریں' زندگی کی چھوٹی چھوٹی محرومیاں' خوشیاں' امید و بیم' اپنے لیے دوسرے انسانوں کے مسائل اور ان کا غم' انفرادی اور اجتماعی بہتر زندگی کی آرزو اور اس کو پانے کے لیے لڑنے کا حوصلہ' ایسی باتیں کسی بیمار اور شکست خوردہ ذہن کی پیداوار نہیں ہو سکتیں۔ یہ صحت مند زندگی اور صحت مند ذہن کے مسائل ہیں اور اسی لیے توجہ طلب ہیں" (صفحہ ۵۔۶)

وحید اختر نے زندگی کے دکھوں اور خوشیوں کو کل کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ سوال یہ ہے کہ شکست خوردگی کا احساس بھی زندگی کی ایک بڑی حقیقت ہے۔ شکست خوردگی کا تعلق صرف عصری زندگی سے ہی نہیں بلکہ اس کا رشتہ زندگی کی دائمی سچائیوں سے بھی ہے۔ شہریار کا یہ شعر دیکھیے:

یہ اضطراب ازل سے مرا مقدر ہے
میں کچھ کروں یہ مرا جی بہل نہیں سکتا

اضطراب کے بارے میں چاہے کچھ بھی کہا جائے مگر یہ کہنا کہ میرا جی بہل نہیں سکتا۔ زندگی سے ہار جانا ہی تو ہے۔ شکست خوردگی اوپر سے اوڑھی یا طاری کی ہوئی کیفیتیں نہیں ہو سکتیں۔ انسان ان کیفیات سے نکل بھی آتا ہے لیکن شاعری کو اس کے شکست آمیز اور مجروح احساسات کی روشنی میں دیکھا گیا لیکن اس کی مخصوص جمالیات اور اس کے اظہار و بیان کی خوبیوں سے چشم پوشی کی گئی۔

وحید اختر کے اس اقتباس کے تناظر میں شہریار کی یہ غزل دیکھیے جو "اسم اعظم" میں شامل ہے:

دل کو شہید رنج و الم ہو جانے دو
اس دھرتی کو اور بھی نم ہو جانے دو
لطف و کرم کی بارش بھی ہو جائے گی
ختم یہ موسم جور و ستم ہو جانے دو
چند دنوں تک اور یوں ہی خاموش رہو
سناٹوں کے شور کو کم ہو جانے دو
رہو تمنا کو انگڑائی لینے دو
روشن اک اک نقش قدم ہو جانے دو
اہل جہاں کو باتوں میں الجھائے رہو
اہل جنوں کو تازہ دم ہو جانے دو
ایک ہی ساتھ بڑھیں گے منزل کی جانب
بچھڑے ہوئے یاروں کو بہم ہو جانے دو
پھر لکھ لینا دنیا بھر کے افسانے
پہلے قصۂ شوق رقم ہو جانے دو

پوری غزل ایک اچھے وقت کی آرزو سے وابستہ ہے۔ یہ تمام مسائل عصری ہیں مگر ان مسائل کے درمیان شاعر مستقبل سے مایوس نہیں ہے وہ امید کرتا ہے کہ صورت حال بہتر ہوگی۔ اسم اعظم شہریار کی پہلی منزل تھی دوسرے مجموعۂ کلام "ساتواں در" میں "اسم اعظم" کے موضوعات ایک نئی آن بان کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ عشق کا موضوع شروع سے ہی شہریار کی غزلوں میں ملتا ہے مگر ان کے فکری تجربے میں وہ موضوعات زیادہ پرکشش انداز میں سامنے

آگے جس کا رشتہ صنعتی اور مادی زندگی سے ہے "ساتواں در" کی پہلی غزل کے یہ دو شعر دیکھیے:

میں چیخنے سے باز نہ آؤں گا یارو
دیوانہ سمجھو یا سودائی مجھ کو
ہنگامہ ساز سے خالی ہاتھ اٹھوں کیسے
مل جائے تھوڑی سی تنہائی مجھ کو

ہنگامہ ساز سے تنہائی لے کر اٹھنے کی تمنا کو غزل کی اس تنہائی سے وابستہ کر کے دیکھنا مناسب نہیں ہوگا جس میں صنعتی زندگی کی خود غرضی اور خود پرستی کا بڑا حصہ ہے۔ اس شعر کی تنہائی بنیادی طور پر محبوب سے جدا ہونے کے بعد کی کیفیت ہے۔ نئی شاعری کی تنہائی سے اس شعر کا اتنا رشتہ ہے کہ نئی شاعری میں تنہائی کو ایک پناہ گاہ کی صورت میں دکھایا گیا۔ مندرجہ بالا شعر کو شہریار کے درج ذیل شعر سے ملا کر دیکھیے:

دکھ ہے اکیلے پن کا مگر یہ ناز بھی ہے
بھیڑ میں اب تک انسانوں کی کھوئے نہیں

اپنی ذات کی طرف مراجعت نئی شاعری کے اہم موضوعات ہیں
شہریار کے یہاں بھی اپنی ذات سے روبرو ہونے اور اپنا محاسبہ کرنے کا انداز پایا جاتا ہے

اس حصار روز و شب سے دوستو نکلو ذرا
دیکھ لی دنیا بہت اب خود کو بھی دیکھو ذرا

ظاہر ہے کہ جب کوئی خود کو دیکھنا چاہے تو اس کے لیے تنہائی کی ضرورت ہوگی مگر اسی غزل کے دوسرے شعر میں تنہائی دوسری شکل میں سامنے آتی ہے:

جس طرف بھی جائیے تنہائیوں کی گرد ہے
شہر دل میں یک بہ یک کیا ہو گیا سوچو ذرا

شہریار کے دوسرے شعری مجموعے "ساتواں در" سے یہ چند اشعار بھی ملاحظہ کیجیے:

نکلا تھا میں صدائے جرس کی تلاش میں
دھوکے سے اس سکوت کے صحرا میں آ گیا
کہاں پہ قتل یہ پرچھائیاں کریں یارو
جو تاب لا نہ سکیں روشنی کے خنجر کی
جدھر اندھیرا ہے تنہائی ہے اداسی ہے
سفر کی میں نے وہی سمت کیوں مقرر کی
خلا کی دھند ہی آنکھوں پہ مہرباں رہی
حریف کوئی افق کب مری نظر کا تھا
ستارے صف بہ صف بڑھے آتے ہیں مری سمت
اے دل کی دھڑکنو کہو کس طرح سے بچوں

شاعر صدائے جرس کی تلاش میں نکلا تھا اور وہ سکوت کے صحرا میں آ گیا۔ صدائے جرس دراصل زندگی کی حرکت و حرارت کا استعارہ ہے۔ سکوت کا صحرا زندگی کے ٹھہراؤ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ سکوت کے صحرا میں شعوری طور پر نہیں بلکہ دھوکے سے آ گیا۔ یہ شعر بنیادی طور پر زندگی کی ایک اہم سچائی کا اظہار ہے لہٰذا اس کی معنویت کی تلاش کے لیے اس میں عصری حسیت کا ڈھونڈنا ضروری نہیں۔ سکوت کے صحرا کو موت سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ شہریار کے یہاں لفظ "پرچھائیں" اور سایہ کا بھی استعمال بڑے فن کارانہ انداز میں ہوا ہے:

عجب سانحہ مجھ پہ گزر گیا یارو
میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو
وہ دیکھو آ گئی میرے زوال کی منزل
میں رک گیا مری پرچھائیں چلتی جاتی ہے
میں اکیلا ہی سہی مگر کیسے
تنگ پرچھائیوں کے بیچ رہوں
سب ہم سفر شہید ہوئے راہ شوق میں
پرچھائیوں کے وار سے اک میں بچا رہا
بتاؤں کیسے کہ سورج کی زد میں ہیں سب لوگ
جو حال رات کو پرچھائیوں کے گھر کا ہے
اسی سبب سے تو پرچھائیوں کی پوجا کا
کل کچھ نہیں خواہش کی فصل بونے کا
ہمراہ کوئی اور نہ آیا تو گلہ کیا
پرچھائیں بھی جب میری مرے ساتھ نہ آئی
عمر کی لمبی مسافت ہر قدم کھلنے لگی
تیری پرچھائیں مرے ہمراہ کیوں چلنے لگی
کون ان کے واسطے روشن کرے گا راستے
ہم سے بچھڑیں گی تو یہ پرچھائیاں پچھتائیں گی
وہ ادھر اس طرف ذرا دیکھو
ایک پرچھائیں لہو سے تر ہے
پہلے تجھے دیکھا تھا پرچھائیں کی صورت میں
پھر جسم ترا میری رگ رگ میں اتر آیا
یہاں سے گزرے ہیں گزریں گے ہم سے اہل وفا
یہ راستہ نہیں پرچھائیوں کے چلنے کا

ان شعروں میں لفظ "پرچھائیوں" یا "پرچھائیں" کو شہریار نے

جس طرح استعمال کیا ہے وہ ان کی غزل میں ان کی انفرادیت کو ظاہر کرتا ہے

وہ دیکھو آ گئی میرے زوال کی منزل
میں رک گیا مری پرچھائیں چلتی جاتی ہے

اس شعر میں پرچھائیں موت کی علامت ہے۔ وجود جب بے حس و بے حرکت ہو تو صرف پرچھائیں باقی رہ جاتی ہے۔ شعر کی خوبی یہ بھی ہے کہ ثانی مصرعے میں "میں" اور "مری" کو شاعر نے الگ الگ طرح سے برتا ہے "مری" "میں" کے بعد کی منزل اختیار کر لیتی ہے۔

اس دوسرے شعر میں شہریار نے پرچھائیں کو ذرا مبہم طریقے سے استعمال کیا ہے:

کہاں پہ دفن ہے پرچھائیں کریں یاد
جو تاب لا نہ سکیں روشنی کے خنجر کی

کسی انسانی وجود کی پرچھائیں بھی وجود کے دم سے ہے مگر جب وجود ہی نہ رہے تو انسان پرچھائیں لے کر کیا کرے۔ بظاہر تو شعر سے یہی لگتا ہے کہ پرچھائیں روشنی کے خنجر کا مقابلہ کرتی رہی مگر غور کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وجود جب روشنی کے خنجر کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہا تو اس کے وجود کی پرچھائیں مقابلہ کرنے لگیں۔ وجود کو تو دفن کیا جا سکتا ہے مگر پرچھائیں کو کہاں لے جایا جائے۔ روشنی تو خوش حالی کی علامت ہے مگر یہاں "روشنی کے خنجر" کی ترکیب سے منفی کردار سامنے آتا ہے سورج جب سر پر ہوتا ہے تو سایہ غائب ہو جاتا ہے جیسے جیسے سورج کنارے آتا جاتا ہے سایہ بھی وجود سے باہر آنے لگتا ہے۔ شاید مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ تاریکی میں جینا سیکھ لیتے ہیں وہ اتنی تیز روشنی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور وہ تاریکی میں خوش رہتے ہیں۔ اس تیسرے شعر میں پرچھائیں اپنے وجود کی بھی ہو سکتی ہے اور دوسروں کے ذات کا عکس بھی۔

میں اکیلا سہی مگر کیسے
تنگی پرچھائیوں کے بیچ رہوں

اس شعر میں کوئی الجھاؤ تو نہیں ہے مگر "تنگی پرچھائیں" شعر کو اتنا سادہ بھی رہنے نہیں دیتی۔ پرچھائیں کوئی جسم شے نہیں اس کے لیے تنگی کا لفظ اضافی بھی ہو سکتا ہے اس لیے کہ پرچھائیں تو ننگی اور کھلی ہوتی ہی ہے۔ شاعر کے اکیلے پن کو تنگی پرچھائیں دور نہیں کر سکتی۔ "تنگی پرچھائیاں" سے شاعر کی مراد وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو اپنا وجود تو رکھتے ہیں لیکن ان کی حیثیت پرچھائیوں جیسی ہے یعنی ان کا ہونا عکس کی مانند ہے۔ اس شعر میں لفظ پرچھائیں ظلم وجود کا استعارہ بن گیا ہے:

سب ہم سفر شہید ہوئے راہِ شوق میں
پرچھائیوں کے وار سے اک میں بچا رہا

راہِ شوق سے صرف عشق کا تصور ہی وابستہ نہیں بلکہ یہ زندگی کے مختلف معاملات کی راہ ہو سکتی ہے اگر دیکھیں تو یہ مضمون کوئی نیا یا اچھا نہیں ہے۔ ساری خوبصورتی اور جدت پرچھائیوں کے وار کی ہے۔ پرچھائیں اس شعر میں بھی زوال اور موت کا استعارہ ہے۔ پرچھائیوں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ خود موت کا رول ادا کرتی ہے تمام ہم سفر کیوں شہید ہوئے اور کوئی ایک شخص کیوں بچا رہا۔ شاعر دوسرے شعر میں اس کی طرف اشارہ کرتا ہے:

اسی سبب سے تو پرچھائیں اپنے ساتھ نہیں ہے
صعوبتِ سفرِ شوق سے نڈھال ہوئی ہے

پرچھائیوں کے وار سے شاعر اس لیے محفوظ رہا کہ اس کا عزم اور حوصلہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ مضبوط اور بلند تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سفر کی صعوبتیں اس کے سامنے پسپا ہو گئیں مگر شاعر صعوبت کو سفرِ شوق سے نڈھال قرار دے کر اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ پرچھائیں تو ساتھ لگی تھی اور صعوبتیں بدستور ساتھ رہیں مگر عزم و حوصلے کے ساتھ وہ بہت دور تک نہیں چل سکیں چنانچہ پرچھائیں بھی پیچھے رہ گئی۔ ان دونوں شعر میں پرچھائیں زوال اور شکست کی علامت بن جاتی ہے۔ بعض اشعار میں شہریار نے لفظ پرچھائیں کو سیدھے اور سادے انداز میں استعمال کیا ہے:

صلہ کوئی نہیں پرچھائیوں کی پوجا کا
مآل کچھ نہیں خوابوں کی فصل بونے کا
سحر کو کوئی ہو نہ آیا تو گلہ کیا
پرچھائیں بھی جب میرے ساتھ نہ آئی

شہریار کی شاعری میں لفظ "خواب" کا استعمال بھی ایک غالب رجحان کی حیثیت رکھتا ہے۔ نظم میں خواب کی تشریح اور تفصیلات بیان کرنے کی پوری گنجائش ہوتی ہے مگر غزل میں صرف اشارے ہی کیے جا سکتے ہیں۔ "خواب" اور شکستِ خواب کی کہانی کوئی نئی کہانی نہیں ہے۔ ترقی پسند شاعروں کا ذکر کرتے ہوئے عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ ان شعراء نے بہتر زندگی اور سماج کا خواب دیکھا تھا آزادی کے بعد ملک کی تقسیم کے نتیجے میں جو انسانی بے حرمتی ہوئی اس کے ردِعمل کے طور پر شاعروں کے یہاں شکست و ریخت کے مضامین پیدا ہوئے مگر ترقی پسند شعراء میں بعض نے شدت کے ساتھ اس بات کی وکالت کی کہ خواب دیکھنا ہمارا حق ہے اور اب بھی ہم بہتر زندگی کا خواب لے کر آگے بڑھ سکتے ہیں۔ سردار جعفری کا شعری مجموعہ "ایک خواب اور" دراصل اسی فکر کا اظہار ہے۔ اس تناظر میں شہریار کا لفظ "خواب" سے اتنی دلچسپی ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ شہریار نے خواب کو کن کن شکلوں میں استعمال کیا ہے۔

کون سا قہر یہ آنکھوں پہ ہوا ہے نازل
ایک مدت سے کوئی خواب نہ دیکھا ہم نے

میں سوچتا ہوں مگر یاد کچھ نہیں آتا
کہ اختتام کہاں خواب کے سفر کا ہوا
کھلی ہے آنکھ کہاں کون موڑ ہے یارو
دیارِ خواب کی باقی نہیں نشانی بھی
ہم بڑھ رہے تھے خواب کے پرزوں کو جوڑ کے
آندھی نے یہ طلسم بھی رکھ ڈالا توڑ کے
منحرف خوابوں سے ہوئے جب لوگ
سوئیں یا جاگیں سب برابر ہے
بہت دنوں سے گزرگاہِ خواب سونی ہے
سرائے شام یہاں اور میں رکوں کب تک
ہر خواب کے مکاں کو مسمار کر دیا ہے
بہتر دنوں کا آنا دشوار کر دیا ہے

یہ چند اشعار خواب کو جس صورت میں پیش کرتے ہیں ان سے خواب زندگی کی ایک اہم طاقت کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ یہ اشعار اس بات کی بھی غمازی کرتے ہیں کہ خواب شہریار کے یہاں فرار کا ذریعہ نہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ صرف خواب دیکھنا ہی کافی نہیں بلکہ اس کے لیے عملی طور پر بھی کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن شہریار کے یہاں خواب سے خاص رویہ کا نظریہ کا پتہ نہیں چلتا۔ شہریار کے منتخبہ اشعار میں خواب دیکھنے کی شدید خواہش کو اس تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے کہ جب زندگی مشکل حالات کا سامنا کر رہی ہو تو ایسے میں بہتر زندگی کا خواب دیکھنا خود کو توانا رکھنے کی ایک کوشش ہے۔ شہریار غزل میں عام طور پر اس بات کی شکایت نہیں کرتے کہ خواب کی حقیقت کیوں سامنے نہیں آتی۔ جیسا کہ خلیل الرحمن نے کہا ہے:

ہمارے عہد سے منسوب کیوں ہوئے آخر
کچھ ایسے خواب کہ جن کا نہیں ہے کوئی بدن

دوسری بات یہ ہے کہ شہریار خواب کا ذکر اپنی ذات کے حوالے سے کرتے ہیں جس سے ان کے شوق یا ارمان کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شہریار کا خواب ذاتی اور انفرادی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ خواب ان کے یہاں ایک طاقت اور قوت کا علامیہ بھی ہے۔ خواب کے نہ دیکھ پانے کا ملال شہریار کے یہاں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوا ہے۔ لیکن وہ سردار جعفری کی طرح یہ نہیں کہتے:

پھینک پھر جذبۂ بیتاب کی عالم پہ کمند
ایک خواب اور بھی اے ہمتِ دشوار پسند

شہریار اگر اپنے جذبے کے اظہار میں شدت کا اظہار کرتے ہیں تو بس اتنا

دنیا نے ہر محاذ پہ مجھ کو شکست دی
یہ کم نہیں کہ خواب کا پرچم نگوں نہ تھا

شہریار نے خواب کے استعمال میں عام طور پر کسی خاص فکر کا اظہار نہیں کرتے مگر ان کے اشعار سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بغیر خواب دیکھے زندگی بہتر نہیں ہو سکتی۔ جب خواب ہی نہ ہو تو شکستِ خواب کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔

منحرف خوابوں سے ہوئے ہیں جب لوگ
سوئیں یا جاگیں سب برابر ہے
ہر خواب کے مکاں کو مسمار کر دیا ہے
بہتر دنوں کا آنا دشوار کر دیا ہے

شہریار نے خواب کو واہمہ بنانے کی جو صورت نکالی ہے وہ ذہانت کی ایک اچھی مثال ہے۔ آخر شاعر کب تک خواب دیکھتا رہے گا حقیقت کی دنیا کچھ اور ہوتی ہے۔ شہریار کے یہاں خواب خود کو زندہ ہونا بند رکھنے کا اہم وسیلہ ہے وہیں اس کا دوسرا رخ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے شاعر جس خواب سے خود کو توانا محسوس کرتا ہے وہ اب اس کے لیے زندگی کا عتاب بن گیا ہے

یہ جب ہے کہ اک خواب سے رشتہ ہے ہمارا
دن ڈھلتے ہی دل ڈوبنے لگتا ہے ہمارا
بلا سبب نہیں بیزار آسمان سے ہم
خرید لائے ہیں کچھ خواب آسمان سے ہم
کھلا ہے وقت کے خوابوں کے بادباں کھولو
کہیں نہ پھر سے ندی آنسوؤں کی گھٹ جائے
آج کی رات میں گھوموں گا کھلی سڑکوں پر
آج کی رات مجھے خوابوں سے فرصت کچھ ہے
لاتا ہم تک بھی کوئی نیند سے بوجھل آنکھیں
آتا ہم کو بھی مزا خواب میں ڈر جانے کا
سماں تھا حشر کا ان بے چراغ گلیوں میں
دیارِ خواب پہ جس رات سنگ باری ہوئی
سرخی ذرا سی خواب کے خنجر پہ دیکھ کر
سب رو رہے ہیں چادرِ شب سر پہ دیکھ کر
ہر ایک رنگ میں دیکھا ہے میں نے راتوں کو
کہ خواب خوف سبب بے شمار جاگا ہوں

شہریار کے یہاں خواب دیکھنے کی شدید خواہش اور کبھی خواب سے گریز ہے۔ یہ تمام تضاد دراصل ہمارے دور کی زندگی کی ایک بڑی حقیقت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شہریار کی غزل میں "خواب" کے مفاہیم ہماری فکر کو محدود نہیں کرتے۔ شہریار نے "خواب" کے ذریعہ جو معنیاتی نظام قائم کیا ہے اس کی کوئی دوسری مثال کسی غزل میں نہیں ملتی۔

تمام شہر آگ کی لپیٹ میں ہے

ابو الکلام قاسمی (علی گڑھ، بھارت)

بیسویں صدی کے نصف آخر کا وہ شعری منظرنامہ جس کی تشکیل میں شہریار اور ان کے بزرگ و خرد معاصرین کا بڑا حصہ ہے، اب اسے ایک نئی شعری روایت کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ اس شعری روایت کی پہچان اور پرکھ کے لیے جو عام تنقیدی رویہ اختیار کیا گیا ہے اس کا غالب رجحان ڈکشن اور لہجے کے تعین پر مرکوز ہے۔ اس نوع کی شاعری ترقی پسند شاعری کے متوازی ہونے کے سبب اور کسی حد تک حلقۂ اربابِ ذوق کا تسلسل ہونے کے باعث جدید شعری اسالیب سے موسوم ہونا شروع ہوئی تھی مگر رفتہ رفتہ اس پر جدیدیت کے مخصوص ادبی میلان کی مہر ثبت کر دی گئی۔ یہی سبب تھا کہ یوں تو جدیدیت کو فردیت، داخلیت اور تخلیق کار کی ذاتی واردات کے مظہر کے طور پر متعارف کرایا گیا تھا مگر بہت کم عرصے میں اسے ایک عام رجحان کی سی حیثیت حاصل ہو گئی... اس ضمن میں یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ جب بھی ادبی تنقید کسی شاعری کی فکری اور فنی انفرادیت کو ثانوی حیثیت دے کر اسے کسی مخصوص زمانے کے عام رجحان سے موسوم کرنے کے درپے ہوتی ہے تو وہ محض کلیے بنانے کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے... راشد اور میراجی سے لے کر شہریار اور ان کے ساتھ کے نئے شاعروں کو اسی طرح کے کلیے اور فارمولے کے تحت پہلے تو جدیدیت سے وابستہ رویوں کا نمائندہ قرار دیا گیا اور پھر اگر ان کے یہاں الگ الگ فکری اور فنی رویوں کی نشاندہی کی کوشش بھی کی گئی تو اس کا انطباق محض ان محرکات پر رہا جن کے آمیزے سے جدیدیت کی شناخت متعین کی جا سکتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض رویوں کی مدد سے کسی خاص عہد کی فکری اور فنی شناخت قائم کرنا کبھی کبھی تنقیدی مجبوری بھی بن جاتی ہے، تاہم اس حقیقت سے بھی انکار مشکل ہے کہ زمانی میلان کے نام کے تحت بالعموم ان تمام زیریں لہروں کو دبا دیا جاتا ہے جو کسی خاص تنقیدی مفروضے کی توثیق نہیں کرتیں۔ چنانچہ شہریار کی شاعری کے ساتھ بھی یہی برتاؤ کیا گیا۔ اس کو محض ایک خاص شعری میلان سے وابستہ کر کے ان تمام عناصر سے چشم پوشی کا ارتکاب کیا جاتا رہا جو اس شاعری کے حصار بند ہونے کی نفی کرتے ہیں۔

اسمِ اعظم سے لے کر ’’نیند کی کرچیں‘‘ تک شہریار کی شاعری یہ صرف یہ کہ اس نوع کے تعینات کو ناکافی ثابت کرتی ہے بلکہ قدرے بدلی ہوئی قرأت اور مختلف تنقیدی تناظر کا تقاضا بھی کرتی ہے... شاعری خواہ کائنات کے حوالے سے ذات کا اظہار ہو یا ذات کے وسیلے سے کائنات کا، صرف اپنے زمانے کے تصورِ شعری کی زائیدہ نہیں ہوتی بلکہ اس کے محرکات بڑی حد تک شاعر کے احساس اور تجربے کسب فیض کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنے زمانے کا تصورِ شعر اس کے لہجے اور ساخت میں تبدیلی ضرور پیدا کرتا ہے مگر تجربے کی نوعیت اور طرزِ احساس کا لسانی اظہار محض متن کی مرکزیت پر قائم نہیں ہوتا بلکہ قاری کی نوعیت اور زاویۂ قرأت کی تبدیلی متن کے مدلول کو بھی تبدیلی سے دوچار کر سکتی ہے... جدید صنعتی تہذیب نے اردو شاعری پر کیا اثرات مرتب کیے؟ ہمارا تہذیبی تصور کس حد تک دو عالمی جنگوں سے اثر پذیر تھا؟ یہ وہ تنقیدی کلیے تھے جن کو جا و بے جا اردو کی نئی شاعری کی پرکھ کا پیمانہ بنا لیا گیا حالانکہ اردو کے شعری منظرنامے پر اگر ان عوامل کا کوئی اثر مرتب ہوا تو وہ بالواسطہ تھا۔ گو کہ یہ بات اپنی جگہ غیر اہم نہیں کہ انسان کے طرزِ وجود پر سوالات قائم کرنے اور فن کار کے انفرادی اور ذاتی نقطۂ نظر کو زندگی کی تفہیم کا بنیادی حوالہ قرار دینے جیسے رویے ہمارے یہاں شاعری کے عالمی منظرنامے کی بازگشت کا پتہ دیتے ہیں۔

شہریار کی شاعری کے بارے میں لکھی جانے والی بیشتر تنقیدی تحریروں میں خارجی طور پر دھیمے لہجے، سرگوشی کی کیفیت اور طلسم سازی کو اور معنوی اعتبار سے ’’تلاشِ ذات‘‘، ’’اداسی‘‘ اور خواب کو پناہ گاہ کے طور پر استعمال کرنے جیسے رویوں کو ان کی شاعری کی پہچان قرار دینے کا عام رجحان ملتا ہے، جب کہ ضرورت اس بات کی تھی کہ شہریار کی نظموں اور غزلوں میں رومانی لفظیات، تشکیک کی انفرادیت اور وحدت کی جامعیت کے ساتھ تہذیبی تصادم کی کیفیت، گمان اور یقین کی کشمکش اور خواب اور بیداری کی دوہری معنویت جیسی ہیئتی اور موضوعاتی شناختوں کی بنیاد پر ان کی شاعری کی قدر و قیمت متعین کی جاتی۔ شہریار کی شاعری کے ضمن میں متن و معنی کے مختلف طبقات کی نشاندہی کو محض فوری معاصر پر محمول نہ کیا جانا چاہیے... یہ بات اس لیے بھی اہم ہے کہ شہریار ان جدید شاعروں میں سے ہیں جن کو جدیدیت کا نمائندہ تو سمجھا گیا مگر اس کے ساتھ ہی ان کی شاعری کو ترقی پسند حلقوں کی طرف سے یکسر مسترد بھی نہیں کیا گیا۔ مگر بعض ترقی پسند نقادوں نے ان کے شعری طریق کار کی تہ داری اور فنی ہنرمندی کو اسی طرح نظرانداز کرنے کی کوشش کی جس طرح ہیئتی تنقید کے نمائندوں نے ان کی شاعری کی سماجی معنویت سے صرفِ نظر کر کے صرف ہیئتی تنوع اور ڈکشن کے تجربوں کو سب کچھ سمجھ لیا تھا۔ شہریار کی نظموں میں معاصر انسان کو پرچھائیں کی صورت میں دیکھنے اور خواب اور حقیقت کو متصادم دکھلانے کے عمل میں ایک تسلسل پایا جاتا ہے جو ان کی ابتدائی شاعری سے لے کر بعد کے زمانے تک کی شاعری میں موجود ہے اور شاعر کی تبدیلی کے باعث غیر متعین تعبیر و تشریح کا متقاضی ہے۔ تاہم یہ سوال اپنی جگہ قائم رہتا ہے کہ یہ خواب ان کی شاعری کا موقف اپنے آپ بنا ہے یا اس کے لوازم نسبتاً زیادہ وسیع پس منظر اور انسانی صورتِ حال کو سمجھنے کے بڑے سیاق و سباق کا پتہ دیتے ہیں؟ شہریار کے ابتدائی دو مجموعوں کی نظموں کے عنوانات ہیں خواب، وقت، مستقبل، ماضی، افسون، امروز، ذہن کا عذاب، آرزو، آوارگی اور موت، جو

بغیر کسی انتہائی کوشش ان کے بنیادی سروکار اور ترجیحات کا خاکہ مرتب کر دیتے ہیں۔ وقت کی تعمیری اور تخریبی قوتوں کے شدید احساس اور تاریخ کے جبر کے سامنے انسان کی آرزو، آدرش اور امید و بیم کی شکست و ریخت اور تبدیلی کے عمل سے دوچار ہونے کی کیفیت بنیادی اہمیت اختیار کر لیتی ہے..... اس پس منظر میں انسانی وجود کے باہر ایک ایسا دائرہ سا نظر آتا ہے جس میں وجود و عدم اور زوال پذیری سے انسان کا سامنا ہے اور اس دائرے کے اندر ایک دوسرا دائرہ ہے جس میں انسان داخلی طور پر اپنی تخریبی قوتوں سے دوچار ہے۔ اس بات کی وضاحت ان کی بعض نظموں کی مدد سے زیادہ بہتر طور پر ہو سکتی ہے

دھوپ میں تنہائی کی جسموں کو جھلسائے رہو
دوریوں کی سخت چٹانوں سے ٹکرائے رہو
اور دلوں میں خواہشوں کی آگ بھڑکائے رہو
وقت کے صحرا میں یوں ہی ٹھوکریں کھائے رہو

(وقت کے صحرا میں)

دن کے صحرا سے جب بنی جان پر
ایک جھوٹا آسرا پا کر
ہم چلے آئے اس طرف سراب
رات کے اس اتھاہ دریا میں
خواب کی کشتیوں کو کھیتے ہیں

(فریب در فریب)

کہاں ہو تم کہاں ہو
نئی صبح کی مہرباں نرم کرنو
مرا جسم مجھ سے بغاوت پہ آمادہ ہے
کانپتی ہے مری روح
آؤ بچاؤ
مجھے شب کے زنداں سے باہر نکالو
میں دن کے سمندر کی گہرائیاں ناپنا چاہتا ہوں

(التجا)

ان نظموں میں انسان کا طرز وجود جس انداز میں انحطاط کی زد میں نظر آتا ہے اس کی خارجی جہت وقت کی کارفرمائی اور تاریخ کے جبر سے اور داخلی جہت انسان کی اپنی افتاد طبع اور جبلت سے متعین ہوتی ہے۔ استعارہ سازی اور فضا آفرینی ان نظموں کا وہ فنی رکھ رکھاؤ ہے جس کے باعث شاعر اپنے آپ کو بے جا گفتاری سے محفوظ رکھ پاتا ہے۔ شہریار کے اس اسلوب میں تحیر کے عنصر اور استفہام کے لہجے کے سبب اس بات کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش ہوتی کہ غیر یقینی صورت حال اور عصری تہذیب کے انتشار نے ان کے یہاں تجسس کے عمل میں شدت پیدا کر دی ہے۔ تجسس کا یہ انداز ان کی ابتدائی نظموں سے شروع ہوا تھا جو بعد کی نظموں میں زیادہ پیچیدہ اور تہہ دار صورت میں تبدیل ہو گیا۔ اس لہجے کی معنویت کس طرح شہریار کی شاعری کی سماجی اور تہذیبی معنویت میں تبدیل ہوتی ہے؟ ذیل کے بعض نمونے اس کے زمانی ارتقا کو بخوبی واضح کرتے ہیں۔

اندھے دن کو گونگی رات سے کیا ملتا ہے؟
گھائل چاند کی گہنائی کرنوں کا سایہ
اس دھرتی کو کیوں بھاتا ہے؟
سورج کی سرشار شعاعیں
اس دھرتی کو کیوں ڈستی ہیں؟
ہر "کل" کیوں اس "آج" کے پیکر میں ڈھلتا ہے
اور انسان کو آج اور کل سے کیا ملتا ہے
کیوں ہم فانی اور امر ہیں؟
پل، لمحے، دن، سال اور صدیاں
یہ سب باتیں نکمی ہی ہیں
لیکن اپنی ذات کا حاصل اور حقیقت صرف یہی ہیں....

(زیست کا حاصل)

وہ کون تھا وہ کون تھا
طلسم شہر آرزو جو توڑ کر چلا گیا
ہر ایک تار روح کا جھنجھوڑ کر چلا گیا
مجھے خلا کے بازوؤں میں چھوڑ کر چلا گیا
وہ کون تھا؟

(وہ کون تھا؟)

دواؤں کی الماریوں سے سجی اک دکان پر
مریضوں کے انبوہ میں مضمحل سا
اک انسان کھڑا ہے
جو اک نیلی کبڑی سی شیشی کے سینے پہ لکھے ہوئے
ایک اک حرف کو غور سے پڑھ رہا ہے
مگر اس پہ تو "زہر" لکھا ہوا ہے
اس انسان کو کیا مرض ہے
یہ کیسی دوا ہے

(نیا امرت)

یہ تینوں نظمیں استفہام اور سوالات پر مبنی مصرعوں سے مرتب ہوتی ہیں صرف اس فرق کے ساتھ کہ پہلی نظم میں سارے سوالات تجریدی نوعیت کے ہیں، دوسری نظم میں انسانی ذات کا حوالہ معرض بحث میں ہے اور تیسری نظم میں تہذیبی انتشار کے نئے دور میں زندگی اور موت کے دوراہے پر انسان اس طرح

کم از کم نظر آتا ہے کہ اس کے لیے خودکشی بظاہر موت ہوتے ہوئے آشوبِ زندگی کا مداوا اور مصائب و آلام کا علاج بن کر سامنے آتی ہے۔ توجہ طلب بات یہ ہے کہ "اس انسان کو کیا مرض ہے؟ یہ کیسی دوا ہے؟" جیسے سوالات قائم کرکے شاعر نے معنوی تعین سے اجتناب کرتے ہوئے ان مصرعوں کی قرأت اور تفہیم کے امکانات کھلے چھوڑ دیے ہیں۔

شہریار کی نظموں اور غزلوں میں رات اور دن کے بنیادی استعارے سے جو تلازمات جنم لیتے ہیں وہ دونوں اضافت میں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ "رات کے ساتھ نیند، خواب، سایہ، پرچھائیں، دھند، سناٹا اور دن" کے تلازمے کے طور پر بیداری، سورج، دھوپ، شعاعیں اور تمازت جیسے الفاظ ایک طرف ایک دوسرے کے تقابل اور تخالف کا منظر پیش کرتے ہیں تو دوسری طرف اس تقابلی صورت حال میں اجنبیت، لاحاصلی اور بالآخر زوال کو انسانی سماج کے سرگرم عمل رہنے اور بہتری سے نبرد آزما ہونے کا جواز بنا دیتے ہیں۔ وہ صرف اس احساسِ شکست کو اپنا مقدر نہیں سمجھ لیتے کہ: "دھوپ میں تنہائی کی جسموں کو جھلساتے رہو، وقت کے صحرا میں یونہی ٹھوکریں کھاتے رہو"...... بلکہ اس نوع کے حسی اور تخلیقی تجربات کو مختلف سطحوں میں تبدیل کرکے دانشورانہ استفسار اور تلاش و تجسس سے مسلسل دوچار نظر آتے ہیں.... بغاوت اور احتجاج، اردو کی ترقی پسند نظموں میں جس طرح ابھرے یہاں اور نثری منطق کی نذر ہونے کے سبب نعرے میں تبدیل ہو کر رہ گئے وہ ہمارے سامنے ہے مگر شہریار کے یہاں اس کے تلازمے آوازوں کی بالادستی میں اس طرح تبدیل ہوجاتے ہیں کہ نظم کا جمالیاتی آہنگ ذرا بھی متاثر نہیں ہوتا:

آوازیں جو ننگے بدن بال کھولے
دروازوں کی درزوں سے اندر گھس آتی ہیں
کھلے ہوئے آنگن میں نیم کے پیڑ کے نیچے
پڑے ہوئے سوکھے پتوں کے زردیوں کو
چیخنے اور چلانے کا فن سکھا رہی ہیں
سوکھے ہوئے ان کے زخموں کو جگا رہی ہیں
(خواب سے پہلے خواب کے بعد)

آوازوں کا ننگے بدن یا بال کھولے ہوئے ہونا، جہاں ایک طرف صوت و صدا کی تجسیم کاری کی مثال ہے وہیں یہ تمثیلی انداز "دروازوں کی درزوں سے اندر گھس آنے" کی امیجری کے باعث سماج کے ہر فرد تک پہنچنے والی بےاطمینانی کو نشان زد کردیتا ہے۔ اس لیے سوئے ہوئے جذبوں کا بیدار ہونا اور بے آوازوں کا اپنے ردعمل کو اقتدار کے ایوانوں تک پہنچانا ایک فطری رویہ بن کر نمودار ہوتا ہے۔ کم و بیش اسی نوع کا تمثیلی انداز ایک اور نظم میں سناٹے اور دھند کے استعاروں میں ظہور پذیر ہوا ہے:

وہ صلیب کا سایہ
اب نظر نہیں آتا
وہ خفیف سا اضطراب ہوا میں لرزاں ہے
وہ ادھوری پرچھائیں
اپنے سے پشیماں ہے
وہ بھٹکا سناٹا
بےلباس و عریاں ہے
اب تو اس افق پر بھی دھند کی حکومت ہے
اب تو بند لب کھولو
اب تو چیخ کر بولو
(دھند کی حکومت)

انسانی معاشرے پر اثر انداز ہونے والا خود آوردگی و انتشار کا رویہ ہو یا یقین و اعتماد کا اس کے زوال کا ایسا شدید احساس اور اس احساس کے ردعمل کو کسی نہ کسی صورت میں ظاہر کرنے کی ترغیب، شہریار کی شاعری کی سماجی اور تہذیبی معنویت وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ گہری کرتی نظر آتی ہے۔ خفیف سے خفیف خطرے کا ہوا میں لرزاں ہونا، سناٹے کا بےلباس و عریاں ہونا اور افق پر دھند کی حکومت ہونا، یا اس پوری صورت حال کے باعث حبس اور اضطراب کے احساس کا جاگنا، سماجی ذمہ داری کے ساتھ ان کے شعری طریقِ کار کو بھی سامنے لاتا ہے.... پھر یہ کہ اس حبس کی فضا کے بیان میں پیکر تراشی کا عمل شہریار کو دانشورانہ ذمہ داری کے ساتھ فنکارانہ منصب سے بھی عہدہ برآ ہونے والا شاعر ثابت کرتا ہے۔ تمثیلی پیکر تراشی خود ان کی نظموں کے اسالیب کو انگریزی کے پیکر تراش شعرا (IMA GIST) کے قریب کردیتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی "اب تو بند لب کھولو" اور "اب تو چیخ کر بولو" جیسے مصرعے اس نظم کے شاعر کو اپنی دانشورانہ ذمہ داری سے بھی بخوبی کامیابی کے ساتھ ہمکنار ہوتا ثابت کرتے ہیں۔

تصورات کی شاعری اور ٹھوس حقائق پر مبنی شاعری کو باہمی قریب کی تنقید نے الگ الگ خانوں میں اس طرح تقسیم کر رکھا تھا کہ جدید شاعری کے پیش تر نمائندہ شعرا کو تصوراتی شاعر قرار دے کر ان کے تجریدی اظہار کا جواز فراہم کیا گیا۔ شہریار ان شاعروں میں سے ہیں جن کے یہاں یہ تفریق ختم ہوجاتی ہے مگر جدید تنقید کے فارمولوں کا اطلاق کرکے ان کے نقادوں نے ان کی ہمہ جہتی ہنرمندی کو اتنا نظرانداز کیا ہے کہ اس شاعری کی سماجی معنویت اپنے آپ ثانوی ہوکر رہ گئی۔ جب کہ حقیقت حال یہ ہے کہ تصورات اور ٹھوس حقائق شہریار کی شاعری میں اپنی ثنویت ختم کرتے نظر آتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فنی طریقِ کار ذہنی پارے کے جمالیاتی تقاضے کا احساس ہوتا ہے لیکن جب دو یا دو سے زیادہ فن پارے ایک جیسی فنی قدر کے حامل ہوں تو ان کے درمیان خط امتیاز کھینچنے کے لیے شاعر کے وجدان، اس کی آگہی اور حیات و کائنات کے بارے میں اس کے موقف کو ہر نوع

وہ امتیاز بنانا پڑے گا۔ اس لیے شاعر نے تہہ داری کا استعمال جس کا تعلق حقائق کی پیشکش کی خاطر کیا گیا ہے۔ ان حقائق سے صرفِ نظر کر کے شاعر کے قد و قامت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ٹھوس حقائق اور سماجی مسائل کو استعاروں کی سطح پر پیش کرنا شہریار کا نہایت پسندیدہ شعری طریق کار ہے مگر اس کے ساتھ ہی وہ اپنی ہر نظم میں حقائق کو نشان زد کرنے والے کچھ ایسے شواہد ضرور چھوڑ دیتے ہیں جن کے باعث اپنی ساری ہمہ جہتی کے باوجود استعارہ سازی اپنی زمانی و تہذیبی معنویت کو بھی نشان زد کر دیتی ہے اور نظم کی تفہیم کی کلید بھی فراہم کر دیتی ہے۔ اس نوع کی نظموں میں ہیئتی اعتبار سے ایک مکمل اور جامع نظم "پہلے صفحے کی پہلی سرخی" کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ہمالے کی بلند چوٹی پہ
برف کے اک سبک مکاں میں
جمی ہوئی مشعلوں کا جلسہ
عظیم اور عالمی مسائل پہ
ایک ہفتے سے ہو رہا ہے
صفر تک درجۂ حرارت پہنچ چکا ہے
مزید تحصیل رائگاں ہے

اس نظم کا عنوان جس طرح معاصر سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کی اہمیت کو خبر نامے کے حوالے سے نشان زد کرتا ہے اس کا سلسلہ نظم میں موجود جلسہ اور عالمی مسائل جیسی لفظیات کے ذریعے نظم کی کلید فراہم کرنے سے مل جاتا ہے "ہمالے کی بلند چوٹی" کے الفاظ جہاں ایک طرف موسم گرما کے پر فضا کا اشارہ ہیں وہیں چوٹی کانفرنسوں کی اہمیت کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ مگر برف کا مکاں "جمی ہوئی مشعلیں" درجۂ حرارت کا صفر تک پہنچ جانا جیسے استعارے حق سوچ، بے حسی غور و فکر، انسانی مسائل کے حل میں سرد مہری کے رویے اور جذبے کے انجماد یا بے حسی کی صفات سے متصف دانشوروں یا پیشہ ور سیاست کاروں کی پوری نفسیات کو بھی بے نقاب کرتے ہیں اور معاصر دانشورانہ سرگرمیوں کی لا حاصلی کا بھی بہترین نقشہ پیش کرتے ہیں.... جمی ہوئی مشعلوں سے زندگی کی حرارت سے محرومی کی طرف اشارہ مقصود ہے تو روشنی اور حرارت سے محروم مشعلوں کے جلسے سے ان کی کارگزاری میں معروف دانشوروں کی لاتعلقی کا پتہ چلتا ہے۔ نظم کے اختتام کے طور پر "مزید تحصیل رائگاں ہے" جیسے آخری مصرعے کی مدد سے اس طرح نظم کو نقطۂ عروج پر پہنچایا گیا ہے کہ امرا کی کیفیت اور نتائج کو صیغۂ راز میں رکھنے کی پس پردہ سازش بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ پوری نظم فنی اعتبار سے عضویاتی نمو کا عمدہ نمونہ پیش کرتی ہے۔ کلامیہ تکنیکی تحت البیان کا انداز اور اختصار کی شدت زیر بحث نظم کو شہریار کی بھرپور فنی تخیل کی نمائندگی کرنے والی نظموں میں شمار کیے جانے کے قابل بناتی ہے۔ معاصر دانشورانہ سرگرمیوں کے بارے میں بصیرت افروز زاویۂ نظر اختیار کرنا شہریار کے موقف کو بھی ظاہر کرتا ہے اور موضوع اور اسلوب بیان میں ہم آہنگی کو بھی۔ عصری صورت حال پر شہریار کی ایک اور نظم میں روشنی کے حصار اور تیرگیوں کی قطار کے دو زمروں میں دانشورانہ سرگرمیوں میں معروف اشخاص کی حیثیت کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

انھیں نذر ہے کہی گئی ہوں
جو دکھائی دیتے تھے ہم نفس
کبھی روشنی کے حصار میں
کبھی تیرگیوں کی قطار میں

(ہندوستانی دانشوروں کے نام)

شہریار کی شاعری کے جائزوں میں ان کی آواز کی سحر انگیزی، لہجے کے دھیمے پن اور خواب سے متعلق علامات پر اسکی توجہ مرکوز رکھی گئی ہے کہ ان کی شاعری کی معنوی تعبیرات پر گفتگو کی گنجائش ہنوز باقی ہے۔

شہریار کی نیتا بعد کے زمانے کی ایک نظم کا عنوان ہے "خطرے کا سائرن"۔ یہ عنوان جتنا غیر مبہم اور واضح ہے اس کا سلسلہ نظم کے مدعا کی وضاحت سے جا ملتا ہے تاہم ملکی تباہیوں سے بہت واضح رابطے کے باوجود شہریار امیجری اور تمثیلی طرز پر بھی اپنے شعری طریق کار کو چھوڑنے پر کبھی آمادہ نظر نہیں آتے:

تمام شہر آگ کی لپیٹ میں ہے بھاگیے
حضور کب سے میٹھی نیند سو رہے ہیں جاگیے
یہاں سے دور حشر کا دھواں اٹھا ہے
لگی ہوئی ہے آگ پر جو دور تک ہٹا ہے
دراز میں پڑے بندھے دیجیے تمام خواب
کھلی ہے جو کتاب میز پر نہ بند کیجیے
تمام رات جاگتوں سے خواہشوں کے پیرہن
بکھر گئے ہیں فرش پر ہوا کے تند جھونکے سے
ورق ہوا نہ ہونا ہے کے بھی مت سمیٹیے
گھڑی کی سوئیوں کی سمت دیکھنے کا فائدہ
لباسِ خواب کو بدلنے کا نہیں ہے وقت اب
تمام اہلِ شہر شہر چھوڑ کر چلے گئے
جھکے ہوئے ہیں سر عظیم بلڈنگوں کے دیکھیے
اب اور کچھ نہ دیکھیے اب اور کچھ نہ سوچیے
تمام شہر آگ کی لپیٹ میں ہے بھاگیے

(خطرے کا سائرن)

سماجی اور سیاسی صورت حال کا انتشار اور خوف و ہراس کی تجسیم کاری اس نظم کے غیر مبہم بیانات کو بھی تمثیلی اظہار کے اسلوب سے ہم آہنگ بنا دیتی ہے

اس میں تخاطب کا براہ راست طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور خوابوں کو دراز میں بند رکھو اور "خواہشوں کے پیرہن کو کھونٹیوں سے نہ لٹکا رہنے دو" کے مشورے میں امیج سازی کی شاعرانہ تدبیر کاری نظم کے اسلوب کو محض امیجز نہیں رہنے دیتی بلکہ بے داد و بالواسطہ بناتی ہے۔ اس پس منظر میں پوری نظم فرقتی اور نفسیاتی کی جس ملتی فضا کو پیش کرتی ہے وہ شہریار کے لیے اپنے سماجی اور تہذیبی منصب سے عہدہ برآ ہونے کے مترادف بن جاتی ہے۔

تمثیل کی بنیاد پر پیکر تراشی کے عمل سے شہریار اپنے قاری کو حواس کی سطح پر جس طرح اپنے تخلیقی تجربے میں شریک کر لیتے ہیں، لہجے کی انفرادیت اس میں ایک نئے پہلو کا اضافہ کرتی ہے۔ ان کا دھیما اور نرم لہجہ اور سرگوشی کی کیفیت ان کی غزلوں اور نظموں میں سخت حد بندیوں کے باوجود یکساں انداز میں محسوس کی جا سکتی ہے۔ اگر لہجے سے الگ ان کی شاعری کے بنیادی استعاروں کی کارکردگی کا سراغ لگایا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ دن اور رات کے حوالے سے "وقت" شہریار کا ایک بنیادی استعارہ ہے۔ جس کے تلازمات انسان کی زوال آمادگی کے محرکات بن جاتے ہیں۔ یہی بنیادی استعارہ انسانی آرزوؤں اور تمناؤں کے جامع مظہر "خواب" کی مرکزیت کا سبب بنا ہے اور خواب کے سیاق و سباق کے طور پر نیند اور بیداری کے الفاظ نے اہمیت اختیار کر لی ہے.... "رات" شہریار کے لیے محض نیند اور خواب کا وسیلہ نہیں بلکہ سیاہی کی صفت کے ساتھ منفی قدروں، مایوس کن صورت حال اور غیر یقینی مستقبل کا علامیہ بن گئی ہے۔ سیاہ رات کو خاطر میں لائے تو کیسے بھی ہوتی یہ نظر کب سے ایک ستارے پہ ہے۔ رات کے اسی استعارے سے ستارے کا دوسرا استعارہ پھوٹ نکلا ہے جو قربت، اقدار یا امید اور روشنی کا مخرج اور سرچشمہ بن گیا ہے۔ شہریار کی جو چند نمائندہ نظمیں اپنی جامعیت اور فنی تکمیل کے باعث مثالی اہمیت کی حامل قرار دی جا سکتی ہیں ان میں سے ایک نظم "تحیہ" بھی ہے

وہ جو آسماں پہ ستارہ ہے
اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لو
اسے اپنے ہونٹوں سے چوم لو
اسے اپنے ہاتھوں سے توڑ لو
کہ اسی پہ حملہ ہے رات کا (تحیہ)

اس نظم میں ستارے کی مرکزی معنویت اور اسی کی خلائی وسعت اپنے دائرے میں بلندی، روشنی، قوت اور حرارت جیسی صفات کو سمیٹ لیتی ہے۔ ستارے کے تحفظ کے طور پر نظم کے آخری مصرعے میں رات کے حملے کا ذکر ہے جو روشنی کو نگل لینے والی قدروں کو تہہ و بالا کر دیتے اور امید کی روشنی کو گھٹا ٹوپ تاریکی سے بدل دینے کا احساس بیدار کرتا ہے جب کہ اپنے تمام حواس کے ذریعے اس روشنی سے کسب فیض کرنے کی ترغیب اس نظم کی محرک ہے۔ شہریار کی شاعری میں رات اور دن کے ساتھ آواز یا صوت یا صدا کے تلازمات نے بھی روشنی اور تاریکی ہی کی طرح بعض دوسرے مضمرات کا امکان پیدا کیا ہے۔ خاموشی اور آواز یا سکوت اور صدا کے تعلق پیکر شہریار کی شاعری میں اسی پس منظر کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔

یہ ایک بات نہیں جانتے جو ہم چپ ہیں
کہاں سکوت میں شامل صدا کو ہونا ہے

مرزا غالب کو جاگنے سے خواب کو ملا دینے کی حسرت تھی اور خواب اور بیداری کے وسیلے سے خواب اور تعبیر خواب یا آرزو اور تکمیل آرزو کے درمیانی خلا کو پُر کرنا ان کا مدعا تھا۔ شہریار نے سکوت اور صدا کو بدلتے اور چپ رہنے، احتجاج کرنے اور مقاومت کی راہ اختیار کرنے اور خاموش ہو کر ظلم و استحصال کا ساتھ دینے یا بول کر اس کے خلاف احتجاج کا ثبوت دینے جیسے تمام امکانات کو اس شعر کا مصداق بنایا ہے۔

شہریار کی شاعری میں دانشورانہ غور و فکر اور تہذیبی و معاشرتی صورت حال سے جو وابستگی ملتی ہے اس کے بیان میں تہہ داری اور شعری وسائل کا استعمال اسے اکہرے پن سے محفوظ رکھتا ہے۔ انہوں نے انسانی رشتوں کے مختلف پہلوؤں کو بھی بالواسطہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انسانی رشتے جدید انسان میں بھی مادیت اور ارتقاء حاصل کرنے کے باوجود اپنی اصل کے اعتبار سے کیوں کر جسمانی اور وجودی شرطوں سے بلند نہیں ہو سکے اس کا خوبصورت اظہار اس نظم میں دیکھا جا سکتا ہے:

میرا تو ارادہ تھا
ہونٹ سیڑھیوں سے میں
آسمان تک جاؤں
تو نے اس جگہ مجھ کو
اتنی دیر تک روکا
یہ بھی بھول بیٹھا میں
میرا کیا ارادہ تھا
اس وجود خلا میں جسم کچھ زیادہ تھا (میرا تو ارادہ تھا)

ابتدائی دو مصرعوں میں ہونٹ سیڑھیوں کو وسیلہ بنا کر آسمان تک جانے کی تمنا پیکر جو کہ شاعر کے تخیل کے وجدانی پہلو کو پیش کرتا ہے مگر دنیاوی علائق کیونکر وجدانی راستوں میں مزاحمت پیدا کرتے ہیں اور کس طرح خلا وجود جگہ اپنی مکمل شرطیں عائد کرتا ہے ان سارے لوازمات کو اس نظم کے چند مصرعوں میں سمیٹ لیا گیا ہے....

شہریار کی نسبتاً بعد کے زمانے کی شاعری میں خود احتسابی اور اعتراف کی بعض شکلیں بہت نمایاں ہیں۔ اعتراف اور احتساب کا یہ اظہار اکثر اپنی ذات کے حوالے سے ہوا ہے اور اس اظہار نے بسا اوقات احتجاج کا لہجہ بھی اختیار کر لیا

ہے۔ پھر یہ کہ اخلاقی اور تہذیبی قدروں پر اپنے آپ کو پورا نہ اترتے دیکھنے کا اعتراف اس وقت سماجی معنویت میں تبدیل ہو جاتا ہے جب اس اعتراف کو کسی صیغے میں بیان کیا جاتا ہے.... شاعر کے لیے حقیقی دنیا اور خواب کی دنیا ایک دوسرے سے اتنی مختلف ہے کہ بدلی ہوئی صورت حال سے مفاہمت کر لینا آسان نہیں رہ جاتا۔ اس لیے وہ خود کلامی کو بھی احتجاج کی ایک صورت بنا لیتا ہے۔

یا اتنی نہ تبدیل ہوئی ہوتی یہ دنیا
یا میں نے اسے خواب میں دیکھا نہ ہوتا

ان کی غزلوں کے متفرق اشعار میں اس نوع کے تاثرات جزوی نوعیت کے معلوم ہوتے ہیں جبکہ ان کی نظموں میں معاصر صورت حال پر تبصرہ کچھ ایسی تہہ داری اور پیچیدگی کا انداز اختیار کرتا ہے کہ اس صورت حال کا پہلا حوالہ شاعر کی اپنی ذات بن جاتی ہے۔ شاید اسی باعث عمر کے تیر و تشتر کے باوجود ان کی تخلیقیں بلند آہنگی اور براہ راست طرز تخاطب سے محفوظ رہتی ہیں۔ ایک نظم میں اپنی سردمہری اور مجرمانہ خاموشی کا اعتراف اس طرح کیا گیا ہے:

لہو سرد ہو گیا
ہماری روح کا لہو سرد ہو گیا
دبیز برف کی تہیں ہٹا کے دیکھ لو
اگر یقیں نہ ہو
رگوں میں خون جم چکا ہے
دلوں کی دھڑکنوں کا سلسلہ بھی ٹوٹ جائے گا
دعا ہے یہ لہو جسم و جاں کے درد و دکھ نکل جائے گا
سوائے دعا کے اب تمہارے ہاتھ کچھ نہ آئے گا
(لہو سرد ہو گیا)

شہریار کی نظموں کے بارے میں جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ جہاں ایک طرف وقت اور اس کے پس منظر میں دن اور رات کے بدلتے منظر نامے کو کلیدی حیثیت حاصل ہے، وہیں تاریخ کا جبر بار بار اپنا احساس دلاتا ہے۔ وقت کی قدر و قیمت کی شناخت کامیابی کی اور اس سے غفلت زیاں کاری اور ابتری کی علامت بن جاتی ہے۔ ان کی ایک نظم کا عنوان "مژدۂ انقلاب" ہے۔ مگر اس نظم میں جس حقیقت کا انکشاف کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ مثبت انقلاب پر وقت گرفت نہ ہونے کے نتیجے میں وہ کیونکر منفی انقلاب اور انتشار میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس انتشار کو جنگ کے استعارے کی مدد سے بیان کیا گیا ہے:

ہوس کے جو قیدی ہیں بچوں کے بدن میں
وہ سب دیو ہیں
خوف و نفرتوں کے
وہ سب دیو اک روز آزاد ہوں گے
وہ سب دیو جس روز آزاد ہوں گے
تو اس شہر کا ایک اک فرد خود سے پشیماں ہوگا
طلسم ہوس ٹوٹ جانے پہ حیراں ہوگا
نگاہیں کبھی آسمانوں کی جانب اٹھیں گی
کبھی ہاتھ کوئی اشارہ کریں گے
کبھی ہونٹ کچھ بولنے کا ارادہ کریں گے
مگر کچھ نہ ہوگا.....
فقط جنگ ہوگی
ہر اک سمت سے بارش سنگ ہوگی.... (مژدۂ انقلاب)

شہریار کی شاعری کا منظر نامہ ان کے پانچ شعری مجموعوں پر پھیلا ہوا ہے۔ ان کے پہلے مجموعے کی نظموں اور غزلوں میں بعض لفظیات کی تکرار اور سرگوشی کی طلسماتی فضا نے ان کے نقادوں کو جدید حسیت اور تجریدی افسوں کاری کی تعبیرات سے آگے نہیں جانے دیا تھا..... مگر دوسرے مجموعے "ساتواں در" کی نظموں سے ان کے یہاں اسالیب کے تنوع اور ہم وطنی صورت حال سے بے اطمینانی کے اظہار کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو ہنوز تجربے کی نوعیت اور لہجے کے بدلتے ہوئے آہنگ کی نشاندہی کرتا ہے.... ان کی ابتدائی نظموں میں فلسفیانہ گہرائی کی اور ذہنی قسم کا رد عمل تھا جس نے وقت کے ساتھ ساتھ کلچر کے زوال کے شدید احساس اور ثقافتی انتشار کے بصیرت انگیز غور و فکر کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اسی باعث شہریار کی شاعری کو نہ تو کسی ایک مخصوص شعری رجحان میں مقید کیا جا سکتا ہے اور نہ ان کے فکری اور فنی تنوع کو کسی چیز یا اتنا تنقیدی اصطلاحوں میں محدود کیا جا سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ان کی شاعری میں روایت کے تسلسل سے لے کر انفرادی اسلوب کی تلاش تک اظہار کی رنگارنگی نہ ملتی۔

شہریار کی نظموں اور غزلوں میں تکنیکی تنوع کے ساتھ سماجی اور دانشورانہ گہرائی کا جو رشتہ ملتا ہے وہ دانشورانہ افکار اور اپنی آہنگ میں ڈھل کر ان کی شاعری کے ہر دور میں اپنی پہچان کو باقی رکھتا ہے۔ شروع میں ان کی شاعری تمثیلی تلازمات اور معنوی انسلاکات کی جس کثیر ہوئی فضا کا احساس دلاتی تھی اس میں امتداد وقت کے ساتھ فکر کے عنصر کا اضافہ ہوا ہے۔ پھر یہ کہ اس فکر نے اپنے گرد و پیش کی صورت حال پر شاعر کو سوالات قائم کرنے کا حوصلہ بخشا ہے۔ ان کے یہاں طنزیہ لہجے کا جواز بھی عصری صورت حال سے ابھرنے والی باطنی کشمکش میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اس پس منظر میں کسی باشعور قاری کے لیے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں رہ جاتا کہ شہریار نے "نیند کی کرچیں" (آخری مجموعہ کلام) تک کے سفر میں اپنے سود و زیاں اور وسیلۂ اظہار کے مابین اور ڈکشن اور زاویۂ نظر کے درمیان مکمل ہم آہنگی قائم کر لی ہے۔ معاصر شعری منظر نامے میں یہی ان کی شناخت ہے اور اپنے ہم عصر شاعروں میں یہی ان کا امتیاز۔

Imagination Unchained

Twelve short poems of Shahryar Translated
from the Urdu by Salman Kureishy

Unspeakable word
(Harfe-na-guftanee)

As soon as evening faded, my eyes
Fashioned the contours of a sea
And into it set the night's raft a-sail
Placed you on one of its shores
And chained me to the other
And yet
For a long, long while
My lips planted
The unspeakable word
On your body

What is the harm if one dreams!
(Khwab ko dekhna kuch bura to naheen)

Dressed in clear sparkling white snow
Someone wanders the mountains in search of me
for whom I have waited for ages!
This hasn't happened, so it seems
What is the harm if one dreams?

Sneak softly in to my side
(Chupke se idhar aa jaao)

Through the doorway of life
Sneak softly in to my side
Give a gentle push
To this sack full of ice
Sprinkle kisses on every wound
Caress every laceration
I will parcel out to all and sundry
This star studded night
As if it was
My own birthright
Please don't decline
This plea of mine
Sneak softly in to my side

Speak memory!
(Mere haafze mera saath de)

From the edge of a roof's balcony
Someone stares at me constantly
Speak memory, Help me
Dispel this obscuring mist
Give some clues to her identity
So I may call her by her name

Communalism
(Firqa Parasti)

So many people
Half-insane!
Let my entreaties not be in vain

News Flash
(Taazah Khabar)

The animals are engaged in a fight
A new flash from the forest has just arrived
From the lips of my fellow citizens
Have issued tales of past migrations
Their vision has abandoned the earth and shifted to the sky
While the winds hysterically wail and cry
Oh, what have my ears and eyes treated me to!
A news flash from the forest has just arrived

The urge to speak the truth
(Sach bolne ki Khwahish)

For once, let this be done
Among those who speak the truth
Count me as one

In the vicinity of the body
(Badan ke aas paas)

Lips coated with sand, roses in hands
I hear the quivering whispers of a river's flow
This strange aura!
Whom do I feel in the vicinity of my body?

The pleasure of being awake!
(Jaagne ka lutf)

My lips locked onto yours
My hands
A weighing scale for your body
And the smell of gunpowder for along the domes
After a long time I enjoyed the pleasures of being awake!

Strange Pre-occupation
(Ajeeb Kaam)

To squeeze water out of sand
Is a strange pre-occupation
Which I have been doing with immense concentration

Another Prophecy
(Ek aur peshangoee)

Once again the birds will fly away from the thick cluster of trees
The leaves will clap again
Once again, the branches will wrestle with each other
And the bodies of martyred buds
Will once again be scattered by the wind.

Far above the earth
(Zameen se door)

From this celestial height, every part of the earth
Appears more breathtakingly beautiful
Than anything he had ever seen in his dreams
He would never descend to earth again!

چاند بنا پیراہن

امتیاز عالم (تالیف: مقالات)

اردو شاعری کا مستقبل جن جواں فکر اور جدت طراز شعراء سے منسوب ہونے کا آرزومند ہے اُن میں شہریار صاحب کا نام سرِفہرست درج ہونا چاہیے۔

(فیض احمد فیض)

شہریار صاحب کی شعری تراکیب‘ لفظیات‘ احساسات‘ تجربات اور مشاہدات اس قدر فکر انگیز ہیں کہ انھیں پڑھ کر دل و دماغ میں تازہ ہوا اور نئی روشنی کا احساس جاں گزیں ہونے لگتا ہے۔

(شان الحق حقی)

شہریار صاحب کی شعری اٹھان ابتداء سے اس امر کی گواہی دے رہی تھی کہ اردو شاعری کا مستقبل تابدار بھی ہے اور شاندار بھی۔ شہریار صاحب اپنی فکر اور وجدان کو جس ہنرمندی سے شعری قالب میں ڈھال رہے ہیں اس سے اردو شاعری کا اعتبار اور معیار بلند سے بلندتر ہو رہا ہے۔ شہریار صاحب کی شاعری اُن لوگوں کے لئے بھی آئینہ کا کام دے رہی ہے جو اردو شاعری بالخصوص غزل کو ازکار رفتہ گردان کر خوش ہو لیا کرتے ہیں۔

(احمد ندیم قاسمی)

شہریار ہمارے عہد کے نہایت معتقد اور سرکردہ شاعر ہیں۔ ان کا حساس ذہن‘ زندگی کی آرزوؤں اور امنگوں اور اس کی ناکامیوں اور محرومیوں دونوں کا یکساں عرفان رکھتی ہے۔ روحانی قربتوں اور فاصلوں کا جیسا حسی اظہار شہریار کے یہاں ملتا ہے وہ اردو کی نئی شاعری میں شاذ ہی ملے گا۔ اگر خواب کا در بند بھی ہو تو شہریار اُمید کی دیوار میں کوئی روزن نکال لیتے ہیں۔ وہ نیند کی کرچوں سے خوابوں کو لہولہان نہیں ہونے دیتے۔ ان کی شاعری اس سمندر کی طرح ہے جو اوپر پُرسکون دکھائی دیتا ہے لیکن جس کی گہرائی پُرشور طوفان کا پتہ دیتی ہیں۔ ان کے تازہ اور نئے موضوعات ہمارے عہد کی معنویت کو اجاگر کر رہے ہیں۔

(مظہر امام)

شہریار نے اپنی فکر کی طرح شعری علائم اور علامے بھی مستعار نہیں لئے۔ وہ نئی حسی تجربات کو چونکا دینے والے الفاظ میں نہیں بلکہ ہماری مانوس زبان میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان کے جذبے اور احساس کے کرب کی صداقت ہمارے دلوں میں اتر جاتی ہے اور ہمارے ذہن زندگی سے متنفر ہونے کے بجائے حسین خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی راہیں تلاش کرنے لگتے ہیں۔ یہ فن کا روپ ہوتا ہے جو زمان اور مکان کی قیود سے آزاد ہو جائے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ یہ فنکار عصری زندگی کے اثرات سے آزاد ہوا کرتا ہے۔ شہریار کے ہاں ایسے اشعار اور ایسی نظموں کی خاصی تعداد ہے جن میں زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہونے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔

(ڈاکٹر خلیق انجم)

ہاٹ کیک کی طرح بکنے والی کتاب "We can win" کا مصنف ہمیشہ خوش رہنے اور خوشی کا رشتہ انسانی رویے سے جوڑتے ہوئے لکھتا ہے کہ اگر آپ کا رویہ مثبت ہے تو آپ خود بھی خوش رہ سکتے ہیں اور دوسروں کو بھی خوش رکھ سکتے ہیں۔ ہنستا ہوا چہرہ ہنساتا ہے اور روتا ہوا چہرہ غمزدہ کرتا ہے۔ شو کھیرا کے اس نقطۂ نظر سے میں نے اپنے پاس اور دور کا جائزہ لیا تو مجھے اپنے آفاق میں محض ایک شخص سرخرو نظر آیا وہ شخص وہ عظیم انسان تھا جس کے رویے کی روشنی میں کتنے ہی بیڑے پار ہو چکے تھے۔ کتنی ہی کشتیاں کنارے لگ چکی تھیں۔ جو ایک شخص کی پریشانی‘ سینے کی جلن‘ سانسوں کی گھٹن‘ آنکھوں کے طوفان‘ ذہنوں کے ہیجان‘ چہروں کی بے چہرگی‘ دلوں کی اُداسی‘ مایوسی‘ افسردگی‘ تنہائی‘ رشتوں کی شکست و ریخت‘ قدروں کے زوال‘ زمانے کی بے حسی گویا پوری بیسویں صدی کے کرب کو اپنے سینے اور شعروں میں اتار کر اپنے دور کا مسیحا بن چکا ہے۔ جس نے اپنی تخلیقی تپش اور فنکارانہ ریاضت سے ذات‘ کائنات کی تسخیر کے لیے اسمِ اعظم دریافت کر لیا ہے اور ساتوں در کھولنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ وہ میرے مہربان‘ مربی اور دوست شہریار کے علاوہ اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

(غضنفر)

شہریار نے اپنے تجربے کے بیان Telling کے علاوہ اسے دکھانے showing کا خاص التزام رکھا ہے۔ یہی سبب ہے ان کے کلام میں بصری پیکروں کی بہتات نظر آتی ہے۔ تجربے کو خارجی ہیئت میں بیان کرنے کی غرض سے خواب کا استعارہ استعمال کیا ہے جسے علامتی استعارہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ بیشتر مقامات پر شہریار نے یہی التزام بھی رکھا ہے کہ اگر اس سے مماثل احساسات‘ جذبات اور ارتعاشات منصۂ شہود پر لاتے ہیں تو مذکورہ استعارے سے متعلق الفاظ ضرور استعمال کئے ہیں تاکہ کلام میں کسی نوع کے عدم ارتباط کا احساس ہو اور نہ قاری کے ذہن سے اس مخصوص تاثر کا نقش محو ہو سکے۔

(شافع قدوائی)

شہریار صاحب کو جناب شمس الرحمن فاروقی کے ذریعے "شب خون" اور زبیر رضوی صاحب کے "ذہنِ جدید" کے علاوہ بھی ہندوستان کے بہت سے مستند رسائل میں پڑھا ہے وہاں پاکستان کے رسائل میں کم کم چھپتے ہیں۔ قریب دو سال قبل عالمی اردو کانفرنس منعقدہ اسلام آباد کے موقع پر شہریار صاحب کو قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقع میسر رہا۔ شہریار صاحب کے بلیغ

کلام ہو، منفرد انداز نے مجھ سمیت قارئین کی بڑی تعداد کو بے حد متاثر کیا۔ شہریار صاحب Thought Provoking بات کرتے ہیں اور بڑے سلیقے سے کڑے سے کڑا سچ بولتے ہوئے بھی اُن کی جمالیاتی حس برسرِکار رہتی ہے۔ الفاظ کی صوتی حس سے آگاہی کے باعث اُن کی شاعری میں موسیقیت کی ایک لہر برابر چلتی رہتی ہے۔

(شبنم شکیل)

اسمِ اعظم سے خواب کا در بند ہے تک شہریار کا شعری سفر قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ان کا کلام فکر و احساس کی صداقت سے مملو نظر آتا ہے۔ ان کی لفظیات نئی اور پیکر تراشی میں اچھا پن پایا جاتا ہے۔ ان کی نظموں میں ایک عجیب غیر مرئی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ یہ کیفیت غیر محسوس طور پر قاری کو شاعر کے خوابوں کا شریک بنا رہی ہے۔

(تقی حسین جعفری)

اردو شاعری میں "شہریار" ایک منفرد اور معتبر آواز کا نام ہے۔ پچھلی چار دہائیوں میں شہریار نے جو شعری سفر طے کیا ہے وہ تجربے، اظہار، لفظ و معنی اور ہیئت و موضوع کی سطح پر ایک ایسی دنیا کا سفر ہے جسے شاعر نے خود تخلیق کیا ہے۔ آج جب اردو شاعری تقلید و تکرار اور یکسانیت کا شکار ہے، شہریار کی شاعری اپنی تخلیقی توانائی اور لسانی قوت کی بنا پر اپنی ایک الگ شناخت رکھتی ہے۔ شہریار کے اسلوب کی ایک بنیادی خوبی زبان کے امکانات سے واقفیت ہے۔ ان کے یہاں لفظ کے دہری علامتی، تمثیلی اور تخلیقی استعمال کی وہ پرتیں نظر آتی ہیں جو ان کی شاعری میں بے پناہ تخلیقی توانائی بھر دیتی ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ شہریار کی شخصیت، ان کا مزاج، ان کی افتادِ طبع اور ان کے تجربات و محسوسات کی نوعیت ہے۔ ان کے تجربات اس قدر حقیقی ہیں کہ ان کی جڑیں زندگی میں پیوست نظر آتی ہیں۔ شہریار کی تحریر کا آب و رنگ ان کے تجربات کے حقیقی رنگ کا عکاس ہے۔ تجربات کے اس حقیقی رنگ نے انھیں مقررہ سانچوں پر بنے بنائے راستوں سے باہر نکل جانے پر مجبور کیا ہے۔ انھوں نے زندگی، انسانی تہذیب اور کائنات کی تغیر پذیر حقیقت کو بخوبی سمجھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری تغیر پذیری کے بنیادی فلسفے میں زندگی کے آہنگ کو دریافت کرتی ہے۔

(رفاقی)

شہریار شاعروں کی اس نسل سے ہیں جنھوں نے اس صدی کی چھٹی دہائی میں آہستہ آہستہ اس نئے طرزِ احساس، طرزِ فکر، اندازِ بیان اور لہجے کو اپنانے کی کوشش کی اور آٹھویں دہائی کے اندر شہریار کا شمار ایسے شعرا میں ہونے لگا جنھیں وقت کی آواز کہا جا سکتا ہے۔ ان کی آواز خود بھی چوٹ کھائی ہوئی ہے اسی لئے دوسرے دلوں پر چوٹ لگاتی ہے۔ شہریار بھی اوروں کی طرح اپنے زخموں کی کتاب کھولے ہوئے ہیں مگر یہ زخم صرف ان کے اپنے ہیں۔ ان جیسے بہت سے نوجوان ذہنوں کے زخم ہیں۔ شہریار کا طرزِ فکر اور طرزِ بیان ہماری پرانی شاعری کی روایتوں سے مختلف ہے۔ شہریار اُن شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جن کے تجربات کو بہت سے بزرگ اب بھی "بدعت" سمجھتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ادب و شعر اس بدعت کے حق میں وقت کے صحیفے سے کئی جواز پیش کر سکتی ہے۔

(وحید اختر)

شہریار بڑا یار باش آدمی ہے۔ دوستوں کے لئے وہ سب کچھ کرنے کو تیار رہتا ہے جو اس کے بس میں ہو۔ کبھی کبھی شہریار کی گرمجوشی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ دوست پیچھے رہ جاتے ہیں شہریار آگے بہت آگے نکل جاتا ہے۔ شہریار نے اپنی ذات کے لئے کبھی لڑائی نہیں کی۔ شہریار کی ساری جنگیں دوستی اور لڑائی دوستوں کے لئے ہی مخصوص کی ہوئی ہے۔ محبت، خلوص، رفاقت، بے نیازی اور شاہ خرچی کا اگر کوئی نام ہو سکتا ہے تو وہ شہریار صرف شہریار ہی ہو سکتا ہے۔

(عوض سعید)

شہریار کو میں بہ زعم خود اپنا عزیز ترین دوست سمجھتا ہوں۔ ان کے یہاں جنریشن گیپ نام کی کوئی چیز سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ میری مشکل یہ ہے کہ میرے والد محترم کو بھی شہریار سے دوستی کا اتنا ہی دعویٰ تھا جتنا مجھ کو ہے۔ میرا بیٹا بھی عمر کی اس سیڑھی پر ہے جہاں سے ایک قدم آگے بڑھ جانے کے بعد شہریار صاحب کے دوستوں کی صف میں کھڑا نظر آئے گا۔

(افتخار عالم)

جدید غزل کی نمائندہ آوازوں میں شہریار کی حیثیت آج کے تناظر میں مرکزی کہی جا سکتی ہے۔ اس مرکزیت کی بنیاد محض اس بات پر نہیں ہے کہ ان کا تخلیقی سفر طویل عرصہ گزر جانے کے بعد آج بھی جاری ہے بلکہ اس بات پر بھی ہے کہ ان کے یہاں اظہار کی یکسانیت کے بجائے فکر و احساس کی سطح پر مسلسل آگے بڑھتے ہوئے نئے ابعاد تلاش کرنے کا رجحان اب بھی نمایاں ہے۔ اس عمل میں جو بات سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ان کے یہاں فنی تقاضوں کی بھرپور پابندی ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں بیشتر شعرا کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ ترقی پسندوں اور آج کے بہت سے شعرا کی ناکامی کا ایک سبب یہی کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے فن کے تقاضوں کو قابلِ لحاظ اہمیت نہیں دی۔

(احمد محفوظ)

شہریار کی شخصیت کی طرح ان کی شاعری سے بھی قاری کا پہلا تصادم اپنے اندر ایک ابہام و اسرار کی کیفیت رکھتا ہے۔ اردو شعر و ادب کے بہترین ذہنوں نے اپنے بہترین کلمات شہریار صاحب کے فن کی تفہیم و تحسین میں صرف کئے ہیں جس کے باعث شہریار شناسی کا خوبصورت عکس ہمارے ذہنی لطف و لذت کا سامان مہیا کرتا ہے۔

(امتیاز احمد)

بُوڑھا اور نل

شمشاد احمد

غسل خانے کا دروازہ کھولا۔ اس عمر میں آنا جانا لگا ہی رہتا ہے۔
ایک قطرہ نل کے منہ پر بیٹھا تھا جسے میں دیکھتے ہی پھسل کر ٹپ سے نیچے رکھے لوٹے میں گرا......

بڑھاپے میں تقریباً سبھی حواس کمزور ہو جاتے ہیں لیکن اعصاب چھوٹی چھوٹی باتوں پر کچے شیشے کی طرح تڑخ اٹھتے ہیں۔

دوسرا قطرہ گرا اور میری سفاچٹ کھوپڑی میں سوراخ کرتا ہوا دماغ میں گھنٹے کی طرح بجنے لگا۔ میں نے جلدی سے جھک کر ٹونٹی کو کسا اور اکڑی ہوئی کمر دونوں ہاتھوں میں دبا کر انتظار کرنے لگا۔ کون کہتا ہے انتظار کی گھڑیاں لمبی ہوتی ہیں! پلک جھپکنے پایا تھا کہ ایک اور قطرہ چل پڑا۔ میں نے غسل خانے کا دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی اور کمرے میں آگے پیچھے ٹہلنا شروع کر دیا۔

’اس عذاب سے نجات پانے کے لئے پلمبر کو بلانا ہوگا‘

پلمبر کا سوچتے ہی ذہن کا ایک اور دروازہ کھل گیا۔

’ایک واشر ڈالنے آئے گا.... منہ میں چہل قدمی کرتے پان کی تھوک کم از کم دو جگہ تھوکے گا اور پھر منہ کا گولا بنا کر پورے سو روپے کی مانگ کرے گا.... میرے بس میں ہو تو شہر کے سارے پلمبروں کو ایک قطار میں کھڑا کر کے کلاشنکوف سے اڑا دوں۔‘

کسی زمانے میں نامی گرامی لوگ لوٹ مار کیا کرتے تھے، ڈاکے ڈالتے تھے اور اب..... بھنگی چماروں تک نے یہ پیشہ اپنا لیا ہے.... ہر کسی کا منہ جبڑوں تک پھٹا ہوا ہے.... اللہ جانے یہ آدم زاد ہیں یا بھیڑیے کی اولاد.....

گھر میں میرے سوا کسی کو سائل دکھائی دیتے ہیں نہ سنائی دیتے ہیں... کسی کے پاس وقت ہی نہیں... نجانے یہ وقت کہاں چھپ گیا ہے..... عجب ہے!

کافی سوچ بچار کے بعد آہستہ آہستہ مسئلے کا حل سوجھنے لگا....

میری چہل قدمی کی رفتار میں کمی آنے لگی۔

دسیوں بار پلمبر کو نل کا واشر بدلتے دیکھا تھا.... کوئی ایسا مشکل کام تو نہ تھا.... ٹونٹی کا اوپری حصہ کھولا، پرانا واشر نکالا، نیا چڑھایا اور ٹونٹی واپس بند...

بیگم کو آواز لگائی۔

"صفائی کے بہانے ہر شے الٹ پلٹ کر رکھ دیتی ہو.... گھنٹے بھر سے ٹوپی تلاش کر رہا ہوں۔"

بیگم پسینے میں شرابور کہیں سے برآمد ہوئیں، تکیے کے نیچے سے ٹوپی نکال کر جھکے ہوئے ہاتھ پر ماری اور ناک بھوئیں اور ماتھا سکیڑتی ہوئی یہ جا وہ جا....

میں نے پچکی ہوئی ٹوپی کو تھپکی دے کر زندہ کیا.... شیڈ والی سائڈ پیچھے کی اور سر پر جمالی۔

ابھی کمرے سے قدم باہر رکھا تھا کہ بیگم کی چنگھاڑ سنائی دی۔

"باہر جا رہے ہو تو چائے لیتے جانا.... واپسی میں گھنٹیاں بجا بجا کر ناک میں دم کر دو گے۔"

میں بیگم سے بالکل نہیں ڈرتا.... لیکن اس وقت الجھ پڑتا تو نل کا مسئلہ رہ جاتا۔

کوئی گیارہ کا عمل تھا... تیز دھوپ اور اس میں گیلی نمی نے ابھی سے گلی کا جسم جلا رکھا تھا..... موڑ تک پہنچتے پہنچتے ہر عضو اندر باہر پسینہ پسینہ ہو گیا.... لیکن میں ہمت ہارنے کے موڈ میں نہ تھا۔

ذرا سا بوڑھا ہوں.... بلڈ پریشر تھوڑا سا دکھاتا رہتا ہے.... کبھی شوگر منہ زور ہو جاتی ہے.... چلو ہاتھ پاؤں تو چل رہے ہیں... اس عمر میں یہ بھی غنیمت ہے۔

سینٹری سٹور پر ایک دہشت ناک مشٹنڈا بیٹھا تھا۔

داڑھی سنت رسول ہے..... کئی بار سوچا کہ رکھ لی جائے..... لیکن خواہ مخواہ شک میں دھر لیے جانے کے خوف سے اس نعمت سے محروم ہوں۔

دکاندار سے اپنا مدعا بیان کیا۔

اس نے کچھ تفصیلات پوچھنے کے بعد ایک کی بجائے دو عدد واشر میز پر ڈال دیئے۔

"ایک روپے کے دو ہیں، دونوں لے جاؤ... اٹھنی اب لین دین میں نہیں رہی... چونی کے پیچھے چل دی ہے۔"

ساتھ ہی اُس نے میری دکھتی رگ پر گھونسہ مارا۔

"پلمبر نہیں چاہئے؟"

"نہیں....." میں نے خاصی بے رخی سے جواب دیا۔

اب ایک نیا مسئلہ جھنڈا لہرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ٹونٹی کھولو گے کس چیز سے؟ ہاتھ سے؟"

میں نے پلمبر کو رنچ استعمال کرتے دیکھا تھا... فوراً طے کر لیا کہ رنچ خرید لیا جائے..... آخر ہمیں بھی اب چھوٹے موٹے کام خود ہی کرنے ہوں گے..... چلتے گھر میں نل بگڑتے ہی رہتے ہیں۔

مجھے پھر سے دکاندار کی طرف رجوع کرنا پڑا۔

اس کی آنکھوں میں سے تبسم کا طنزیہ زہر تھا.... میں نے سہہ لیا۔

خاصی بحث مباحثے کے بعد بھی اُس نے ایک پیسے کی کمی کرنے سے بھی انکار کر دیا اور مجھے رنچ پورے سو روپے میں خریدنا پڑا.....

واپسی پر موسم کی بے رخی کے باوجود میرے پاؤں خاصے تیز تیز اُٹھ رہے تھے اور میرے گھٹنے کے پرانے درد نے بھی میری ہمت کو دیکھ کر چپ سادھ لی تھی۔

میں نے لالچی پلمبروں کو شکست فاش دینے کا تہیہ کر لیا تھا اور ابھی تک اس سلسلے میں کامیاب جا رہا تھا۔

میں نے بیگم کو متوجہ کیے بغیر باہر کا دروازہ کھولا اور سیدھا غسل خانے کی طرف لپکا۔

ٹپ.... ٹپ.... قطرے اپنی دھن میں گرے جا رہے تھے... لوٹا بھر چکا تھا۔

میرا ایک کھلا قہقہہ لگانے کو جی چاہا لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

"مکمل فتح سے پہلے جشن منانا مناسب نہیں۔"

رنچ کو ٹونٹی پر رکھ کر ایڈجسٹ (Adjust) کیا.... پھر زور دے کر الٹی طرف گھمایا... ٹونٹی لٹو کی طرح پھسل کر گھوم گئی.... میرے اندر ہر طرف خوشی کی لہریں سرسرانے لگیں... فتح کا احساس عجیب ہوتا ہے۔

'ایک چکر اور.... ایک اور.....'

ٹونٹی ڈھیلی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی چاروں طرف سے پانی کی بے تاب دھاریں پھوٹ پڑیں..... میرا چہرہ، میرا چشمہ .... سب کچھ نہا گیا۔

جلدی سے ٹونٹی کو واپس گھما کر دھاروں کو روکا.... پھر چشمہ اُتار کر اوپر شیلف پر رکھا.... منہ پر ہاتھ پھیرا.... بھیگے شلوار قمیض پر ایک نظر ڈالی..... اور پھر اپنے آپ کو تسلی دی۔

"جنگوں میں دشمن کے ساتھ اپنا بھی نقصان ہوتا ہے.... کپڑے سوکھ جائیں گے"

اب ہر شے سے بے نیاز میں نے رنچ کو چکر دینے شروع کر دیے۔

دھاریں پھوٹیں، زاویے بدل بدل کر وار ہوئے .... لیکن میں چکر پہ چکر دیتا چلا گیا۔

ٹونٹی کا اوپری حصہ میرے ہاتھ میں آ گیا.... اور اس کے ساتھ ہی نچلے حصے سے ایک طوفانی دھارا نکلی اور چھت پر چلنے لگی۔

میں نے جلدی سے ٹونٹی پر ہتھیلی رکھ دی۔

اچانک امن و امان کی فضا لوٹ آئی.... ساری دنیا میرے قابو میں تھی۔

چھت سے بوندیں میرے اوپر گر رہی تھیں اور میں ٹونٹی پر ہتھیلی جمائے سوچ رہا تھا کہ اگلا قدم کیا ہونا چاہئے۔

بیگم سے مدد مانگنا ضروری ہو گیا.... آخر انسان اپنوں سے مدد مانگتا ہی ہے.... اور گھر میں میرے اور اس کے سوا کوئی تھا بھی نہیں.... بڑے اپنے کام سے اور بچے سکول کالج جا چکے تھے۔

"بیگم..... بیگم....."

جانے ہماری آواز میں کیا تھا کہ بیگم سرپٹ دوڑتی چلی آئیں۔

اس کے چہرے پر خوف اور کسی انہونی کے آثار تھے۔

وہ ہمیں اس حال میں دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ ہمیں یقین ہو گیا کہ ابھی بھی اس بڑھاپے میں بھی بیگم کے دل کے کسی کونے میں ہماری محبت کی شمع روشن ہے۔

میں نے اُسے بولنے کا موقع نہ دیا۔

"جلدی کرو.... کوئی پرانا کپڑا لے آؤ.... اس 'سپاہی' کو بڑی مشکل سے روکے ہوئے ہوں۔"

بیگم کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی... اللہ تعالیٰ ہر کسی کو ایسی مسکراہٹ سے محفوظ رکھے۔

"ایسے ہی بیٹھے رہو.... کتنے اچھے لگ رہے ہو۔"

پھر وہ ہماری ہی کوئی پرانی بنیان جو جھاڑ پونچھ میں استعمال ہو رہی

تھی اٹھا لائی۔

میں نے تھیلی سرکائی اور جلدی سے بنیان کا ایک کونہ ٹونٹی پر رکھا اور پہلے انگلی سے اور پھر ساری انگلیوں کی مدد سے بنیان ٹونٹی میں ٹھونسنے لگا۔

سُوا ہی رُک گیا۔

پلٹ کر بیگم سے داد لینا چاہی... وہ غائب ہو چکی تھی۔

پرانے واشر کو الگ کیا.... انگلی اور انگوٹھے سے دبا کر اس کی جگہ نیا واشر ڈال دیا۔

بس اب صرف ایک مشکل مرحلہ رہ گیا تھا.... ٹونٹی میں سے بنیان کھینچ کر اس پر اوپر والا حصہ جمانا تھا۔

بھیگوں گا؟ بھیگ تو چکا ہوں اب کس بات کی فکر.... آخر پانی ہی ہے اور وہ بھی صاف... کپڑا کھینچا اور سنبھال کر اوپری حصہ ٹونٹی پر رکھا اور ہاتھ سے چکر دینے شروع کر دیئے۔ طوفان آئے، زلزلے آئے.... میں ریچ گھماتا چلا گیا۔

آہستہ آہستہ پانی کا زور ٹوٹنے لگا اور پھر اس کی بغاوت مکمل طور پر سرد پڑ گئی۔

میں نے اب ایک زوردار قہقہہ لگایا.... مجھے یہ حق مل گیا تھا۔

بیگم نے ضرور سنا ہوگا لیکن کوئی ردِعمل نہ ہوا۔

بار بار ٹونٹی کھولی بند کی... مجال ہے قطرہ بھی ٹپکے.... اپنی کھوپڑی کسی اونچے پہاڑ کی وادی میں واقع جھیل کی طرح پرسکون تھی۔

بچا ہوا واشر اور ریچ ایک پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال کر آئندہ کے لیے محفوظ کر لیا... پنکھا کھول کر گیلا گیلا ہی نیچے چل کر لیٹ گیا.... ہوا مزہ دے رہی تھی۔

بیگم پر سے کھوج میں تھی.... احوال جاننے کے لئے تیزی تیزی چلتی آ نکلی۔

میں نے اُسے دیکھتے ہی رعب جمایا۔

"ذرا غسل خانے کا نل کھول کر دیکھو.... تیرے پیسے بچائے ہیں اور پلمبر کے بچے سے بھی ہمیشہ کے لئے نجات مل گئی ہے۔"

بیگم کو میری کسی بات پر کبھی اعتبار نہیں ہوا۔

اُس نے اندر جا کر نل کھولا بند کیا.... پھر کھولا بند کیا.... اور مجھے حیرانی سے دیکھنے لگی۔

"زندگی میں پہلی بار تم نے کوئی کام ڈھنگ سے کیا ہے... پچھلے مہینے باورچی خانے میں جو نل کا بٹن لگایا تھا ابھی تک اُلٹا ہی چلا رہی ہوں۔"

مجھے کوئی پرواہ نہ تھی.... بیگم سے کراہت اور تعریف کے معاملے میں ہمیشہ سے کنجوس واقع ہوئی ہے.... لیکن ایک طویل شادی شدہ زندگی گزارنے کے بعد اس کے جذبات کا کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا ہے۔

میں اپنی فتح کا جشن منا رہا تھا۔

اچانک گھنٹی بجی، مجھے اُٹھنا پڑا۔

دروازہ کھولا.... میرا بڑا صاحبزادہ کھڑا تھا اور..... اور اس کے پیچھے ایک بدمعاش قسم کا پلمبر تھا....

میں نے اُس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھیلے سے اُسے پہچان لیا۔

میں نے اُسے خطرناک نگاہوں پر رکھ لیا۔

میرا صاحبزادہ بول رہا تھا۔

"ابا جان..... میں نے صبح ٹپکتا نل دیکھ لیا تھا... آپ چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہو جاتے ہیں.... دفتر میں فرصت تھی میں نے سوچا نل ٹھیک کروا دوں... پلمبر لیتا آیا ہوں۔"

میری ہنسی چھوٹ گئی... پلمبر اور صاحبزادہ مجھے حیرانی سے تکے جا رہے تھے۔

میں نے دونوں کو جھڑکا دیا۔

"نل میں نے خود ٹھیک کر لیا ہے.... اب پلمبر کی ضرورت نہیں۔"

صاحبزادہ جلدی سے اندر گیا.... نل کو کھول بند کر کے دیکھا ہوگا۔

"ابا جان نے واقعی نل ٹھیک کر لیا ہے.... اب تمہاری ضرورت نہیں۔"

پلمبر کی آنکھیں مجھ پر نفرت تھوکنے لگیں.... میں مزہ لے رہا تھا۔

میرے صاحبزادے نے جیب سے سو کا نوٹ نکال کر پلمبر کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ لو اپنی فیس...."

پلمبر نے نوٹ اُچک لیا اور مجھ پر طنز اور نفرت کے دہکتے انگارے پھینکتا ہوا چل دیا۔

میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ بدمعاشوں اور لٹیروں سے جیتنا اتنا آسان نہیں ہے۔

پھر میں نے اپنے آپ کو تسلی دی۔

"کوئی بات نہیں.... دیئر از آلویز اے نیکسٹ ٹائم (There is always a next time) اگلی بار میں ہی جیتوں گا۔"

☆

آخری مکالمہ

جمیل احمد عدیل

مسٹر خان رنگین مزاج محض مشہور ہی نہیں تھے بلکہ اس مخصوص شہرت کے عقب میں ان کی روشن رنگ اُفتادِ طبع کا تفاخر مکمل طور پر جلوہ افروز بھی تھا۔ عمر موصوف کی بچپن برس کی تھی پر اسالیبِ عشق فسق بچپن سے ہی ان کے ہمسفر تھے۔ جوش ملیح آبادی نے "یادوں کی برات" میں اپنے شمار معدود معاشقوں کا اعتراف کر کے خوامخواہ ہی ایک سوال لی ہے جبکہ مسٹر خان کا خاص وصف یہ تھا کہ مدت العمر کبھی مان کر نہیں دیئے، بہانے لاتے تھے کہ ایک عورت کی موجودگی میں دوسری عورت کا ذکر، سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ زبان پر آجائے۔ جیسے اس کے سوا دنیا میں کوئی دوسری عورت سرے سے موجود ہی نہیں..... اب اللہ جانے انہوں نے کسی خفیہ ڈائری میں روسو کے تتبع میں "اعترافات" کی تفصیل رقم کر رکھی ہے یا نہیں؟ تاہم اپنی معاملہ بندی کے معاملات تو رقم کر چکے ہیں تو وہ حکایت بالتفصیل لذیذ تر ہی ہوگی کیونکہ ان کی مذکورہ بالا (خانہ) شہرت اپنی رنگینی کے حوالے سے خاصی مزیدار ہے۔ ہر چند کسی کے پاس جزئیات کا اثاثہ موجود نہیں کہ وہ انہیں مرتب کر کے کوئی باقاعدہ کہانی مکمل کر سکے۔ ہیرو نچا ہوں میں جو بھی میسر ہے وہ دلکش ہی ہے اور دلکشا بھی بلکہ یوں کہئے کہ ہر پارہ اپنی جگہ مہا پارہ ہے۔

اس صبح مسٹر خان خلافِ معمول کچھ زیادہ ہی جلد بیدار ہو گئے درآں حالیکہ وہ رات کو کافی دیر سے سوئے تھے۔ یوں اس بہانے انہیں عبادتِ صبح کی سعادت بھی نصیب ہو گئی۔ واضح رہے ان کی کل عبادت دن کی ساعت تک محدود ہوا کرتی تھی۔ دراصل اس روز انہیں اپنی نئی نکور پرائیویٹ سیکرٹری کے ساتھ دفتر سے "کہیں" جانا تھا۔ اب آپ ہم سے اس "مقام کہیں" کے تعینات کا مطالبہ نہ کیجئے گا کہ یہ "کہیں" غالباً اس لامکاں میں واقع ہوتا ہے جس کی بابت غالب بھی بس اتنا ہی بتا پائے تھے کہ:

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی!

مسٹر خان کی اہلیہ بڑی خوش بخت تھیں کہ ازدواجی زندگی کے پہلے برس ہی اپنے حصے کی محبت کاٹ کر بھی دنیا میں ہی سرخرو ہو کر "2Z" کا حساب برابر کر کے ملاءِ اعلیٰ میں جا پہنچیں ورنہ ہر دو وجوہ بعد اپنے شریکِ حیات کی معیت میں کسی نئی شہرہ ور کو دیکھنا بھلا کوئی سہل امر ہے؟ اگر بالفرض وہ جیتی رہتیں تو یقیناً جیتے جی مر جاتیں۔ قدرت کا قدرت مہربان تھی کہ سو انہیں ساحت طولانی میں بڑی مناسب سی رہائش الاٹ کر دی گئی اور یوں ان کے خدا اور مجازی خدا کے بیچ کارِ جہاں کی درازی بصورتِ حجاب حائل ہو گئی۔ مطلب یہ کہ مسٹر خان اپنی زندگی کو عمر دراز سمجھنے کے دھوکے میں گرفتار ہو گئے۔ یوں ان کا مقصدِ حیات مہ طلعتوں کی خم دار زلفوں میں اسیر ہونا قرار پا گیا۔ مگر مسٹر خان کی طبع میں ہموزہ قرار نام کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ چوٹیوں کو سر کرنے کے بعد نئی چوٹیوں کی تلاش میں نکل نکلتے تا کہ ذوقِ کوہ پیمائی کا چاؤ کہیں ماند نہ پڑ جائے۔

اس روز ان کی صبح کاذب کے سمے بیداری کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ انہیں اپنے بال ڈائی کرنے تھے۔ اگر وہ اپنے ہم مرتبہ اکثر افسروں کی طرح "فارغ البال" ہو چکے ہوتے تو وہ کالا سر کالا کرنے کے جھنجھٹ سے آزاد ہو جاتے لیکن معلوم ہوتا ہے جیسے یاجوج ماجوج کو دیوار چاٹتے رہنے کی سزا ملی ہوئی ہے اسی طرح اوپر والے نے بطور سزا مسٹر خان کے بالوں کی جڑیں مضبوط رکھیں تا کہ ہر ہفتے وہ ان کی سفیدی کو سیاہی میں بدلتے رہیں۔ ویسے مسٹر خان تھے بڑے مستقل مزاج کہ اپنے دل، بال اور اعمال بھی اس حیثیت کی تسوید میں کبھی کوتاہی کے مرتکب نہیں ہوئے بالکل اسی طرح جیسے اپنے خون کو مسلسل سفید رکھنے میں ان سے کبھی غفلت نہیں ہوئی۔

جی ہاں صاحبو! اس روز بھی مسٹر خان نے اپنے باطن سے ہی کہیں سیاہی مستعار لی ہوگی جو تبتی کی چمکدار پیالی میں انہوں نے بڑے اعتماد سے گھولی اور "ابھی تو میں جوان ہوں" گنگناتے ہوئے نہایت حزم و احتیاط اور نفاست سے بذریعہ برش سر پر منتقل کرنا شروع کر دی۔ وہ اس دوران بار بار دیوار پر آویزاں کلاک کی جانب بھی دیکھ رہے تھے کہ انہیں اپنے نئے ہدف تک جلد از جلد پہنچنے کی تمنا تھی شاید اس لئے بھی کہ ان کا تازہ شکار کچھ زیادہ ہی دلربا تھا۔ غسل کے بعد مسٹر خان نے خوب رگڑ رگڑ کر شیو بنائی۔ داہنی آنکھ میں اترنے والے سفید موتیے کو محجوب کرنے کے لئے نہایت قیمتی ڈیزائنر گولڈن فریم والا چشمہ ناک کی اٹھان کی مدد سے چہرے پر بٹھایا اور اس کی کمانیوں سے جھولنے والی نازک زریں طلائی زنجیر کو ہاتھ سے چھو کر انہوں نے اس زرد دھات کے لمس کا سرور انگیز لطف لیا۔

مسٹر خان نے بینٹ مانگی کی سفید شرٹ پر مہرون ٹائی باندھتے ہوئے کنٹراسٹ کو بہت سراہا۔ پھر گہرے نیلے کا سوٹ زیبِ تن کر کے انہیں اپنی شخصیت کے مزید باوقار ہونے پر اعتبار آگیا۔ فائنل ٹچ کے بعد اب وہ جا رہا کہ کی سرکاری گاڑی میں قدم رکھنے ہی والے تھے کہ اچانک ان کے موبائل فون سے گھنٹی کی صدا برآمد ہوئی۔ پیغام رساں نے یہ بری خبر سنائی کہ ان کے ضعیف والد پر فالج کا حملہ ہو گیا ہے چنانچہ فوراً بیری کی چوہدرانہ پہنچیں۔ اس گھڑی مسٹر خان کو یوں محسوس ہوا کہ اس باپ کے گھر پیدا ہو کر انہوں نے بہت بڑی غلطی کی ہے

غلطی کیا گیا؟ کیا ہے اور اس گیا کا "کفارہ" انہوں نے یوں ادا کیا کہ جواباً اس فون کرنے والے کے کان میں برف کی سی قاش رکھ دی: "بے حد اہم میٹنگ میں جا رہا ہوں آپ لوگ انہیں فی الحال وغیرہ دیں میں دفتر سے واپسی پر رابطہ کرنے کی کوشش کروں گا OK۔"

لیجئے جناب مسٹر خان نے خود گاڑی ڈرائیو کی اور اس عزم سے دفتر کی جانب روانہ ہوئے کہ آنے والے پورے ہفتے میں اس تصور سے لطف اندوز ہوا جائے کہ کس کمال سے ڈیوٹی کو ذہنیت میں بدلا ہے۔ ان کا جی چاہتا تھا وہ سٹیئرنگ کو چھوڑ کر خود کو تھپکی دیں یعنی باقاعدہ داد دیں۔ نیز وہ میوزک سے دل بہلاتے ہوئے اور کچی سڑکوں پر موڑ کاٹتے اپنے دفتر کے عین سامنے جا کر رکے ہی تھے انہوں نے ایک قدم ہی باہر رکھا تھا کہ ان کے ہم عمر کولیگ انتہائی بوکھلاہٹ کے عالم میں لڑکھڑاتے ہوئے ان کی طرف بڑھے اور اپنے سینے کو دونوں ہاتھوں سے بھینچتے ہوئے بڑی مشکل سے بولے مسٹر خان! مجھے ہسپتال لے چلو میں مر رہا ہوں۔ وہ میرے خدا یہ کیا مصیبت نازل ہو گئی؟ وہ اندر ہی اندر بل کھا کر رہ گئے ہوں گے لیکن کسی غیر اختیاری قوت کے سہارے انہوں نے اپنے بے حال کولیگ کو آسرا دیا اپنی گاڑی میں بٹھایا۔ تیزی سے گاڑی ریورس کی اور ہسپتال کی جانب چل پڑے۔ مسٹر خان کو اس سے پہلے رنگ میں بھنگ کا حقیقی مفہوم شاید کبھی سمجھ نہ آیا ہوگا۔ کبھی وہ سامنے گھڑی پر نظر ڈالتے، کبھی وہ دل کے دورے کی زد میں کراہتے ہوئے دوست کے سیاہی مائل زرد مگر پسینے میں شرابور کرب چہرے کی جانب نظر کرتے، کبھی ان کے آئینہ ابصار میں بائیس سالہ پرائیویٹ سیکریٹری کا شوخ سراپا گردش کرنے لگتا۔ ان کا جی بار بار چاہا کہ گاڑی روکیں اور دروازہ کھول کر اس مظلوم ساتھی کو نیچے اتار دیں کہ شاید اس طرح اس کی بھی مشکل آسان ہو جائے مگر اس کی مشکل آسان کرنے کے لئے گاڑی کا روکنا کچھ ضروری نہیں تھا، یہ کام زیادہ احسن انداز میں چلتی گاڑی سے انجام دیا جا سکتا تھا لیکن ظاہر ہے یہ مسٹر خان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس سوچ کو یا پھر محض ان کے غصے کا ایک اظہار ہی تھی۔ خدا خدا کر کے ہسپتال پہنچے پہلے ایمرجنسی وارڈ میں رجوع ہوئے ڈاکٹروں نے ایک لمحے کی تاخیر کئے بغیر نسخے کے طور پر چند ادویات اور وہی Strepto Kinase کی مشہور زمانہ چار پانچ ہزار روپے کا انجکشن لکھا اور مسٹر خان کو تھماتے ہوئے "حکم" صادر کیا جلدی فی الفور لے آئیں کہ اٹیک بہت شدید ہے۔ مسٹر خان ٹپٹا گئے کہ ان کا خیال تھا ہسپتال پہنچتے ہی وہ اس "بیمار" کے گھر فون کر دیں گے جیسے ہی کوئی متعلقہ فرد پہنچا وہ بھاگ جائیں گے لیکن ایک تو انہیں اس کے گھر کا فون نمبر نہیں ملا کیونکہ وہ بے چارہ اس قدر کرب کے عالم میں تھا کہ فون نمبر بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھا، دوسرے اس کی جیب سے ڈائری مسٹر خان کو نہیں مل رہی تھی جو ان کی رہنمائی کرتی۔

بہر طور آخری "ترقی" کے طور پر انہوں نے اس "مصیبت خانے" کی تلاشی لی مسٹر خان کے ہاتھ میں ننھی منی سی ڈائری کیا لگی جیسے دنیا کی بہت بڑی دولت مل گئی ہو۔

اب منظر نامہ کچھ یہ تھا کہ مسٹر خان کے ایک ہاتھ میں نسخہ تھا اور وہ سرعت سے میڈیکل سٹور کی طرف بڑھ رہے تھے اور دوسرے ہاتھ کی انگلیاں اس کے گھر کا نمبر ڈائل کر رہی تھیں۔ مگر کوئی کمبخت اُدھر سے فون اٹھا ہی نہیں رہا تھا۔ ادویات کی خریداری اور واپسی تک مسٹر خان نے کوئی سات مرتبہ وہ نمبر ری ڈائل کیا مگر دوسری طرف سے کسی نے اٹینڈ نہیں کیا۔ ایمرجنسی میں قدم رکھتے ہی ڈاکٹروں نے یہ مژدہ سنایا: مریض کو فوراً کارڈیالوجی وارڈ شفٹ کرنا ہے ہماری ایمبولینس خراب ہے آپ انہیں اپنی گاڑی میں ڈالیں پلیز دیر نہ کریں۔

مسٹر خان کا غصہ دیدنی تھا۔ مگر طوعاً و کرہاً انہوں نے اس عذاب کو کار میں رکھا اور ہسپتال کی سڑکوں پر پہیوں کو گردش دیتے ہوئے شعبہ امراض قلب کے صدر دروازے کے سامنے جا بریک لگائی۔ اس دوران میں انجکشن چونکہ ڈاکٹروں نے لگا دیا تھا اس لیے مریض قدرے پرسکون تھا۔

سٹریچر کو دو وارڈ بوائز نے تھاما اور مسٹر خان سوچنے لگے کہ وہ کیا کریں؟ ان پر سب سے زیادہ جھنجھلاہٹ اس سبب سے طاری تھی کہ اب بھلا بھی کیا ہوا کہ گھر میں کوئی بندہ بشر ہی نہیں ہے بھلا آج کے دور میں اتنا بھی بار حسن ضروری نہیں ہے کہ اگر ہارٹ اٹیک آ جائے تو کیا کیا جائے؟ یار ایک آدھ تیماردار تو پاس ہونا چاہئے۔ جیب میں پندرہ بیس ہزار روپے لے کر گھر سے نکلنا چاہئے تاکہ سیدھا موت کے منہ میں جانے سے کسی طرح روکا جائے.... مگر میری شوئی قسمت کہ کہاں ان ساعتوں میں مجھے معطر زلفوں سے مشام جاں کو معطر کرنا تھا اور کہاں بچا کھچا پیو ماغ کو جھڑ دی ہے کہاں ان گھڑیوں میں میرے سامنے تازہ پھولوں کا گلدان سجا ہوا تھا اور کہاں یہ خون آلود گاڑی جس میں یہ اچانک نازل ہونے والی آفت قے کر رہی ہے کہاں اس مکھن سے میری آنکھوں نے سیراب ہونا تھا، کہاں اس سفید بالوں سے بھرے ناک والے بڈھا مریض کو دیکھنا پڑ رہا ہے جس کے نتھنے آکسیجن کی نالیاں لگنے کی وجہ سے مزید کھل گئے ہیں۔

مریض کو ذرا ہوش آیا تو مسٹر خان نے بڑی بے تابی سے پوچھا کیوں حضرت! آپ کے گھر میں کیا کوئی نہیں ہے؟.... وہ بڑی مشکل سے بولا: تم تو جانتے ہو میں مجرد زندگی گزار رہا ہوں، رونے والا نہ کوئی رونے والی....!

صاحبو! کہنے والے کہتے ہیں مسٹر خان کا اپنے آپ سے یہ آخری مکالمہ تھا۔

☆

سنتا کی گوری

دیپک کنول

سنتا کا پورا نام سنتوکھ سنگھ تھا پر پاس پڑوس ناطے رشتہ دار اُسے سنتا کے نام سے ہی جانتے تھے۔ سنتا جموں کے چاند پور گاؤں میں اپنے چھوٹے سے پریوار کے ساتھ رہتا تھا۔ اُس کا خاندان بہت ہی چھوٹا تھا۔ بیوی پریت کور تھی بیٹا جتا سنگھ تھا جو ابھی تک بالی عمر میں تھا ایک سات سال کی بچی تھی راتو جو سنتا سنگھ کی آنکھ کا تارا تھی۔ ان کے علاوہ چاچی پریتم کور تھی جو لاولد تھی۔ وہ سنتا کو ہی اپنا بیٹا مانتی تھی۔ پریتم کور کافی ضعیف ہو چکی تھی۔ اُس کے شوہر پریم سنگھ کی دس سال پہلے گولی لگنے سے موت ہوئی تھی' جب سے سنتا سنگھ اپنی چاچی کی تن من سے سیوا کر رہا تھا۔

دراصل سنتا کا گھر لائن آف کنٹرول سے بالکل سٹا ہوا تھا۔ بس یوں سمجھیے کہ یہ گاؤں سرحد سے چار ہاتھ کے فاصلے پر تھا۔ سرحد پر رہنا کتنا خطرناک ہوتا ہے اس کا ثبوت وہ گولیوں کے نشان تھے جو اس چھوٹے سے گاؤں کے ہر مکان پر چیچک کے بدنما داغوں کی طرح نمایاں تھے۔ آئے دن کی گولے باری نے اب تک کئی جانیں نگل لی تھیں۔ پریم سنگھ بھی اسی گولہ باری کا اس وقت شکار ہوا جب وہ اپنے کھیتوں پر کام کر رہا تھا۔ اس کی لاش آٹھ گھنٹے تک کھیت میں پڑی رہی کیونکہ دونوں طرف سے گولہ باری جاری تھی۔ ایسے حالات میں گاؤں والے گھر میں ہی بنائے خندقوں میں جائے پناہ لینے پر مجبور ہوتے تھے۔ کبھی کبھی تو وہ بھوکے پیاسے گھنٹوں ان خندقوں میں اوندھے پڑے رہتے تھے۔

ان لوگوں کا آبائی پیشہ کھیتی باڑی تھا۔ کھیتی باڑی کے علاوہ یہ لوگ ڈھور ڈنگر بھی پال لیا کرتے تھے۔ فوج نے انہیں کئی بار یہ صلاح دی کہ وہ یہ علاقہ چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں کیونکہ یہاں رہ کر ان کے جان و مال کو ہمیشہ خطرہ بنا رہے گا۔ فوج کے اس صلاح مشورے کو انہوں نے سرے سے ہی خارج کر دیا۔ کسان کی پہچان اس کے کھیت سے ہوتی ہے۔ جب ان کے پاس کھیت ہی نہیں رہیں گے تو وہ کریں گے کیا؟ جئیں گے کیسے اور رہیں گے کہاں؟ چاہے ان کی جان رہے یا چلی جائے وہ اپنے کھیتوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔ وہ جب تک زندہ ہیں وہ موت کے سائے میں جینا پسند کریں گے پر اپنی زمین جائیداد چھوڑ کے کہیں نہیں جائیں گے۔ ان کے اس اٹل ارادے کے آگے فوج بھی کمزور پڑ گئی۔

سنتا سنگھ کے پاس کافی زمین و جائیداد تھی۔ زمین جائیداد کے علاوہ اُس کے پاس چار بھینسیں' دو بیل اور ایک گائے تھی۔ سنتا کو ان سارے جانوروں میں سے سب سے زیادہ اپنی گائے پیاری تھی جس کا نام اُس نے گوری رکھا تھا۔ گوری بڑی سندر اور چنچل تھی۔ وہ گھر کے ہر فرد سے بہت پیار کرتی تھی۔ خاص طور پر راتو کو وہ بہت ہی زیادہ چاہتی تھی۔ جب راتو اُس کے پاس جاتی تھی تو وہ اسے اس طرح چاٹنے لگتی تھی جیسے راتو کو اسی نے جنم دیا ہو۔ گوری کا چتکلا رنگ و روپ اس کی کجراری آنکھیں اور اس کا شان بے نیازی سے چلنا اسے سب سے منفرد اور ممتاز بنا رہا تھا۔ سنتا صبح جب نیند سے اٹھتا تھا تو وہ سب سے پہلے گوری کا منہ دیکھ لیا کرتا تھا۔ اس کے دل میں یہ یقین پیوست ہو کر رہ گیا تھا کہ گوری کا منہ دیکھ کے آج تک اسے کبھی کھوٹ کھرونچ تک نہیں لگی اس لئے وہ گوری کو پیار ہی نہیں کرتا تھا بلکہ ایک طرح سے اس کی پوجا کرتا تھا۔ گوری بھی اپنے مالک کے اشاروں کو بخوبی سمجھتی تھی۔ اس نے اپنی گوری کو اس طرح سے سنگاری پر لگایا تھا کہ وہ جدھر بھی نکل جائے اس کی ایک سیٹی پر دوڑتی ہوئی چلی آتی تھی۔ جب کہ باقی سب ڈنگر کے ڈنگر ہی بنے رہے۔

سنتا اکثر و بیشتر اپنے ڈنگروں کو خود ہی چرانے کے لئے لے جاتا تھا مگر مارچ کے مہینے میں جب کھیتی باڑی شروع ہوئی تھی تو یہ کام جتا کے ذمہ ہو تھا۔ سنتا سنگھ کے لئے بسنت کے دو مہینے بڑے کٹھن اور دوڑ دھوپ بھرے ہوتے تھے۔ کھیتوں کی جتائی پھر بوائی۔ بوائی کے بعد پانی کا پھیرا پھر بوائی۔ یہ دو مہینے اس قدر تنگ و دو بھرے ہوتے تھے کہ بسا اوقات سنتا کو روٹی کھانے کی بھی فرصت نہ ملتی تھی۔ بس بوائی ہو گئی تو کچھ فرصت ملنے لگ گئی۔ اس کے بعد ہر طرف ہریالی ہی ہریالی چھا جاتی تھی۔ مکئی کی فصل ہو یا گیہوں کی یہاں کا ہوا پانی اتنا موافق تھا کہ کسانوں کے گھر لبریز ہو جاتے تھے۔

اپریل مہینے کی بات ہے۔ سنتا سنگھ کھیتوں پر کام کر رہا تھا اور جتا ڈنگروں کو چرانے کے لئے سرحد کے بالکل قریب لے گیا۔ سنتا نے جتا کو ڈھور ڈنگر سرحد کے پاس لے جانے سے سختی سے منع کیا تھا کیونکہ ڈنگر ذرا سا بھی ادھر اُدھر بھٹک جاتے تھے تو اس طرف کے کسان ان جانوروں کو اٹھا کر لے جاتے تھے۔ یہی حال ان کے جانوروں کا بھی ہوتا تھا۔ ذرا سا اُدھر کا ڈنگر ادھر ہو گیا تو یہاں کے کسان بھی انہیں چھوڑتے نہیں تھے بلکہ پکڑ کر انہیں گھر میں باندھ کے آجاتے تھے۔ مویشی چوری کا یہ سلسلہ بہت پرانا تھا۔ اب حالات ایسے دوستانہ تو تھے نہیں کہ ایک دوسرے کے علاقے میں بھٹکے ہوئے جانور واپس کر کے ہم دوستی کی مثال قائم کریں۔ جب دلوں میں رنجشیں' عداوتیں اور نفرتیں بھری پڑی ہوں تو ایسے میں اخلاق اور شرافت کے سارے فلسفے دھرے کے دھرے ہی رہ جاتے ہیں۔ بس یاد رہ جاتی ہیں گزرے زمانے کی تلخیاں اور

گڑ و شیں۔

اس دن جنا باپ کے منع کرنے کے باوجود اپنے ڈنگر سرحد کے بالکل قریب لے کے چلا گیا۔ ڈنگر چرنے سے اطمینان سے گھاس چرتے رہے اور جنا ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر سستانے لگا۔ سستاتے سستاتے کب اس کی آنکھ لگی اسے پتا ہی نہیں چلا۔ جب آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ کوری کہیں دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ اس نے اس کا نام لے کر زور زور سے آواز لگائی پر کوری نظر نہ آئی۔ جنا نے اسے ادھر اُدھر ڈھونڈا وہ کہیں نہ ملی۔ اب کے جنا کے ہوش اڑ گئے۔ وہ اپنے باقی کے جانور ہانکتا ہوا باپ کے پاس پہنچ گیا اور روتے روتے بولا۔

"باپو جی کوری نکل گئی۔"

ستنا سنگھ یہ خبر سن کر دھک سے رہ گیا۔ وہ بے تحاشہ کھیتوں کی طرف دوڑا اور وہ بدحواس ہو کر زور زور سے کوری کو نام سے پکارنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ کوری جہاں بھی ہوگی اس کی آواز سن کر دوڑتی چلی آئے گی۔ وہ چلاتا رہا پکارتا رہا۔ چراگاہوں میں، کھیت کھلیانوں میں، دروں اور کھائیوں میں وہ اسے آواز لگاتا رہا پر وہ کہیں نظر نہ آئی۔ مولا جانے اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ جب شام کے سیاہ دھندلکے چاروں طرف پھیل گئے تو وہ بھرے من اور بھیگی آنکھوں کے ساتھ گھر لوٹا۔ گھر پہنچ کر جب بیوی نے کوری کے بارے میں پوچھا تو جواب میں وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ اسے روتے دیکھ کر وہ بھی رونے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھر میں کہرام مچ گیا۔ رونے دھونے کی آوازیں سن کر پاس پڑوس والے چلے آئے۔ لگا کہ ستنا کے گھر کوئی آفت آن پڑی ہے۔ جب ماجرا معلوم پڑا تو وہ بھی دکھ اور افسوس کا اظہار کر کے چلے گئے۔ ستنا اپنی کوری کو یاد کر کے بین کرتا رہا۔

رات کو جب کھانا کھانے کے بعد جنا باپ کے کمرے میں گیا تو اسے دیکھ کر ستنا کے سر پر جیسے شیطان سوار ہو گیا۔ وہ جنا پر بھوکے بھیڑیے کی طرح پل پڑا پھر اس کے چھوٹے گھونسے جڑتے ہوئے وہ اسے زمین پر پٹخنے لگا۔ چاچی پریتم کور، پریت اور رانو دوسرے کمرے میں بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے۔ انہوں نے جب جنا کی چیخ و پکار سنی تو پریت اور رانو کھانا چھوڑ کر اس کی مدد کے لئے دوڑ پڑے۔ چاچی پریتم کور جو آنکھوں سے اپاہج تھی اپنی کھاٹ پر ہی جمی رہی تھی وہ بھی جنا کی چیخیں سن کر اپنے آپ کو روک نہ پائی۔ اس نے لاٹھی تھامی اور گرتے پڑتے ستنا کے کمرے تک پہنچ گئی۔ کمرے میں تو کہرام مچا ہوا تھا۔ ایک طرف پریت چھاتی پیٹ پیٹ کر رو رہی تھی دوسری طرف رانو چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ ان سب سے بے نیاز ستنا جنا کو پیٹ پیٹ کر چلا رہا تھا۔

"ٹکو تے دے پتر۔ بول کتھے ماہیڑا، میری کوری تو بول کتھے ماہیڑیا؟"

وہ رو رہا تھا اور مارے جا رہا تھا۔ ستنا کے سر پر تو خون سوار ہو چکا تھا۔ پریت اور رانو اسے قابو کرنے میں ناکام ہو چکی تھیں اس لئے وہ بے بسی اور لاچارگی کے عالم میں چھاتیاں پیٹ رہی تھیں۔ اتنے میں چاچی اندر آ گئی۔ یہ منظر دیکھ کر اس کی بوڑھی ہڈیوں میں ابال آ گیا۔ وہ غضبناک ہو کر ستنا کی طرف بڑھی اور پھر اس پر تابڑ توڑ لاٹھی برساتے ہوئے زخمی شیرنی کی طرح دہاڑ کر بولی۔ "ہائے ہائے مر جانیا کسے گاں تے کیہ ستوڑتے نو مارن لگا کیا؟"

ستنا مار کھا کے پیچھے ہٹ گیا۔ جنا بھاگ کر ماں کے پیچھے چھپ گیا۔ ستنا لاٹھی کھا کے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ چاچی نے اسے سہارا دیا اور پھر وہ اسے سمجھا بجھا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ستنا کوری کے کھو جانے کے بعد بجھا بجھا سا رہنے لگا۔ اسے آٹھوں پہر کوری کی یاد ستاتی رہتی تھی۔ جب سے اس بات کی تصدیق ہوئی تھی کہ کوری سرحد کے اس پار چلی گئی ہے وہ سوتے میں بڑبڑا کر اٹھتا تھا اور پھر کوری کو یاد کر کے سسکنے لگتا تھا۔ شوہر کے اس روز روز کے رونے دھونے سے پریت کا کلیجہ پک چکا تھا۔ جب دیکھو کھاٹ سنبھالے بیٹھا ہے نہ کسی سے ملنا نہ شغل۔ وہ دل ہی دل میں کوری کو کوستی رہتی تھی جو سوت بن کر اس کی زندگی میں در آئی تھی۔ ستنا رات کو ہوتا تو اس کے ساتھ تھا مگر اس کے دل و دماغ میں کوری بسی ہوئی ہوتی تھی۔ اس کی ذہنی کیفیت کا یہ عالم تھا کہ کون کی بے بات کی۔ اس کی ذہنی افراتفری اور پراگندگی کو دیکھ کر پریت اپنا من مسوس کر رہ جاتی تھی۔ اس نے کئی بار اس کے من کو ٹٹولا۔ دل کو کھنگالا کہ پتا چلے کہ آخر اس کے اندر کیا ٹوٹ پھوٹ چل رہی ہے کون سی بات اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے۔ جب پریت اس کے سر پڑ گئی تو ایک دن اس نے پریت کو اپنی اس فکر و تشویش سے آگاہ کر دیا جو اسے دن رات کھائے جا رہی تھی۔ اسے اس بات کا افسوس نہیں تھا کہ کوری گم ہو گئی۔ اسے اس بات سے بھی کوئی دکھ نہ ہوتا اگر کوئی اس سے یہ کہہ دیتا کہ کوری مر گئی۔ اسے اگر غم تھا تو اس بات کا کہ کوری جن لوگوں کے ہاتھ چڑھ گئی ہے وہ اسے جینے نہیں دیں گے بلکہ اپنے بد چھرے سے اسے ذبح کر دیں گے۔ بس یہ خیال اسے رنجیدہ اور پریشان کئے جا رہا تھا۔ اس نے کوری کو بڑے جتن سے پالا تھا اس لئے اسے اس کا یہ انجام منظور نہ تھا۔ اس انجام کے احساس سے ہی اس کا کلیجہ پھٹنے لگتا تھا اور پھر کوری کی یاد اسے بھولے بھلائے نہ بھولتی تھی۔ اب جب کہ پریت پر یہ باعث کھلا تھا کہ ستنا کوری کے لئے اتنا دکھی اور پریشان کیوں ہے تو وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔

"یہ بے قبول کی گلیں سوچنا چھوڑ دیں۔ جس طرح یہ سے بھلے بندے ساتھ رہتے ہیں اسی طرح اس بار بھی کچھ بھلے چنگے بندے ہوں گے کیونکہ یہ سارا شہر کوری کی چنگے بھلے بندے کے ساتھ گی ہو۔ ویسے سارا شہر کوری سے بالی سندر کوئی اسے ماڑے لڑکی گل کوئی سوچ نہیں سکدا۔ واہگرو روپ پروسار کھو کوری جتھے بھی ہوگی بھلی چنگی ہوگی۔"

پریت کے دم دلاسے نے مرہم کا کام کر دیا۔ ستنا کے بے چین دل کو تھوڑا سا قرار آ گیا البتہ اس کے دل سے وہ ڈر پوری طرح سے خارج نہ ہو سکا جو بہت دن سے اس کے دل و دماغ میں گھر کر چکا تھا۔ پریت بھی اتنی جلدی ہار ماننے والی نہیں تھی۔ دھیرے دھیرے اس کے دل میں نئی امیدیں جگاتی چلی گئی۔ آہستہ آہستہ ستنا رنج و غم کے اس خول سے باہر آنے لگا جس میں اس نے اپنے آپ کو قید کر کے رکھا تھا۔

ایک سال بیت گیا۔ زندگی نے پھر سے رفتار پکڑ لی تھی۔ ایک شام جب وہ سارے آنگن میں کھاٹیا ڈال کے بیٹھے ہوئے تھے کہ دفعتاً کسی نے پھاٹک پر اتنی زور کی ٹھوکر ماری کہ کنڈی کہیں دور جا کے گری اور پھاٹک کھل گیا اور اس کے ساتھ ایک معجزہ ہو گیا۔ کوری اپنے بچھڑے کے ساتھ دھاتے ہوئے اندر آ گئی۔ ایک پل کے لئے سب لوگ دم بخود ہو کر رہ گئے۔ ایسا لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہے ہیں۔ ستنا پھٹی پھٹی آنکھوں سے کوری کی طرف دیکھنے لگا۔ کوری اپنے لوگوں کو دیکھ کر دم اٹھائے کودنے پھاندنے لگی۔ سبھی لوگ خوشی سے اچھل کر کوری کی طرف لپکے اور پھر سب اسے چومنے چاٹنے لگے۔ ستنا جو ابھی تک حیران و ششدر ہو کے بیٹھا تھا ایک دم اپنی کھاٹ چھوڑ کر اٹھا اور پھر کوری سے لگ کر رونے لگا۔ کوری بھی جواب میں اس کے سر کو چاٹنے لگی۔ ستنا اسے بہت دیر تک چومتا چاٹتا رہا اور پھر وہ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر بولا۔

"واہگرو تیرا لکھ لکھ شکر ہے تو نے میری کوری مجھوں لوٹا دی۔ پریت تو نے تو سچ ہی کہا تھا کہ بھلے چنگے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔"

سبھی خوشی سے جھوم رہے تھے۔ چاچی پریتم کور بھی کوری کو دیکھ کر کھاٹ چھوڑ کر نیچے آ گئی تھی۔ جب سب لوگ کوری کو پیار کر کے ہٹے تو اچانک ستنا کی نظر کوری کے پیچھے چھپے ہوئے بچھڑے پر پڑی۔ بچھڑے کو دیکھ کر اس کے تیور ایک دم بدل گئے۔ آنکھیں نیلی پیلی ہونے لگیں۔ وہ بچھڑے کی طرف تیوریاں چڑھاتے ہوئے بولا۔ "پریتے! یہ حرامی دا پتر کتھوں آ گیا؟"

پریت بچھڑے کی طرف وارفتگی سے دیکھ کر بولی۔ "یہ اسی کا جنا ہے" کہہ کر وہ اس سے پیار کرنے لگی۔

ستنا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ غصے سے پاگل ہو کر بولا۔ "یہ اتھے نہیں رہ سکدا۔ یہ دشمن کی اولاد میرے گھر میں کدی وی نہیں رہ سکدی۔"

پریت اور چاچی نے اسے سمجھانا چاہا مگر اس نے کسی کی ایک نہ سنی۔ حد تو یہ ہو گئی کہ وہ اس معصوم بچھڑے کو ڈنڈا لے کر بھگانے لگا۔ پریت کور اسے روکتے ہوئے بولی۔ "یہ تو کیا کر رہے ہو جی۔ یہ سارا شہر کوری دا بچہ ہے۔ یہ اتھے نہیں رہے گا تو مر کھپ جائے گا۔"

"بھلے مر کھپ جائے، پر میں اس حرام دی اولاد کو اپنے کاروج کوری رہنے نہیں دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ اسے گھسیٹتا ہوا آنگن سے باہر کھدیڑنے لگا۔ کوری بے چین و بے قرار ہونے لگی۔ وہ پاگلوں کی طرح ادھر ادھر بھاگنے لگی جیسے وہ سب کے سامنے فریاد کرنا چاہتی ہو۔ وہ کبھی غم سے پریت کی طرف دیکھتی کبھی ستنا پر غصہ کرنے لگتی تھی۔ ستنا اس کے غصے اور ناراضگی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بچھڑے کو گھر سے باہر کھینچتے ہوئے لے گیا۔ اس نے باہر سے دروازہ بند کر دیا تاکہ کوری بچھڑے کے پیچھے نہ چلی آئے۔ وہ اسے کھینچتے کھینچتے بوڑی کی طرف لے گیا اور لاٹھیاں مار مار کر اسے سرحد کی اس اور دھکیلنے لگا جہاں سے وہ آیا تھا۔ بچھڑا مار کھا کے بےسدھ ہو کے بیٹھ گیا۔ اس بیچ اندھیرا ہو گیا۔ ستنا چین کی سانس لے کر گھر لوٹا۔

گھر پہنچا تو کیا دیکھا کہ کوری غمگین اور اداس ہو کے ٹکٹکی باندھے دروازے کی اور دیکھ رہی ہے۔ اس کے سامنے ہری ہری گھاس پڑی تھی جسے وہ منہ تک نہیں لگا رہی تھی۔ اسے تو بس اپنے بچھڑے کے لوٹ آنے کا انتظار تھا۔ ستنا نے سوچا ایک دو دن میں کوری اپنے بچھڑے کو بھول جائے گی۔ وہ یہی سوچ کر رات کا کھانا کھا کے سو گیا۔ بھور کا وقت تھا کہ آنگن میں دھڑام دھڑام کی آوازیں آنے لگیں۔ شور سن کر سبھی جاگ گئے۔ ستنا نیچے بھاگ کے جو گیا تو اس نے کیا دیکھا کہ کوری پھاٹک پر زور زور سے سر پٹخ رہی ہے۔ ستنا نے گھبرا کے جو دروازہ کھولا تو بچھڑا بھاگ کے اندر آ گیا اور جا کے ماں سے لپٹ گیا۔ اب کے ستنا کا خون کھول اٹھا۔ جی میں آیا کہ ابھی کرپان نکال کر بچھڑے کا سر قلم کر دے جو اس طرح اس کے صبر و ضبط کا امتحان لے رہا تھا۔ اس نے جیسے تیسے دل پر پتھر رکھ کر دن کو بچھڑے کو برداشت کر لیا مگر شام ہونے سے پہلے اس نے کوری کو باڑی خانے میں لوہے کی زنجیروں سے باندھ کے رکھ دیا۔ جونہی چراغ میں بتی پڑ گئی اس نے بچھڑے کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے گھسیٹتا ہوا بستی سے دور ایسی جگہ لے گیا جہاں سے سرحد کی دوری محض دو ہاتھ تھی۔ وہاں پہنچ کر پہلے اس نے بچھڑے پر چھو کل اتارتے ہوئے اسے خوب مارا پیٹا اور پھر اس کی پٹی کھول کر وہاں سے کھسک گیا۔

وہ رات کوری نے تڑپ تڑپ کے گزاری۔ بس ہر پل ہر لمحہ وہ
لوہے کی زنجیر سے آزاد ہونے کی جدوجہد میں لگی رہی۔ کھونٹے سے لڑتے
لڑتے اس کی گردن چھل گئی تھی پھر بھی وہ کھونٹے سے زور آزمائی کرنے سے باز
نہ آئی۔ کھونٹا بھی اتنی مضبوطی سے گڑا ہوا تھا کہ کوری کی لاکھ کوششوں کے باوجود
وہ اس کھونٹے کو اکھاڑ پھینکنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ رات بھر یہ کشاکشی اور زور
آزمائی چلتی رہی۔

صبح جب سنتا کوری کا منہ دیکھنے کے لئے باڑی خانے میں گھسا تو
کوری کی حالت دیکھ کر وہ اپنا منہ مسوس کر رہ گیا۔ کوری اپنے بچھڑے سے ملنے
کے لئے بن آب ماہی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ سنتا کو دیکھ کر اس نے رحم اور فریاد
بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے
لگے۔ سنتا نے آگے بڑھ کر اس کی گردن پر ہاتھ پھیرا۔ اچانک اس کی نظر
دروازے پر کھڑی پریت کور پر پڑی جس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ
رہے تھے۔ بیوی کو اس طرح روتے دیکھ کر سنتا اس کی طرف لپکا اور پھر حیران ہو
کے بولا۔ "اوئے تجھیں کی ہو گیا تو کاہے کو رو رہی ہے؟"

پریت نے نفرت بھری آنکھوں سے سنتا کی طرف دیکھا اور پھر
کوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کوری دی حالت دیکھ رہے ہو تسی۔ کی دکھی ہے بیچاری۔ تسی کیا
سمجھو گے تسی تو مرد ہو۔ اس دا درد تو اک ماں ہی سمجھ سکدی ہے۔ تینوں اک گل
دا جواب دو۔ اک ماں سے اس دے لال نوں الگ کر کے تو نوں کلیجہ نہیں پھٹا؟ اوئے تسی
کیسے انسان ہو جے ماں کی ممتا دا ذرا بھی پاس نہیں۔ آخر اس معصوم نے تو نوں
کیا بگاڑا تھا جو تو نے اسے اپنی ماں سے الگ کر دیا۔ تو ہوں یہ بھی نہیں جاندا ہے
کہ اپنا کون تے پرایا کون؟ ہائے بڑا ظلم کیتا ہے تو نے بڑا ظلم" کہہ کر وہ پھر سے
رونے لگی۔ سنتا ایک مجرم کی طرح سر جھکائے بیوی کی پھٹکار سنتا رہا۔ پریت کی
باتیں تلخ ترش سہی پر ان میں صداقت پنہاں تھی۔ آخر اسے کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ ایک
معصوم کو اپنی نفرت اور عداوت کا شکار بنا دے۔ وہ پریت سے نظریں چراتے
ہوئے کوری کی طرف بڑھا اور اسے پیار کرتے ہوئے بولا۔ "تیرا بچھڑا تیرے
کول واپس چلا آئے گا۔ یہ سردار سنتا سنگھ دا تیرے نال وعدہ ہے" کہہ کر وہ
تیزی کے ساتھ باڑی خانے سے باہر چلا گیا۔ پریت کور جو ابھی تک دروازے
پر کھڑی تھی کوری کی طرف بڑھی اور اس سے لپٹ کر بولی۔ "حوصلہ رکھ کوری۔
تیرا پتر تیرے کول واپس آجائے گا"

سنتا بچھڑے کو ڈھونڈنے اس جگہ پہنچ گیا جہاں اس نے کل
رات اسے چھوڑا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ دھک سے رہ گیا کہ بچھڑا وہاں پر نہیں تھا۔ وہ تو
سرحد کے اس پار چلا گیا تھا جہاں سے اسے واپس لانا اب اس کے حد اختیار
میں نہ تھا۔ وہ چوکی پر تعینات سنتری کے پاس چلا گیا اور اسے سب کچھ سچ سچ بتا
دیا۔ سنتری بھی اسی علاقے کا رہنے والا تھا۔ وہ سنتا کو بڑے پیار سے سمجھاتے
ہوئے بولا۔ "دیکھو پاپا او دشمن دا علاقہ ہے۔ تو نے اگر ان کے علاقے میں گھسنے
کی کوشش کی تو وہ تم پر گولی چلا دیں گے اس لئے میری بات مان بچھڑے کو بھول
جا۔ بچھڑے سے زیادہ تو تیری جان قیمتی ہے۔"

سنتا بڑا مایوس اور دل برداشتہ ہو گیا۔ اس کی کوری کی ممتا کو کوئی سمجھ
نہیں پا رہا تھا۔ اس نے سنتری کے آگے خوب آہ و زاری کی، اس کے پاؤں
پکڑے۔ رویا گڑگڑایا پر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر کوری کا بچھڑا نہ
ملا تو وہ کوری کے سامنے کیسے جائے گا جو بھرائی آنکھوں سے اس کی راہ تک رہی
ہوگی۔ وہ پریت کو کیا منہ دکھائے گا۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں پڑا رہا۔ ادھر سنتا کے
گھر والے سنتا کے لئے کافی فکرمند اور پریشان تھے۔ وہ صبح کا بھوکا پیاسا گھر
سے نکلا تھا۔ اب تو شام بھی ہونے کو آئی تھی مگر وہ ابھی تک گھر نہیں لوٹا تھا۔ جوں
جوں وقت ڈھلتا گیا پریت کور کا دل ڈوبا جانے لگا۔ من ہی من طرح طرح
کے برے خیالات اٹھنے لگے۔ وہ دل ہی دل میں سنتا کی سلامتی کی دعائیں
مانگنے لگی۔

رات ہوئی تو سنتا ایک ٹیلے کے پیچھے سے نکلا جہاں وہ بہت دیر
سے چھپا بیٹھا تھا۔ دراصل آج وہ یہ طے کر کے بیٹھا تھا کہ وہ بچھڑے کو لے کر ہی
گھر لوٹے گا۔ وہ دھیرے دھیرے سانس روکے سرحد کی طرف رینگتا ہوا آگے
بڑھنے لگا۔ وہ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا اس لئے اس مقام تک
پہنچنے میں اسے کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی جہاں پر بچھڑا بیٹھا ہوا تھا۔ ہاتھ کو
ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا مگر سنتا کی لگن اور دیوانگی کا یہ عالم تھا کہ وہ سر پر کفن
باندھ کر بچھڑے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ بچھڑے کی چرمراہٹ سے
دونوں طرف کے سنتریوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے اندھیرے کو
جو ٹٹولا تو سنتا بھاگنے لگا۔ بس پھر کیا تھا۔ دونوں طرف سے گھمسان چھڑ گیا۔
بہت دیر تک گولیوں کی آوازوں سے ماحول تھرا اٹھا۔ یہ گولہ باری صبح تک جاری
رہی۔

صبح جب پریت سنتا کی تلاش میں گھر سے باہر آئی تو وہ یہ دیکھ کر
خوشی سے اچھل پڑی کہ بچھڑا دروازے پر کھڑا تھا۔ پریت بے تحاشہ اس کی
طرف بڑھی اور اسے پیار کرنے لگی۔ وہ اس کے پیار میں ایسی ڈوبی تھی کہ اسے
پتا ہی نہیں چلا کہ اس کے سامنے پولیس کی جیپ کب آکے رکی۔ انہوں نے
جیپ میں سے سنتا کی گولیوں سے چھلنی لاش نیچے اتاری تو ایک پل کے
لیے پریت کور جامد و ساکت کھڑی رہی لیکن دوسرے ہی پل اس کے منہ سے
ایک بھیانک چیخ نکل گئی جو بہت دیر تک فضاؤں میں گونجتی رہی۔

خود احتسابی کی بازآفرینی

ستیہ پال آنند

جوگندر پال اپنی کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔ "میں نے بھی دوسرے ادیبوں کی طرح علامتی، استعاراتی اور تجریدی کہانیاں سپردِ قلم کی ہیں جو بین السطوری تھیں تاکہ ان کی پرتیں داخلی سچائیاں، سچ حق اور گہرا علم قاری کی ذہانت میں اضافہ کریں۔ مجھ جیسا ادیب واقعی جدیدیت کے جال میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔ لیکن جب میں نے ۱۹۷۴ء میں لندن پہنچ کر مغربی تہذیب، اقدار، روایات، طبقاتی تفریق اور عام آدمی کی زندگی کو قریب سے دیکھا تو کھلا کہ (شمس الرحمن فاروقی) نے بھارت کی جوان نسل کو جدیدیت کا جو نظریہ پیش کیا تھا، وہ دس بیس برس پرانا تھا، جب کہ مغربی ادبی شخصیات کا نقطۂ نظر اس کے بالکل ہی برعکس ہے۔"

۱۹۷۴ء میں جوگندر پال صاحب نے خود احتسابی کی بازآفرینی کے طور پر محسوس کی ("میں واقعی جدیدیت کے جال میں بند ہو کر رہ گیا تھا!") وہ نہ صرف سچ تھی بلکہ اس بات پر بھی دال تھی کہ ان کی طرح ہی بھارت کے زیادہ ادیب جان چکے تھے کہ وہ انجانے میں ہی ایک رسّا لٹکا کر ایک ایسے کنوئیں میں جا گرے تھے، جس سے باہر نکلنے کے لیے انھیں رسیوں پر رسیوں کی ضرورت تھی۔ انھیں اپنے ہی قلم سے چلی ہوئی سوکھی سیاہی دھو کر اسے صاف کرنا تھا۔ اپنی ہی پرانی تخلیقات کو جھٹلانا تھا۔ اس جرم کا اقبال کرنا تھا کہ انھوں نے ایک مصنوعی ہاتھ پر بیعت کی تھی، جو صحیح پا کر ایک قزاق کی طرح ترقی پسند تحریک کے پیچھے قافلے پر پل پڑا تھا اور رہا سہا اسباب لوٹ کر لے گیا تھا۔ ترقی پسندوں نے تو شاید اپنے منشور کا اطلاق اس سختی سے نہیں کیا تھا، لیکن 'جدیدیوں' کے سچے پیر و مرشد نے اپنی درگاہ کی چاردیواری اتنی اونچی کر دی تھی اور اپنے فتووں کا بازار ("غالب سے بڑا شاعر"، "کرشن چندر سے بڑا افسانہ نگار") اس قدر گرم کر دیا تھا کہ اس چاردیواری کے اندر پھنسا ہوا کوئی بھی پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔

سریندر پرکاش کی وفات سے کوئی دو برس پیشتر جب میں بمبئی میں ان کی رہائش گاہ پر اُسے ملنے گیا (اس کی بیماری ابھی شروع ہوئی ہی تھی) تو اس نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا۔ لدھیانہ کے دنوں (۱۹۵۲ـ۱۹۵۹) کی یادیں تازہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "بھا پے (یہ اس کا میرے لیے مخصوص طرزِ تخاطب تھا) تمہاری کہانیوں کے کردار آج بھی زندہ ہیں اور مدتوں گزر جانے کے بعد بھی لوگوں کو یاد رہیں گے، لیکن مجھ جیسے ادیبوں نے کیا کچھ نہیں لکھا کیا؟ سرجیتے کردار کی شکست و ریخت کی، پلاٹ کو توڑ پھوڑ دیا، وقت کی یک سمتی رفتار کے ساتھ کھلواڑ کی، اسلوب کی سطح پر زبان کے ساتھ برا سلوک کیا۔ کس لیے؟ کہ ہم کرشن چندر یا بیدی یا عباس یا بلونت سنگھ سے الگ دکھائی دیں؟۔۔۔ تم تو بھلے وقت باہر کی دنیا کی ہوا کھانے کے لیے چلے گئے اور پھر افسانہ نویسی سے شاعری کی طرف مڑ گئے، لیکن مجھ جیسے لوگ کہاں کھڑے ہیں؟ ہوا میں معلق ہیں بھا پے، ہوا میں معلق! پیر و مرشد نے کہہ دیا کہ تمہاری کہانی 'بجوکا' کرشن چندر کی پچاس کہانیوں پر حاوی ہے اور میں خوش ہو گیا۔۔۔ لعنت ہے ایسی خوشی پر! اس نگ کو الزام دینے سے کیا ہوگا کہ اس نے مابعد جدیدیت کا شوشہ چھوڑ کر جدیدیت کے پاؤں کے نیچے کا تختہ کھینچ لیا؟ یہ تو ہونا ہی تھا۔ اس نگ پہ شوشہ نہ بھی کھڑا کرتے تو بھی جدیدیت کو اپنی موت آپ مر جانا تھا۔"

سریندر پرکاش بہت جلد چلے گئے، شاید کچھ برس اور زندہ رہتے تو کتارے کے طور پر ہی سہی، وہ بھی جوگندر پال صاحب کی طرح "مین اسٹریم" میں لوٹ آتے۔ پال صاحب بفضلِ خدا زندہ ہیں۔ He is not only alive but kicking also. اور انھیں وہ سب کہانی کار اور ان کی کہانیاں یاد ہیں جو پچاس اور ساٹھ کی دہائیوں میں میری طرح کے تھے۔ (یعنی ان سے چھ سات برس بڑے تھے) اور جدیدیت کی باڑھ آنے سے پہلے بہت خوبصورت کہانیاں لکھ رہے تھے، یاد رہ جانے والے کردار تخلیق کر رہے تھے اور جدیدیت کے در لے کے آ جانے کے بعد بھی اس سے بچ بچا کر اپنا کام کرتے رہے تھے۔ ان میں راقم الحروف نے تو بہت جلد کہانیاں لکھنا چھوڑ کر شاعری کی طرف اپنی تمام تر توجہ مبذول کر دی، لیکن دوسرے مثلاً قلم میں اقبال مجید، غیاث احمد گدی، الیاس احمد گدی، کلام حیدری تھے۔ شرون کمار ورما اور گربچن سنگھ ہیں جو اب تک لکھ رہے ہیں اور جدیدیت کے فشار و انتشار کے مرض میں مبتلا نہیں ہوئے۔

کہانی کی تکنیک، کرداروں کی بنت اور بیانیے کی براہِ راست ترسیل میں پال صاحب سے جڑے ہوئے بھی ہیں اور اپنی کہانیوں کے مغربی ماحول اور ذاتی، خانگی، معاشی اور معاشرتی حالات کی جکڑ بندیوں میں بندھے ہوئے کرداروں کے حوالے سے ان سے کچھ دوری پر ہٹ کر بھی کھڑے ہوئے ہیں۔ بھارت سے باہر کی دنیا نے ان کے تجربے کو وسیع کیا ہے اور انھیں ایک بڑا کینوس دے دیا ہے، جس میں وہ اس Diaspora سے اپنے کرداروں کا انتخاب کر سکتے ہیں جو ان کے چاروں طرف بکھرا ہوا ہے۔ اس منظر و پس منظر میں دو طرح کی کہانیاں لکھی جا سکتی ہیں۔ یا تو ایک پرانے فارمولے کے تحت بھارتی اور مغربی تہذیبوں کے تصادم کو ہی ان کے stark contrast میں پیش کرنے کے لیے stereotype کرداروں کی تشکیل کی جائے اور باہر بسے ہوئے لوگوں (خصوصی طور پر نوجوان مردوں اور عورتوں) کا "نیم ایشیائی۔ نیم یورپی" ایک نقشہ دکھا کر ایک کو ملعون اور دوسرے کو قابلِ تعریف تسلیم کر لیا جائے، یا دوسری حالت میں ان تفرقات کو بنیاد کے طور پر تسلیم کرتے ہوئے بھی

ان سے اوپر اٹھ کر نئے معاشرے کی گنا گوں پیچیدہ نوعیت کو ایسے ابھارا جائے کہ "کاز ولا کہانی" اس "۲+۲=۴" کے حصار سے نکل جائے۔ اقدار کا تصادم تو ہو اور اس کا اظہار سطح پر بھی ہو اور بین السطور بھی، لیکن یہ یکا نگی نہ ہو۔

جتیندر بلو نے اکثر و بیشتر اس دوسری خصوصیت کو اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے اور اس ہنر مندی سے کیا ہے کہ نئے معاشرے کے حوالے سے ان کی کہانیوں کے کردار عصری شعور سے مملو ہوتے ہوئے بھی انسانی نفسیات کی کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں۔ عصری شعور ملکی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی، مذہبی اور اخلاقی قدروں کا احاطہ کرتا ہے اور یہ کام اپنے دور میں ترقی پسندی نے، اپنی بلند بانگ نعرہ بازی کے باوجود ٹھیک ڈھنگ سے کیا تھا۔ ان کے بعد انسانی نفسیات کا دم بھرنے والی جدیدیت نے نفسیات کا حلیہ تو بگاڑ دیا لیکن بہ زعم خود اس کی قافیہ بندی بھی کی۔ بلو صاحب کے ہاں ان دونوں کی باہم آمیزش موجود ہے جو کہ ایک انتہائی مشکل امر ہے۔ انہوں نے تجربے، تجزیے اور علامت پر تکیہ کیے بغیر، اپنے کرداروں کے حالات کے جزر و مد اور انسانی رویوں کی پیچ و خم سے متنوع رنگوں کا انتخاب کر کے یہ کام خوش اسلوبی سے کیا ہے۔

عائلی جھگڑے عام طور پر نفسیات کے دائرے میں ہی لا کر سلجھائے جاتے ہیں۔ جتیندر بلو کے پاس 'ماجرا نگاری' ایک مضبوط چٹان کی طرح ہے اور یہ چٹان جس بربری کی مضبوط زمین پر گڑی ہے وہ ہے کہانی کار کے کرداروں کے مکالمات کا flow، جو بسا اوقات واقعات یا حالات کے براہ راست رونما ہونے کے بجائے ان کا لیکھا جوکھا بیان کرتے ہیں اور اس طرح قاری کو اپنے ساتھ ساتھ لیے چلتے ہیں۔

البتہ جہاں جہاں کہانی کا واحد متکلم اپنی کہانی کہتا ہے وہاں مکالمات سے زیادہ وقائع نگاری نظر آتی ہے۔ بیشتر کہانیوں میں اسی تکنیک کو بروئے کار لایا گیا ہے۔

بلو صاحب کی تقریباً سبھی کہانیوں کا منظر و پس منظر ازدواجی اور غیر ازدواجی نوعیت کے مرد اور عورت کے باہمی تعلقات سے عبارت ہے لیکن رومان کی چاشنی، جو کچے کہانی کاروں کا طرۂ امتیاز ہے ان کہانیوں میں نہیں ہے۔ یہ تعلقات سن بلوغ کے بعد، یعنی عمر کے اس حصے میں کہانی کار پیش کرتا ہے جب جوانی اپنی پہلی سی بلوغت کو پار کر چکی ہوتی ہے اور ادھیڑ عمر کے آنے سے پہلے زندگی میں ٹھہراؤ اور سکون کی طلب میں سرگرداں آدمی ایک جیون ساتھی تلاش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس عمر کی منزل تک پہنچتے پہنچتے، ملکی اور معاشی تقاضے ہر شخص کو اپنے جیون ساتھی کے تئیں کس روپ دیکھنا پہلے سے ہی تیار کرنے کے لیے مجبور کر چکے ہوتے ہیں۔ یہ ایسی ہی شخصیات کے تصادم اور اڈجسٹمنٹ کے بدلتے ہوئے واقعات کا منظرنامہ ان کہانیوں میں رنگ بھرتا چلا جاتا ہے۔

سرفہرست کہانی 'چکر' میں یہ تصادم اور اڈجسٹمنٹ کئی برسوں، کئی ملاقاتوں اور کئی جگہوں پر محیط ہے۔ جس کا لیکھا جوکھا کوئی سو جوگ کا زائچہ ہے اور کچھ فلیش بیک کی تکنیک کا مرہون منت ہے۔ بمل جس پچیس برسوں سے لندن میں مقیم ہے اور اس لحاظ سے وہ چالیس یا پچاس کے پیٹے میں ہے۔ لندن میں رہنے کے باوجود اور مغربی طرز زندگی (پب، بار، شراب، سگریٹ، فری سیکس) کو جزوی طور پر اپنانے کے باوجود کے ہندوانہ اجتماعی لاشعور میں کہیں یہ بات محفوظ ہے کہ سنتان کے بغیر، یعنی اولاد مر جانے والے پرش کی مکتی نہیں ہوتی۔ بھارت میں اس کی ملاقات ایک آزاد خیال، شادی شدہ خاتون تارا سے ہوتی ہے جو ایک سرجن کی بیوی ہے۔ چند ایک ملاقات ایک یادگار پرچھائیں سی چھوڑ جاتی ہے تو بھی بمل جو خود طلاق یافتہ ہے کوئی موہوم سی امید بھی نہیں پال سکتا کہ کبھی اس ملاقات کی تجدید ہو سکے گی، بلکہ دوستی کا یہ رشتہ شادی میں بھی بدل سکے گا اور اس کی بیوی اسے ایک بچے کا تحفہ دے سکے گی۔ ایک فلیش بیک میں اس کی پہلی بیوی جولیا کے اس کے ساتھ کئی برس کاٹنے کی کہانی بیان کی جاتی ہے کہ کیسے Career Minded ہونے کی وجہ سے وہ بچے پیدا کرنے اور بمل کے اس بارے میں مصمم ارادہ رکھنے کی وجہ سے اس کا گھر چھوڑ جاتی ہے۔ تارا کے لندن آنے کے بعد اس کے جذبات ایک نئی کروٹ لیتے ہیں۔ اور تارا جو اپنی شخصی آزادی کے لیے ہی اپنے امر خاوند کو چھوڑ کر بھارت سے نکل آئی تھی وہ ایک بار پھر اسی دبدھا کا شکار ہو جاتی ہے۔ شادی، جس کا لازمی جزو بچہ ہے ایک بار پھر اسے اسی دوراہے پر لا کھڑا کرتا ہے جہاں سے وہ بچ کر نکل آئی تھی۔ فرصت میں ایک بین الاقوامی تنظیم کے پروگرام کے تحت لندن سے اڑان بھرنے سے پیشتر وہ ایک رات کے لیے بمل کی مہمان ہو جاتی ہے۔ دو ماہ تک اس کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملتی کہ وہ کہاں ہے کیسی ہے اور بمل کے بارے میں اس کا رویہ کیا ہے۔ تب یکایک بمل کو اس کا ای میل سے پتا چلتا ہے اور اس میں اس رات کے حوالے سے ایک اطلاع بھی ہے اور ایک وعدہ بھی ہے: "نئے سال کی آخری رات یا پہلے ابھرتے دن میں، جب ہم نے ٹوٹ کر پیار کیا تھا تو تم چاہت بھرے موڈ میں تھے۔۔۔ آخر میں تم نے مجھ میں وہ بیج چھوڑا تھا کہ اب تم اپنی اولاد کا منہ دیکھے بغیر اپنے پربھو کے پاس نہیں جاؤ گے۔ دوسرا مہینہ شروع ہو چکا ہے۔۔۔ رہا ہمارے پاؤں کا چکر تو ہمارے بچے کی پیدائش پر ختم سمجھو۔ ہمارا دوست ہماری جنم بھومی بھارت میں جنمے گا اور تمہارا وہاں موجود ہونا ضروری ہوگا۔۔۔" کہانی کی آخری سطر وہی ہے جس سے کہانی شروع ہوتی تھی۔ "میں ای میل پڑھتے پڑھتے چھلانگیں لگا رہا تھا!"

دوسری کہانی 'انوکھا سمبندھ' بھی خاوند بیوی کے تعلقات کی الجھن دکھانے کے لیے رقم ہے۔ واحد متکلم اس کہانی میں بھی بمل ہے اور پہلی کہانی کی

طرح ہی بچی عمر کی پہلی بلوغت پار کر چکا ہے اس لیے جذباتی رومان کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تجرد کی زندگی گزارتے ہوئے اسے اس بات کا احساس ضرور رہا ہے کہ لندن میں رہ کر بھی وہ ابھی تک ان اقدار سے جڑا ہوا ہے جو ایک آباد گھر کو وہ کاشانہ سمجھتی ہیں جو میاں بیوی کا سانجھا ہے اس لیے بھی کہ ان کے دکھ سکھ سانجھے ہیں اور اس لیے بھی کہ شادی کا مطلب ہی یہ صرف دو جسموں کا ساتھ ہے جو زندگی بسر کرتے ہیں بلکہ موت تک یا شاید موت کے بعد تک بھی اپنا ساتھ قائم رکھنے کی قسم کھاتے ہیں۔ برعکس اس کے، جس خاتون سے وہ رجسٹرار کے دفتر میں جا کر شادی کے بندھن میں خود کو جکڑ لیتا ہے اس کے خاندان کو بھارت سے یوگنڈا منتقل ہونے اور وہاں سے انگلینڈ پہنچنے میں شاید پون صدی کا وقت لگا تھا، اور وہ ان روایات اور اقدار کو بھول چکی تھی، جن کے مطابق پتی پتنی ایک ہی سکے کے دو رخ ہوتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کا ذہنی رجحان صرف روپے پیسے کو نجی املاک سمجھ کر اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ گھر کو ایک سانجھی املاک سمجھے۔ وہ اپنی کمائی اپنے پاس رکھ کر گھر کے خرچ میں نصف حصے کی ذمہ داری نبھانا چاہتی تھی، وہ بیکی کا دودھ وہ اپنے پتی پر بھی ڈالنا چاہتی تھی۔ مکالمات کے کاریٹ میں تحریر کردہ یہ کہانی مکالمات کی تیغ پر ہی اپنے ایکشن کو آگے بڑھاتے ہوئے چلتی ہے۔

بولی: "گھر میں چلاؤں گی۔ بیرجنے شاپنگ پر جو بھی خرچ ہو گا، ہم آدھا آدھا خرچ لیا کریں گے۔"

"لیکن فلیٹ کا کرایہ کونسل ٹیکس بجلی، گیس، پانی ٹیلی فون کے بل؟"

"وہ بھی ہم آدھا آدھا ادا کریں گے۔"

گر بہت کی گاڑی کے پہیے دل کی گاڑی کو کھینچ سکتے ہیں؟ اس بات کا اندازہ پوچا کو آخر تک نہیں لگا کیونکہ وہ جس value pattern کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی وہاں روپیہ پیسہ ہی سب کچھ تھا۔ مصنف کا کمال اس کہانی میں یہ ہے کہ اس نے ایکشن کو پایۂ اختتام تک پہنچانے کے بجائے اس کو ہوا میں ہی معلق چھوڑ دیا ہے۔ جونہی طلاق کی بات شروع ہوتی ہے پوچا کا ردعمل یہ دکھائی دیتا ہے:

"میرے جواب کی بھرپور تیغ جیسی چیری اور اس کی کاٹ کو وہ برداشت نہ کر پائی تھی۔ پاؤں پٹخ کر فوراً اٹھی، غضبناک نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ لگا کہ وہ مجھ پر حملہ کرنے کو جا رہی ہے مگر اپنے کمرے میں جا کر اس نے اتنے زور سے دروازہ بند کیا کہ دھماکا ہوتے ہی میرے کان سن ہو کر رہ گئے۔۔۔ اور اب میں کمرے میں اکیلا بیٹھا سوچ میں ڈوبا ہوں کہ بات کہاں سے نکل کر کہاں تک پہنچ گئی ہے اور جانے کہاں جا کر ختم ہو۔" کہانی کو اگر آگے بڑھایا جاتا تو یہ ایک سپاٹ بیانیہ بن جاتی۔ اسے اس نقطے پر ختم کر کے مصنف نے اپنی چابکدستی کا ثبوت دیا ہے۔

پچھلی کہانی میں مکون کا تیسرا زاویہ یعنی 'دوسرا مرد یا دوسری عورت' نہیں تھی لیکن تیسری کہانی "معلق" میں زندگی کی جو مثلث کی یہ مکون، یعنی "عورت۔ مرد۔ دوسرا مرد" ایک بار پھر ابھرتی ہے۔ اس بار البتہ جاسوسی کہانیوں کے پیٹرن کی پہلی سی جھلک عورت کی ذاتی یا خانگی تاریخ، اس کی شخصیت اور اس کی حالیہ زندگی کے بارے میں نظر آتی ہے۔ عورت، اس کہانی میں ایک پہیلی ہے جس کو بوجھنا نہ صرف کہانی کے "میں" کے لیے ایک چیلنج ہے بلکہ اس rooming facility کے مالک مکان کے لیے بھی ہے جو اسے بیوی کہ رکھیل یا مستورہ بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ یہ عورت کون ہے کیوں اکیلی مردوں کے لیے مخصوص کرائے کی facility میں رہتی ہے اور مسلمان ہوتے ہوئے بھی کہانی کے متکلم، ایک ہندو کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کی خواہشمند ہے۔ یہ کہانی کی الگ الگ کڑیاں ہیں۔ جنہیں اس کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں بندھ جانے کی خواہش رکھنے والے دونوں فریق یعنی مالک مکان اور کہانی کہنے والا، جاننا چاہتے ہیں۔ بہر حال، کہانی جنسی تعلقات کی منزل تک پہنچے بغیر اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب اس کی پر اسرار شخصیت کا ایک اور پہلو نمایاں ہوتا ہے یعنی وہ گئے برسوں اپنے سابق خاوند (؟) کے ساتھ بھی تعلقات منقطع کیے بغیر رہ رہی ہے اور شاید اسی مرد سے اس کا ایک بچہ بھی ہے اور یہ کہ وہ (شاید) اپنے پرانے خاوند سے اس لیے متنفر تھی کہ وہ bisexual تھا۔ یہ کہانی بھی کسی خاطر خواہ حتمی نتیجے تک پہنچے بغیر، پلاٹ کی فضا میں معلق سی، جھولتی ہوئی ختم ہو جاتی ہے۔ اور یہ درست بھی ہے کیونکہ زندگی بھی کسی ایک نقطے پر پہنچ کر ختم نہیں ہوتی، چلتی ہی رہتی ہے اور بلوچ اسی طرح کی کہانیاں نہیں لکھتے۔ جن میں آخر میں ایک چونکا دینے والا کلائمکس ضروری ہوتا ہے۔

"فاصلے" باقی کہانیوں سے ذرا فاصلے پر کھڑی دکھائی دیتی ہے۔ یہ درست ہے کہ ازدواجی زندگی کے ماحول اور اس پر مستزاد بچے یا بچوں کے ہونے اور اس طرح پریوار کو مکمل کرنے کے موضوع کے ساتھ بلوچ صاحب کی وابستگی تقریباً سبھی کہانیوں میں ایک سی ہے لیکن "فاصلے" میں اس کو ایک نیا موڑ دے دیا گیا ہے۔ کہانی کا واحد متکلم یعنی "میں" جب ایک انگریز عورت سے جو شادی سے پہلے ہی اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی، ازدواجی رشتے میں بندھ جاتا ہے تو یکے بعد دیگرے تین بچے جنم لیتے ہیں۔ پہلے دو تو یورپی اور ایشیائی خون کا ملا جلا رنگ و نسل نقشہ لے کر آتے ہیں لیکن تیسرا بچہ گورا چٹا، بھوری رنگت کے بالوں اور انگریزی خدوخال کو لے کر وارد ہوتا ہے۔ یہاں خاوند کے دل میں ایک شک کی پرچھائیں ابھرتی ہے اور وہ اس بچے کو اس شدت سے پیار نہ کرنے کے لیے خود کو بے بس پاتا ہے جیسے باقی دو بچوں کی طرح یہ بچہ بھی حقدار ہے۔ تب ڈاکٹر اسے سمجھاتا ہے کہ genes ہمیشہ ایک قاعدے کے تحت وارد نہیں ہوتے کہ ماں باپ دونوں کا آدھا آدھا حصہ بچے کی شکل

میں داخل ہو جاتا ہے اور جوڑ تسلی کے لیے وہ اسے رائے دیتا ہے کہ دونوں میاں
بیوی اپنا خون ٹیسٹ کروائیں اور بچے کے خون کے ساتھ موازنہ کر کے اپنی تسلی
کرلیں۔ خاوند کی دیدہ حاجب بڑھ جاتی ہے جب وہ بیوی کو گھبرایا ہوا دیکھتا
ہے جو خون ٹیسٹ کروانے یعنی یہ ثابت کرنے کے لیے تیار ہے کہ بچہ اسی کا
ہے۔ آپسی اعتبار کی فضا، وہ جانتا ہے کہ مجروح ہو چکی ہے اور اگر وہ اب خون
ٹیسٹ کروانے کے راستے پر آگے بڑھتا ہے تو اسے واپس پرانی سطح پر استوار
کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ اس لیے کہانی کی آخری سطروں میں وہ طے کر لیتا ہے
کہ خون ٹیسٹ نہیں ہوگا۔ یہ فیصلہ وہ تب کرتا ہے جب اسکے ہندو شعور کی تہہ
سے رام چندر اور سیتا کی کہانی ابھرتی ہے کہ "سیتا نیا کو اپنی پاکیزگی کا ثبوت اگنی
پریکشا کی صورت میں دینا پڑا تھا اور اس کا پل بھی بیان نہ ہوا تھا تو رام جی کا سر
مارے شرم کے سینے کی طرف ڈھلک گیا تھا۔"

"چھتری والا کیلا" اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں بغیر کسی حیل و
حجت کے کہانی کا "متن" یہ ثابت کرنے کا خواہشمند ہے کہ جنس اور خوبصورتی
دو الگ الگ مقناطیسی پتھر ہیں جو مرد کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ تجربے کے طور پر
کہانی کا 'متن' دو عورتوں سے pre-marital sex کا خواہاں ہے
سانولی، کچھ کچھ فربہ کچھ کچھ بے ڈول عورت سے وہ ہم بستری کر چکا ہے اور
اب جب کہ اس کا سامنا کپڑے اتارتی ہوئی اس عورت سے ہوتا ہے جو حسن،
جوانی اور بدن کی کشش میں اپنی مثال آپ ہے تو اسے اپنے چھتری
والے کیلے کی یاد آجاتی ہے اور وہ دہشت سے اپنے سامنے کھڑی نیم برہنہ عورت
کو پھر سے کپڑے پہننے اور اس کی زندگی سے نکل جانے کو کہتا ہے۔ اس کہانی میں
sexual overtones ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ہیں لیکن اخلاق
اور ادب تو الگ الگ چیزوں کے نام ہیں!

"یوٹرن" یعنی U-Turn اس مجموعے کی اکیلی کہانی ہے جو
باقی کہانیوں سے مختلف ہے۔ یہ "بھاگوت پران" کی ایک کتھا پر آدھارت
ہے (بلو صاحب نے شاید یہ کتھا اپنے بچپن میں سنی ہو اور کہانی لکھتے ہوئے
ان کے ذہن میں موجود ہو، لیکن وہ اس کا قصہ یاد نہ کر سکے ہوں!) اصل کتھا
میں بھی یم دوت (ملک الموت) شہر کے امیر ترین ساہوکار کو ایک دن کا وقت دیتا
ہے کہ اگر وہ کسی اپنے دوست، سگے سمبندھی یا کسی بھی دوسرے مرد یا عورت کو
اپنی جگہ پر مرنے کے لیے تیار کر سکے تو اس کی جان بخشی کر دی جائے گی۔
ساہوکار بسیار کوشش کے باوجود کسی بھی آدمی کو حتیٰ کہ کوڑھ کے ایک مریض کو
بھی جو قریب المرگ بھی ہے دولت کا لالچ دے کر بھی اس بات کے لیے تیار
نہیں کر سکا اور بالآخر خود ہی یم دوت کی خدمت میں حاضر ہو کر اس نے اپنی جان
پیش کر دی۔ fable format میں تحریر کردہ بلو صاحب کی یہ کہانی ایک
fantasy ہے جسے انھوں نے عصری سماجی اور معاشرتی سیاق و سباق میں
رکھ کر خوب نبھایا ہے۔

تو آئیے اب بلو صاحب کی کہانیوں کے بارے میں کچھ مفروضے
طے کریں۔ (۱) اس کتاب میں کل آٹھ کہانیاں ہیں، جن میں سے سات واحد
متکلم یعنی 'آپ بیتی' کے طریقہ کار سے لکھی گئی ہیں۔ یہ تکنیک قاری کو چشم
دید شہادت کے طور پر قائل کر دینے والی مہارت سے مملو ہے۔ نئے افسانہ نگاروں
کے ہاں اس کا نقص ان کی کہانیوں کو 'آپ بیتی' کی حد فاصل پھلانگ کر 'جگ
بیتی' بننے سے باز رکھتا ہے لیکن بلو صاحب کے ہاں، کم از کم باہر بسے ہوئے برصغیر
کے باشندوں کے حوالے سے، یہ ایک معتبر "گواہی" ہے اور انھوں نے اسے
خوب نبھایا ہے (۲) بیشتر کہانیاں عائلی زندگی کی داستانیں ہیں جن میں
ازدواجی رشتے میں بندھے ہوئے یا بندھ جانے کی امید رکھنے والے جوڑے خانگی
، سماجی اور معاشی حالات کے زد و مد میں بچتے، ابھرتے تیرتے ہوئے اپنا سر پانی
سے اوپر رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ حالات کے بہاؤ کے
ساتھ ہاتھ پیر مارتے ہوئے یہ جوڑے کبھی کبھی اس گرداب میں بھی پھنس جاتے
ہیں جسے extra-marital affair کہا جاتا ہے۔ عارضی علیحدگی، طلاق،
دوبارہ ملاپ کی آس بھی اس زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ افسانہ نگار کی یہ ایک خوبی ہے
کہ اپنی کہانیوں کو اس دائرہ کار میں رکھ کر اس نے اپنی جانی پہچانی زندگی کے
تجربات اور حالات سے صد فی صد مطابقت کا ثبوت دیتے ہوئے اسے یہاں تک
حقیقت پسندی سے منظر کر دیا ہے کہ وہ ان کی اپنی "جگ بیتی" محسوس ہوتی ہے
(۳) بلو صاحب کی دنیا دہ برس پہلے کی جدیدیت سے وابستگی اور بعد میں دل
برداشتہ ہو کر اس تحریک کی وسعت، اس کے فنکار اور فنکاری سے لاتعلقی کے
موجود ہونے نے انھیں اس سے یہاں تک متنفر کر دیا ہے کہ اب وہ کسی بھی طرح
کی علامت نگاری یا نئے کی زیریں سطحوں پر متوجہ کے رقیقوں کو مہارت سے
دفن کر دینے کے طریقہ کار سے اجتناب برتنے لگے ہیں۔ (۴) طوالت ایک طے
شدہ پیمانہ نہیں ہے جس کے تحت ایک لکھاری اپنا افسانہ لکھتا ہے۔ بہر حال چونکہ بلو
صاحب حالات کے زد و مد کا بیان زیادہ طور پر کرداروں کے مکالمات سے
کرتے ہیں، (اور یہ طریقہ کار ان کے ہاں واضح طور پر نمایاں ہے) اس لیے
بادی النظر میں کچھ کہانیاں معمول سے زیادہ طویل لگتی ہیں، لیکن ہر کہانی اپنی
نامیاتی وحدت میں یوں مضبوطی سے جڑی ہوئی ہے کہ اسے کاٹا چھانٹا نہیں جا سکتا
تھا۔ (۵) اسلوب کی سطح پر بلو صاحب نہ تو کرشن چندر کی طرح شاعری کرتے
ہیں اور نہ ہی بلونت سنگھ (یا ان زمانہ پاکستانی پنجابی افسانہ نگاروں) کی طرح اردو
سے ایسی کھلواڑ کرتے ہیں کہ پڑھی نہیں جا سکے کہ یہ اردو ہے یا ٹھیٹھ پنجابی ہے۔ تو
بھی کہیں کہیں زبان کے ساتھ استعارے کی سطح پر (جو زیادہ نہیں ہے) "زیادتی"
کھٹکتی ہے اور بعض اوقات تو تسم کا پہلو بھی سامنے آجاتا ہے۔ "چھتری والا کیلا"
اور "پروٹ" Pervert دونوں میں یہ 'زیادتی' ابھرتی ہے۔ "چھتری والا کیلا"

میں تو یونیورسٹی اس کو ختم دیتی ہے اور بلو صاحب کا قلم زیادہ گستاخی نہیں کرتا۔ لیکن پرورش میں اسے بلاوجہ ہی ابھار دیا گیا ہے۔ عام طور پر adolascent نوجوان ہی جنس کے فعل کو مزاحیہ انداز میں اپنے ہونے والے بچوں کا قاتل تصور کر کے اس پر قہقہے لگائیں گے۔ لیکن بلو صاحب نے اس کہانی میں دوبارہ اس کا ذکر کچھ مزہ لے لے کر کیا ہے جو مجھ جیسے قاری کے لیے ناقابلِ قبول ہے۔

خدا جانے کیوں، لیکن بلو صاحب کو اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کے کئی برس جدیدیت کے چکر میں پڑ کر ضائع کیے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اس دور میں بھی بہت اچھا ادب تخلیق کر سکتے تھے۔ 'چکر' کے دیباچے میں وہ اس کے لیے شمس الرحمٰن فاروقی کو براہِ راست ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"مجھے پورا یقین ہے کہ جب جب اردو ادب کی تاریخ رقم کی جائے گی تو مورخ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی سے آٹھویں دہائی کے جدید ادب کا احاطہ کرتے وقت اس سیاہ دور کو گمراہ کن، بے تکی اور تقریر اور سنگا اور جدیدیت کے علمبردار فاروقی کو مورد الزام ٹھہرائے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے جدیدیت کے ہیر پھیر میں اپنے کئی بہترین سال ضائع کیے۔ لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ جدیدیت کے دم توڑتے ہی اسی دور والی ہستیوں نے چھپ لیے شروع کر دیے ــــ فاروقی نے چند طویل کہانیاں لکھ ڈالیں، داستانوی اور بیانیہ پیرائے میں تحریر کیں جو پُر آشوب زمانوں کی بگڑتی مٹتی تہذیب اور مغلیہ عہد کے حالات کی ترجمان تھیں۔ فاروقی کو یقیناً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا کہ ادب میں اپنے ماضی، اپنی روایات اور ثقافت سے آنکھیں چرانا کتنا بڑا گناہ ہے جبکہ جدیدیت کے دور میں یہ سب جائز تھا۔ اسی کا نام جدیدیت ہے جس کے پودے بن کر رہ گئے تھے" ــــ بہت سخت الفاظ ہیں یہ۔ لیکن میں بلو صاحب کو الزام نہیں دیتا۔ مقولہ ہے، 'جس تن لاگے سو ہی تن جانے'!

یہ افسانوی مجموعہ بلو صاحب کا پانچواں ہے۔ ان افسانوں کو ملا کر جو پچھلے مجموعوں میں شامل نہ کیے گئے ہوں، وہ شاید چالیس سے پچاس تک کہانیاں لکھ چکے ہیں۔ یہ تعداد کم نہیں ہے اور بطور ایک ایسے افسانہ نگار کے جس نے اکثر و بیشتر مغرب میں بسے ہوئے diaspora کو ہی اپنی آماجگاہ بنایا ہے یہ افسانے انھیں اردو ادب میں ان کا جائز مقام دلوانے کے لیے کافی ہیں۔ Comparisons are always odious اور پھر اس بحث میں پڑے ہوئے کہ وہ فلاں افسانہ نگار سے بہتر ہیں یا فلاں کے مقابلے میں کمتر ہیں، مجھے صرف یہی کہنا ہے کہ وہ اول درجے کے کہانی کار ہیں۔

کتاب خوبصورت، گلیز ڈ کاغذ پر چھپی ہے، مجلد ہے اور ایک دیدہ زیب سرورق سے مزین ہے۔ اسے قلم بیلی کیشنز، ۵/۱ اے، ایل، آئی، جی، کالونی کرولا (مغربی) ممبئی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

O وہ (صفوت) اپنا کنواں خود کھود کر پانی پینے کا قائل ہے۔ سید ضمیر جعفری

O صفوت تجربات، مشاہدات، جذبات اور احساسات کی تفریق اور تمیز کی کامیاب نشاندہی اور نظم آرائی کی راہ پر گامزن ہے۔ مامون ایمن

O سوادِ حور نے مجھے شاعری کے ایک بالکل نئے اور انوکھے ذائقے سے آشنا کیا ہے۔ غلام مرتضیٰ راہی

اُردو ادب میں اضافہ کی حیثیت رکھنے والی تخالیق

'مثنویِ وقت' اور 'مثنویِ رسولؐ' کے شاعر

صفوت علی صفوت کی ایک اور تحریر پیشکش

سَوادِ حُور

(حمد، نعت، غزل، نظم، رباعی)

صفحات: 216

قیمت: انڈیا کے میں -/250 روپے، دیگر ممالک میں 20 ڈالر

رابطہ:

O موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 9۔ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۲

O راہی منزل، بنی فتح پور (یو۔ پی) ۲۱۲۶۰۱

بیرون ملک رابطہ: 14-Woods Row, Monroe, CT 06468, USA

تخلیقِ عصر .... عطیہ سکندر علی

تازہ تصنیفات کا تعارف

ماں میں تھک گیا ہوں

(اپنی کہانی اپنی زبانی)

○ مدینہ منورہ سے باہر نکلے تو ہر کوئی یوں پلٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا جیسے کوئی قیامت سی آ گزرتے تھم گئی ہو۔

○ مجھے یہاں بنگلے والے لکھڑ اکر گئے ہیں کہ ابھی لندن کی خلافت چلی ہے تو اس میں ڈائریکٹر یا کنڈکٹر بنا دیں گے۔

○ دونوں ڈپٹی سیکریٹری (سجاد حیدر اور ڈاکٹر مسعود) ملتان کالج پڑھانے آئے تھے۔ لیکن تھے دونوں بڑے سے بڑے۔ ان کے ساتھ کام کرنے میں بے حد لطف آیا۔

○ اب سوچتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ مجھے کتابوں نے پڑھا کیا۔ لوگوں نے اپنا ہی نقصان کیا۔ پہلے چیئرمین کو ڈر تھا یہ وزارت کا آدمی ہے۔ دوسرے صاحب کو ان بیلی کرنے کا ٹھکانہ اعلیٰ بنا ہوا کہ اپنے آدمیوں کو اس لئے وقت دفتری ہوئے گئے کیوں نہیں سمجھاتی۔

○ ہمارے ہاں بچہ دنیا میں آتا ہے تو ہم اس کے کانوں میں اذان دیتے ہیں۔ تیسری دو چیزیں بھی پھونکتے ہیں ایک یہ کہ لیڈر جو کہتا ہے وہی ٹھیک ہے دوسرے یہ کہ غیر ملکی سے بڑھ کر کوئی شیطان نہیں ہوتا۔

○ مجھے چونکہ اس جنس کا تھوڑا بہت تجربہ تھا جسے پرنسپل کہتے ہیں اس لئے میں نے دور رہنے کی کوشش کی لیکن ڈاکٹر احسن کی ذات میں ایسی مقناطیسی قوت تھی کہ بندہ خود بخود ان کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔

○ میری نانی بتلایا کرتی تھیں کہ جب میری شادی ہوئی تو وہ مشکل چودہ برس کی تھیں۔ گاؤں کی گلیوں میں سکھیوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے کسی نے زور سے پکار کر انہیں کہا تمہاری بارات آئی کھڑی ہے اور تم گلیاں ناپ رہی ہو۔

○ ایک اور معاملہ لیبیا کے شہر غازی میں قائم پاکستانی سکول کی ایک طالبہ کا تھا۔ اس کا داخلہ سکول کی نا اہلی کی وجہ سے بورڈ نہیں بھیجا گیا تھا۔ سکول کی انتظامیہ اپنی نا اہلی کو چھپانے کے لئے یہ دلیل دے رہے تھے کہ بچی کے والد کا کنٹریکٹ ختم ہو گیا ہے۔

○ یونیورسٹی نے ایک غضب تو یہ ڈھایا کہ چار پانچ شعبے ایک ساتھ شروع کر دیئے اور ان کی عمارتیں وہاں تعمیر کیں جہاں کبھی سمندر ہوا کرتا تھا چنانچہ زیر زمین پانی ابھی تک کھارا ہے۔ اور ہر دیوار میں دراڑ پڑ چکی ہے۔

○ ان باتوں کو چھوڑیئے چھٹے سال اسکالرشپ کی قطعاً گنجائش نہ تھی۔ ایک خاتون انگریزی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے انگلینڈ پہنچیں تو ان کی انگریزی دیکھ کر پہلے انہیں ایم اے کرنے کا مشورہ دیا گیا۔

○ ایک روز کیا دیکھتا ہوں کہ وزیر اعظم ہاؤس سے ایک درخواست میلوں کا سفر طے کر کے آئی ہے۔ لب لباب یہ تھا کہ وزارت تعلیم میں ایک جاہل، ان پڑھ اور بے وقوف JEA آ گیا ہے جسے قاعدے کا پتہ ہے نہ قانون کا۔

○ ماں کی سادگی کا تو یہ عالم تھا کہ دیوالی میں ایک بار ان کے ہاتھ سے گر کر پلیٹ ٹوٹ گئی تو گھبرا کر ٹکڑے لگا زمانے آ زمانے آٹا لے کر بیٹھ گئیں اور پلیٹ جوڑنے لگیں۔

○ ادبی محفلوں میں، میں اکثر نہیں جاتا تھا۔ ایک تو وقت نہیں ملتا تھا دوسرے میرا خیال تھا کہ ہم اپنا حصہ ڈال چکے اب نوجوانوں کو آگے بڑھ کر اسٹیج سنبھالنا چاہئے۔

○ ہمیں اصل تکلیف یہ تھی کہ اس قسم کے کام غیر ملکی اداروں سے حاصل کئے گئے قرضوں کے بھروسے کئے جا رہے تھے۔ غیر ملکی قرضوں کی بھی ایک ہی رہی۔ ہم تو ایک مدت سے غیر ملکی قرضے کھاتے پیتے اور اوڑھتے چلے آ رہے ہیں۔

"معاف کیجئے گا میں سہانے خواب نہیں دکھا سکتا نہ ہی سبز باغوں میں لے جا سکتا ہوں۔ چھ سو صفحات میں اور اب بھی کیسے میں زہر ہلاہل کو قند کہہ دوں؟ اس قوم کے ساتھ کس کس نے مذاق نہیں کیا؟ کس کس نے آپ کو قوم کو...... چھوڑیئے میں اپنی داستان یہیں ختم کرتا ہوں...... وقار بن الٰہی"

قیمت: تین سو روپے۔ پتہ دستیابی: نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد۔

سیدِ سخن

کسی بھی تخلیق، کتاب یا صاحب قلم کے تعارف اور تبصرے میں شخص مذکور کی تعریف کم از کم اردو ادب میں لازمی تصور کی جاتی ہے حالانکہ نقد و نظر کا تقاضا اس طرز کے قطعی متضاد ہونا چاہئے۔ چونکہ پیش نظر اس وقت ہمارے ایک ایسے محسنِ اردو ہیں جن کی بابت بہت کچھ کہا اور لکھا جا سکتا ہے مگر رہی وہ اس وقت ان کی تازہ علمی کاوش "سیدِ سخن" ہے جی ہاں! آپ ہم سب بلکہ اردو ادب سے وابستہ ہر فرد ڈاکٹر سید تقی عابدی کی اردو زبان اور اردو ادب سے محبت، جاں نثاری اور دور اندیشی، پیش بندی سے بخوبی آگاہ ہیں لہٰذا ڈاکٹر سید تقی عابدی کی ہر کاوش اور ہر تخلیق کو نہ صرف اہل زبان سے پذیرائی حاصل ہوا کرتی ہے بلکہ سنجیدہ علمی اور ادبی حلقے ڈاکٹر سید تقی عابدی کی لگن اور جستجو کی داد بھی دیتے ہیں، استفادہ بھی کرتے ہیں اور مستقبل کی بابت ڈاکٹر سید تقی عابدی سے بہتر توقعات بھی وابستہ کئے ہوئے ہیں۔ "سیدِ سخن" ڈاکٹر سید تقی عابدی کے تیس تحقیقی اور تنقیدی مقالات کا ایسا مجموعہ ہے جس میں ڈاکٹر صاحب محترم نے "غالب کی فنی غزل کا اجمالی تجزیہ، مثنوی مرزا دبیر، معراج نامہ کا ادبی معیار" "مرزا دبیر اور دیارِ نجف" "روپ کنور کماری" "فسانہ یا حقیقت" کے عنوان سے تشریح اور محاکمہ تو اب مصطفیٰ خان شیفتہ کے فن و شخصیت کا مختصر جائزہ "شاید اسی کا نام محبت ہے" کے عنوان،

علامہ اقبال اور ملک اختر اگر اوی کا اہم مہربان صاحب اور معترف "نظم اردو" کے عنوان سے ناطق لکھنوی کی شخصیت و فن کے نئے زاویے "میدان رفاقی کا شہسوار" کے عنوان سے مرزا سلامت علی دبیر کے فن پر تنقیدی جستجو عمر خیام کی حیات کا نامہ "اتنا تو ہمیں جاننا چاہیے" کے عنوان سے بے پناہ نادر معلومات کی حامل ہے۔ "قانی کا لافانی فن" "علامہ اقبال کا "سیاحتی گوشہ" "علی بخش" "غزل حقی کی تحقیقی پہچان" میں ڈاکٹر شان الحق کی شخصیت اور فن کو بھرپور طریقے سے روشن اور نمایاں کیا ہے۔ "میر انیس کی جمالیات نگاری" "زہرا کی جھلک دبیر کے کلام کی روشنی میں" "حسرتِ دل" کے عنوان سے عارفانہ کلام کی تاریخ اور اہم شعرا زیر بحث لائے گئے ہیں۔ "علامہ اقبال کا جلوسِ جنازہ" کے عنوان سے شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے جنازے کی تفصیل مہیا کرتا ہے جس میں خصوصیت کے ساتھ غازی علم دین شہید کے جنازے کا ذکر بھی رقم ہے۔ "علامہ اقبال کی آخری رات" کے عنوان سے علامہ کی آخری خواہش اور احباب کی متضاد بیانی سے نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جدید مرثیہ میں حضرت صبا اکبر آبادی کا مقام، علامہ اقبال کی تاریخ گوئی، شبلی کے بیانوں سے دبیر کی شعری، اقبال کا فلسفۂ تقدیر، مرثی دبیر میں استعاراتی نظام کا ہجوم کے عنوان کے علاوہ اور بھی بہت سے اہم اور وقیع عنوانات کو بحث کا موضوع بنا کر نئے گئے اور نئے حقائق و مفاہیم کس عرق ریزی سے اجاگر و نمایاں کئے گئے ہیں اس کی مثال کم کم دیکھنے میں آتی ہے اس علمی تحفے پر خدا معلوم ڈاکٹر صاحب محترم نے قیمت اور دستیابی کا پتہ درج کیوں مناسب نہ جانا۔ دلچسپی کے حامل احباب کے لئے پبلشر کا پتہ درج کیا جاتا ہے۔ شاہد پبلیکیشنز: 2253، کوچہ چیلان، دریا گنج دہلی۔

شعور و ادراک

"یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ "شعور و ادراک" کی اشاعت سے اردو کے تحقیقی و تنقیدی شعبے میں ایک اچھا اور معیاری اضافہ ہوا ہے۔ نور محمد شاہ کامیاب جونپوری کی "دو روات" اور سید محمد دریاں خوشتر احمد آبادی کے مرثیوں کے بارے میں اتنی تفصیلی معلومات اس کتاب کے ذریعے حاصل ہو سکی ہیں۔ دیگر مشمولات بھی سیاق و سباق کے اعتبار سے خوب ہیں۔ خدا جناب ایوب واقف کو سلامت رکھے تاکہ وہ اسی طرح اعلیٰ اور وقیع تنقیدی و تحقیقی شعور و ادراک کی مثالیں شائقین علم و ادب کی خدمت میں پیش کرتے رہیں..... "رشید حسن خان

"شعور و ادراک" کی شکل میں جناب ایوب واقف نے بڑا اچھا اور خوبصورت تحفہ ارسال کیا ہے۔ ایوب واقف کے قلم میں غضب کی طاقت ہے۔ تنقیدی و تحقیقی مضامین ہوں یا تاثراتی تحریریں ہر جگہ جناب ایوب واقف کے جوہر شناس قلم نے قابل قدر نقوش قائم کئے ہیں۔ خداوند کریم جناب ایوب واقف کو یشش و بخشش موقع عطا فرمائے تاکہ اردو ادب میں اسی طرح نئی نئی اور اچھی اچھی کتابوں کا اضافہ ہوتا رہے"...... نثار احمد فاروقی

"شعور و ادراک کا پہلا ایڈیشن 1991ء میں شائع ہوا تھا اس وقت رومانیہ کے کمیونسٹ ملک پر زوال آیا تھا اس کا حکمران نکولائی چاؤشسکو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا تھا اس وقت میں نے زیر نظر کتاب میں سوویت یونین کے زوال اور ٹوٹ پھوٹ کی پیشین گوئی بھی کی تھی۔ اب جبکہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن چھپ رہا ہے تو میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ سوویت روس کی ناراضگی نے متحدہ امریکہ کو انتہائی طور پر بے لگام کر دیا ہے۔ جس ظلم و جبریت کو ماضی میں برٹش سامراج نے اپنے لئے روا رکھا وہی سب کچھ اب امریکہ جمہوریت کے فروغ کے نام پر کر رہا ہے لیکن ہمیں یقین کامل ہے جس طرح روس کی بے پناہ طاقت افغانستان کی خطرناک دلدل میں پھنس کر تہس نہس ہو گئی تھی ٹھیک اسی طرح جارحانہ اور استعماریت پسند امریکہ کی بے پناہ طاقت اور قوت کا خاتمہ بھی افغانستان اور عراق میں ہوگا"...... محمد ایوب واقف

اوپر کی سطور میں آپ نے دو محترم اور جید صاحبان علم و ہنر کی آرا "شعور و ادراک" کی بابت ملاحظہ فرمائیں۔ تیسرا اقتباس "شعور و ادراک" کے مصنف جناب ایوب واقف کے دیباچے سے لیا گیا ہے جس کی روشنی میں آپ کتاب ہذا کی بابت یہ اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں کہ اس کتاب میں کس پایہ کا تنقیدی و تحقیقی کام کیا گیا ہے اور کیوں اس کے دوسرے ایڈیشن کی ضرورت محسوس کی گئی ہے اگر آپ پروفیسر نجیب اشرف، نور محمد شاہ جونپوری، محمد قلی قطب شاہ، خواجہ احمد عباس، صباح الدین عبدالرحمن، منشی تعویذ ولی کی ادارت میں نکلنے والے مشہور زمانہ جریدے "زمانہ"، سید جوہر علی زیدی کے مشہور منظوم فسانے "پانو"، ایشیا کی عظیم جامعہ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد، اردو ہندی کا مسئلہ، جوش ملیح آبادی اسے ہندوستان نہیں کہتے، سیتا پور سے لندن کوٹ تک، اختر الایمان، خواجہ حسن نظامی، شبلی نعمانی اور موازنہ انیس و دبیر، کرشن چندر کا فن، علی سردار جعفری اور قتیل شفائی جیسے منفرد لہجے کے شاعر کی بابت بالکل نئے زاویوں اور نئی اپج کے ساتھ جانکاری کا اشتیاق رکھتے ہیں تو آپ کو اولین فرصت میں شب خون کتاب گھر، الہ آباد، کاروانِ ادب بھوپال، انجمن ترقی اردو دہلی سے رابطہ کرنا چاہئے جہاں جناب ایوب واقف کی تازہ تنقیدی و تحقیقی کتاب "شعور و ادراک" صرف دو صد پچاس روپے ہندوستانی میں دستیاب ہے۔

اردو افسانہ .... تجزیے

O "کفن" کی موضوعاتی تعبیر پر اور اس کے فنی امتیاز کے تجزیے سے جہاں پریم چند کے دیہاتی معاشرے خاص کر غریب طبقے کی زندگی کے مسائل کے گہرے شعور کا پتہ چلتا ہے وہاں افسانے کے فن پر منشی پریم چند کی دسترس بھی ثابت ہوتی ہے۔

O افسانے کے واقعات اس طرح سوگندھی سے گندھے ہوئے ہیں کہ افسانہ تمام تر سوگندھی کے کردار کا افسانہ بن گیا ہے۔ سعادت حسن منٹو نے انتہائی چابکدستی، خود ضبطی اور اختصار سے ایک جسم فروش عورت کی داخلی زندگی کی ایک نازک نفسیاتی واقعے کی مدد سے افسانے کی شکل میں مصوری کی ہے۔

تخلیقِ عصر .... عطیہ سکندر علی

تازہ تصنیفات کا تعارف

ماں میں تھک گیا ہوں

(اپنی کہانی اپنی زبانی)

○ مدینہ منورہ سے باہر نکلے تو ہر کوئی یوں پلٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا جیسے کوئی قیامت خیز شے چھن گئی ہو۔

○ مجھے یہاں بنگلے والے کمزور کر گئے ہیں کہ ابھی لندن کی خلافت جاتی ہے تو اس میں ڈرامے یا کنڈیکٹر شمار ہوں گے۔

○ دونوں ڈپٹی سیکرٹری (سجاد حیدر اور ڈاکٹر مسعود) ملتان کالج پڑھانے آئے تھے۔ لیکن تھے دونوں بڑے سیانے۔ ان کے ساتھ کام کرنے میں بڑا لطف آیا۔

○ اب سوچتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ مجھے کالا سر پڑھا کر یا لوگوں نے اپنا ہی نقصان کیا۔ پہلے جنرل ضیاء کو ڈر تھا یہ وزارت کا آدمی ہے۔ دوسرے صاحب کو کن باتوں کی پٹی کرنے کا کا تھا جو ظاہر معلوم ہوا یہ اپنے آدمیوں کو نوازنے کو وقت دفتری ہیر پھیر کیوں نہیں سمجھاتی۔

○ ہمارے ہاں بچہ دنیا میں آتا ہے تو ہم اس کے کانوں میں اذان دیتے ہیں۔ جتنی دو چیزیں ہی پھونکتے ہیں ایک یہ کہ لیڈر جو کہتا ہے وہی ٹھیک ہے دوسرے یہ کہ غیر ملکی سے بڑھ کر کوئی شیطان نہیں ہوتا۔

○ مجھے چونکہ اس جنس کا تھوڑا بہت تجربہ تھا جسے پرنسپل کہتے ہیں اس لئے میں نے دور رہنے کی کوشش کی لیکن ڈاکٹر احسن کی ذات میں ایسی مقناطیسی قوت تھی کہ بندہ خود بخود ان کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔

○ میری نانی بتلایا کرتی تھیں کہ جب میری شادی ہوئی تو وہ بمشکل چودہ برس کی تھیں۔ گاؤں کی گلیوں میں سکھیوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے کسی نے زور سے پکار کر انہیں کہا تمہاری بارات آئی کھڑی ہے اور تم گلیاں ناپ رہی ہو۔

○ ایک اور معاملہ لیبیا کے شہر غازی میں قائم پاکستانی سکول کی ایک طالبہ کا تھا اس کا نام سکول کی نااہلی کی وجہ سے بورڈ کو نہیں بھیجا گیا تھا۔ سکول کی انتظامیہ اپنی نااہلی کو چھپانے کے لئے یہ دلیل دے رہے تھے کہ بچی کے والد کا کنٹریکٹ ختم ہو گیا ہے۔

○ یونیورسٹی نے ایک غضب تو یہ ڈھایا کہ چار پانچ شعبے ایک ساتھ شروع کر دیے اور نئی عمارتیں وہاں تعمیر کیں جہاں کبھی سمندر ہوا کرتا تھا چنانچہ زیر زمین وہ کھارا پانی ابھی تک ابل آتا ہے۔ اور ہر دیوار میں دراڑ پڑ چکی ہے۔

○ اور باتوں کو چھوڑیے چھ سال اسکالرشپ کی قطعاً گنجائش نہ تھی۔ ایک خاتون انگریزی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے انگلینڈ پہنچیں تو ان کی انگریزی دیکھ کر پہلے انہیں ایم اے کرنے کا مشورہ دیا گیا۔

○ ایک روز کیا دیکھتا ہوں کہ وزیر اعظم ہاؤس سے ایک درخواست میلوں کا سفر طے کر کے آئی ہے لب لباب یہ تھا کہ وزارت تعلیم میں یکون جاہل، ان پڑھ اور بیوقوف TJEA آ گیا ہے جسے قصور کا پتہ ہے نہ قانون کا۔

○ ماں کی سادگی کا تو یہ عالم تھا کہ دیوالی میں ایک بار ان کے ہاتھ سے گر کر پلیٹ ٹوٹ گئی تو گھر بیٹھ کر ٹوٹے ٹکڑے لے کر بیٹھ گئیں اور پلیٹ جوڑنے لگیں۔

○ ادبی محفلوں میں، میں اکثر نہیں جاتا تھا۔ ایک تو وقت نہیں ملتا تھا دوسرے میرا خیال تھا کہ ہم اپنا حصہ ڈال چکے اب نوجوانوں کو آگے بڑھ کر اسٹیج سنبھالنا چاہئے۔

○ ہمیں اصل تکلیف یہ تھی کہ اس قسم کے کام غیر ملکی اداروں سے حاصل کئے گئے قرضوں کے بھروسے کئے جا رہے تھے۔ غیر ملکی قرضوں کی بھی ایک ہی رہی۔ ہم تو ایک مدت سے غیر ملکی قرضے کھائے پیے اور اوڑھے چلے آ رہے ہیں۔

"معاف کیجئے گا میں سہانے خواب نہیں دکھا سکتا نہ ہی سبز باغوں میں لے جا سکتا ہوں۔ چھ سو سے زائد صفحات میں اور اب بھی کیسے میں زہر ہلاہل کو قند کہہ دوں؟ اس قوم کے ساتھ کس کس نے مذاق نہیں کیا کس کس نے آپ کو قوم کو...... چھوڑیے میں اپنی داستان یہیں ختم کرتا ہوں...... وقار بن الٰہی"

قیمت: تین سو روپے دستیاب: جنگل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد۔

سیدِ سخن

کسی بھی تخلیق، کتاب یا صاحبِ قلم کے تعارف اور تبصرے میں شخص مذکور کی تعریف کم از کم اردو ادب میں لازمی تصور کی جاتی ہے حالانکہ نقد و نظر کا تقاضا اس طرز کے قطعی متضاد ہونا چاہئے۔ چونکہ پیشِ نظر اس وقت ہمارے ایک ایسے مجلد اردو ہیں جن کی بابت بہت کچھ کہا اور لکھا جا سکتا ہے مگر رہ رہ اس وقت ان کی تازہ علمی کاوش "سیدِ سخن" ہے جی ہاں! آپ ہم سب بلکہ اردو ادب سے وابستہ ہر فرد ڈاکٹر سید تقی عابدی کی اردو زبان اور اردو ادب سے محبت، جاں نثاری اور دردمندانہ پیش بندی سے بخوبی آگاہ ہیں چنانچہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کی ہر کاوش اور ہر تخلیق کو نہ صرف اہلِ زبان نے پذیرائی حاصل ہوا کرتی ہے بلکہ سنجیدہ علمی اور ادبی حلقے ڈاکٹر سید تقی عابدی کی لگن اور جستجو کی داد بھی دیتے ہیں، استفادہ بھی کرتے ہیں اور مستقبل کی بابت ڈاکٹر سید تقی عابدی سے بہتر توقعات بھی وابستہ کئے ہوئے ہیں۔ "سیدِ سخن" ڈاکٹر سید تقی عابدی کے تحقیقی اور تنقیدی مقالات کا ایسا مجموعہ ہے جس میں ڈاکٹر صاحب محترم نے "غالب کی فنی غزل کا اجمالی تجزیہ" مثنوی مرزا دبیر "معراج نامہ کا ادبی معیار" "مرزا دبیر اور دیارِ نجف" "روپ کنور کماری" "فسانہ یا حقیقت کے عنوان سے تشریح اور عطا کر کے نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے فن و شخصیت کا مختصر جائزہ" "شاید اسی کا نام محبت ہے" کے عنوان،

علامہ اقبال اور ملک اختر اکرامی یا ایم مہربان صاحب اور محترف "نظم اردو" کے عنوان سے ناطق لکھنوی کی شخصیت و فن کے نئے زاویے "میدان رباعی کا شہسوار" کے عنوان سے مرزا سلامت علی دبیر کے فن پر نئی طرز کی جستجو، عمر خیام کی حیات کا نامہ "اتنا تو ہمیں جاننا چاہئے" کے عنوان سے بے پناہ نادر معلومات کی حامل ہے۔ "غالب کا آفاقی فن" "علامہ اقبال کا 'سیماب' کو" "علی بخش" "غزل کی تحقیقی پہچان" میں ڈاکٹر شان الحق کی شخصیت اور فن کو بھرپور طریقے سے روشن اور نمایاں کیا ہے۔ "میر انیس کی جزئیات نگاری" "زیرا کی جھلک دبیر کے کلام کی روشنی میں" "حدیث دل" کے عنوان سے عارفانہ کلام کی تاریخ اور اہم شعرا زیر بحث لائے گئے ہیں۔ "علامہ اقبال کا جلوس جنازہ" کے عنوان سے شاعر مشرق علامہ اقبال کے جنازے کی تفصیل مہیا کرتا ہے جس میں خصوصیت کے ساتھ غازی علم دین شہید کے جنازے کا ذکر بھی رقم ہے "علامہ اقبال کی آخری رات" کے عنوان سے علامہ کی آخری خواہش اور احباب کی متضاد بیانی سے نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جدید مرثیہ میں حضرت صبا اکبر آبادی کا مقام، علامہ اقبال کی تاریخ گوئی، شبلی کے بیانوں سے دبیر کی مثنوی، اقبال کا فلسفۂ تقدیر، مراثی دبیر میں استعاراتی نظام کا جائزہ کے عنوان کے علاوہ اور بھی بہت سے اہم اور وقیع عنوانات کو بحث کا موضوع بنا کر نئے گئے اور نئے حقائق و مفہوم حیرت ریزی سے اجاگر و نمایاں کئے گئے ہیں۔ اس کی مثال کم کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اس علمی تخریج پر خدا معلوم ڈاکٹر صاحب محترم نے قیمت اور دستیابی کا پتہ درج کرنا کیوں مناسب نہ جانا۔ دلچسپی کے حامل احباب کے لئے پبلیشر کا پتہ درج کیا جاتا ہے۔ شاہد پبلی کیشنز: 2253 کوچہ چیلان، دریا گنج دہلی۔

شعور و ادراک

"یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ "شعور و ادراک" کی اشاعت سے اردو کے تحقیقی و تنقیدی شعبے میں ایک اچھا اور معیاری اضافہ ہوا ہے۔ نور محمد شاہ کامیاب جونپوری کی "نور دولت" اور سید قادر میاں خوشتر احمد آبادی کے مرثیوں کے بارے میں اتنی تفصیلی معلومات اس کتاب کے ذریعے حاصل ہو سکی ہیں۔ دیگر مشمولات بھی سیاق عبارت کے اعتبار سے خوب ہیں۔ خدا جناب ایوب واقف کو سلامت رکھے تا کہ وہ اسی طرح اعلیٰ اور وقیع تنقیدی و تحقیقی "شعور و ادراک" کی شکل میں شائقین علم و ادب کی خدمت میں پیش کرتے رہیں..... "رشید حسن خان

"شعور و ادراک" کی شکل میں جناب ایوب واقف نے بڑا اچھا اور خوبصورت تحفہ ارسال کیا ہے۔ ایوب واقف کے قلم میں غضب کی طاقت ہے۔ تنقیدی و تحقیقی مضامین ہوں یا تاثراتی تحریریں ہر جگہ جناب ایوب واقف کے جوہر شناس قلم نے قابل قدر نقوش قائم کئے ہیں۔ خدا اور کریم جناب ایوب واقف کو ایسی ہی توفیق سوچ عطا فرمائے تا کہ اردو ادب میں اسی طرح نئی نئی اور سچی آخرین کتابوں کا اضافہ ہوتا رہے"...... نثار احمد فاروقی

"شعور و ادراک" کا پہلا ایڈیشن 1991ء میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت رومانیہ کے کمیونسٹ ملک پر زوال آیا تھا۔ اس کا حکمران نکولائی چاؤشسکو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا تھا۔ اس وقت میں نے زیر نظر کتاب میں سوویت یونین کے زوال اور ٹوٹ پھوٹ کی پیشین گوئی بھی کی تھی۔ اب جبکہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن چھپ رہا ہے تو میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ سوویت روس کی نا دانی نے متحدہ امریکہ کو انتہائی طور پر بے لگام کر دیا ہے۔ جس ظلم و جبروت کو ماضی میں برٹش سامراج نے اپنے لئے روا رکھا وہی سب کچھ اب امریکہ جمہوریت کے فروغ کے نام پر کر رہا ہے لیکن ہمیں یقین کامل ہے جس طرح روس کی بے پناہ طاقت افغانستان کی خطرناک دلدل میں پھنس کر تہس نہس ہو گئی تھی ٹھیک اسی طرح فاشسٹ اور استعماریت پسند امریکہ کی بے پناہ طاقت اور قوت کا خاتمہ بھی افغانستان اور عراق میں ہوگا"...... محمد ایوب واقف

اوپر کی سطور میں آپ نے دو محترم اور جید صاحبان علم و ہنر کی آرا "شعور و ادراک" کی بابت ملاحظہ فرمائیں۔ تیسرا اقتباس "شعور و ادراک" کے مصنف جناب ایوب واقف کے دیباچے سے لیا گیا ہے جس کی روشنی میں آپ کتاب ہذا کی بابت یہ اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں کہ اس کتاب میں کس پایہ کا تنقیدی و تحقیقی کام کیا گیا ہے اور کیوں اس کے دوسرے ایڈیشن کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ اگر آپ پروفیسر نجیب اشرف، نور محمد شاہ جونپوری، محمد قلی قطب شاہ، خواجہ احمد عباس، صباح الدین عبدالرحمن، منشی شیوبرت لال کی ادارت میں نکلنے والے مشہور زمانہ جریدے "زمانہ"، سید جواد علی زیدی کے مشہور و معلوم افسانے "پاروؤ"، ایشیا کی عظیم تخلیق قرۃ العین حیدر، اردو ہندی کا مسئلہ، جوش ملیح آبادی اب ہندوستان نہیں کہتے، سیتا کل سے لندن کوٹ تک، آخر الزمان، خواجہ حسن نظامی، شبلی نعمانی اور موازنہ انیس و دبیر، کرشن چندر کا فن، علی سردار جعفری اور قتیل شفائی جیسے منفرد لہجے کے شاعر کی بابت بالکل نئے زاویوں اور نئی اپج کے ساتھ جانکاری کا اشتیاق رکھتے ہیں تو آپ کو اولین فرصت میں شب خون کتاب گھر، الہ آباد، کاروان ادب، بھوپال، انجمن ترقی اردو دہلی سے رابطہ کرنا چاہئے جہاں جناب ایوب واقف کی تازہ تنقیدی و تحقیقی کتاب "شعور و ادراک" صرف دو صد پچاس روپے ہندوستانی میں دستیاب ہے۔

اردو افسانہ.... تجزیے

○ "کفن" کی موضوعاتی تعبیریں اور اس کے فنی امتزاج کے تجزیے جہاں پریم چند کے دیہاتی معاشرے خاص کر غریب طبقے کی زندگی کے مسائل کے گہرے شعور کا پتہ چلتا ہے وہاں افسانے کے فن پر منشی پریم چند کی دسترس بھی ثابت ہوتی ہے۔

○ افسانے کے واقعات اس طرح سوگندھی کے گرد بنے ہوئے ہیں کہ افسانہ تمام تر سوگندھی کے کردار کا افسانہ بن گیا ہے۔ سعادت حسن منٹو نے انتہائی چابکدستی، خود ضبطی اور اختصار سے ایک جسم فروش عورت کی داخلی زندگی کی ایک نازک نفسیاتی واقعے کی مدد سے افسانے کی شکل میں مصوری کی ہے۔

O یہ درست ہے کہ افسانے کا پس منظر اور کرداروں کا ظاہری عمل واقعہ تقسیم کی یاد دلاتا ہے چنانچہ افسانے کا پہلا ہی جملہ ''بٹوارہ'' ملک کے تاریخی واقعے کا بیان ہے۔ افسانے کا متذکرہ بالا حقیقت پسندانہ واقعات بدیہی طور پر افسانہ نگاری کے حقیقت نگارانہ مسلک کی گواہی دیتا ہے۔

O ''آدھے گھنٹے کا خدا'' میں کرشن چندر نے فن کے بنیادی اصول کو ملحوظ رکھا ہے جس کی رو سے فن پارہ فنکار کی جانب سے عائد کردہ نظریے، خیال یہاں تک کہ اس کی اصلی شخصیت سے بھی صرف نظر کر کے اپنے آزاد امکان پذیر وجود کو پہنچنے کا موقع دیتا ہے۔

O ''خواب اور تقدیر'' موضوعی افسانہ نہیں ہے۔ بعض لوگ اسے عصری موضوع یعنی ہجرت، سیاسی تشدد یا مسلم آئیڈیلزم کا افسانہ قرار دیتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے وہ افسانے کی تخلیقی حیثیت سے زیادتی کا ارتکاب کرتے ہیں۔

O جہاں تک راوی کا تعلق ہے وہ افسانے کے شروع سے آخر تک قصے کے تحرک، بالیدگی اور پہلوداری پر متصرف رہتا ہے تاہم وہ اس کی اپنی سمت و رفتار متعین کرنے میں مزاحم نہیں ہوتا۔ افسانے میں ماضی بعید اور ماضی مطلق کے ساتھ فعل استمرار استعمال ہوا ہے یوں افسانہ روایتی زماں کی پابندی کرتا ہے اور ماضی و حال کے خانوں میں بٹا ہوا نظر آتا ہے۔ اس لحاظ سے قرۃ العین حیدر کا افسانہ ''قلندر درمیاں ہے'' ایک حقیقت پسندانہ افسانہ ہے۔

O کہانی کا ابتدائی جملہ ہی ''کمرے سے سڑک اس طرح نکل رہا ہے جیسے بندر نے خوشی کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنی اگلی ٹانگوں کو اوپر اٹھا رکھا ہو'' نہ صرف کہانی کے مرکزی کردار کی بشری سطح پر غیر معمولی جذباتی کیفیت کی غمازی کرتا ہے بلکہ اسے بالکل بندر سے مشابہ کر کے اس کے جبلی وجود کی اصلیت کو بھی بے نقاب کرتا ہے۔ اسی طرح جوگندر پال کا افسانہ ''بھائی چند'' ایک سیدھا سادہ افسانہ ہونے کے باوجود معنوی تہہ داری پر محیط ہے۔

O افسانہ ''سرنگ'' پڑھ کر فوری طور پر یہ بنیادی سوال سر اٹھاتا ہے کہ کیا افسانے کے واقعات واقعی ہوتے ہوئے بھی اپنی غیر مصنفیت کی بنا پر ڈراؤنے خواب معلوم ہوتے ہیں۔ جن سے متکلم سرنگ میں شخصی طور پر گزر رہا ہے۔ افسانہ اس خوف و دہشت کا علامتی اظہار بھی ہے جو کل المیاتی دور سے خارج کے جابرانہ حالات کے دباؤ میں انسان کی عدم تحفظیت کے احساس کا پیدا کردہ ہے۔

O رشید امجد نے ''دشت امکاں'' میں مشکل سے گزارا کرنے والے ایک سرکاری ملازم کی گھریلو زندگی کی ایک جھلک نظر دکھائی ہے۔ یہ گھرانا، اس کے بیٹے اور اس کی بہنوں پر مشتمل ہے۔ بظاہر ''دشت امکاں'' ایک سیدھا سادہ حقیقت پسند افسانہ ہے مگر اس کا غیر معمولی تخیلی وصف حقیقت کو خواب کی سرحد تک لے جاتا ہے۔

O منشا یاد کے افسانے ''اودھ ماتم'' میں معاشرتی طبقہ بندی کے نتیجے میں نچلے طبقے کے لوگوں کو جن ذہنی الجھنوں اور نفسیاتی انتشار و ابتری کا شکار رہنا پڑتا ہے اس کی مصوری باریک بینی سے کی گئی ہے۔

O جیلانی بانو ''اجنبی چہرے'' میں کسی عائد کردہ موضوعیت کے بجائے اس کے بطن سے نمو پذیر تجربے کا بیان دلچسپ انداز میں کی ہے۔ جیلانی بانو نے زبان کے بیانیے میں جو اختصار، اشاریت، ایمائیت اور تہہ داری برتی ہے وہ اس افسانے کو بیانیہ کے بجائے کردار و حالات کا ایک زندہ اور دلپذیر نمونہ بناتا ہے۔

O ظاہر ہے پورا افسانہ متکلم کی نفسیاتی شخصیت کے ایک نازک اور انوکھے پہلو کو اشاروں کنایوں میں پیش کرتا ہے۔ متکلم شعوری سطح پر زندہ رہتے ہوئے بھی بعض لاشعوری محرکات کے تابع ہے۔ افسانے کی کامیابی اس بات میں ہے کہ مرزا حامد بیگ نے اپنے افسانے ''آوازیں'' اختصار کے ساتھ سیدھی سادی مگر اشاراتی زبان میں ایک ایسی تخیلی فضا قائم کی ہے جو قاری کے انجذاب و تحیر کا باعث بنتی ہے۔

ڈاکٹر حامدی کاشمیری کی تہہ دار اور معنی آفریں کتاب کے صفحات دو سو اون، پیپر بیک، قیمت 225 روپے، دستیابی: مکتبہ جامعہ بھوپال، مکتبہ جامعہ دہلی، مکتبہ جامعہ ممبئی، مکتبہ جامعہ علی گڑھ

حساب جاں

میرے پہلے مجموعہ غزلیات ''برگ سبز'' پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب ظ۔ انصاری نے غالب اور فیض کے اثرات کی نشاندہی بعض اشعار پر کی تھی۔ میں حیرت زدہ ہوا اس کے بعد میں نے پوری احتیاط برتی کہ ہر شعر میری اپنی آواز اور میرے اپنے انداز سے متشکل ہو اور اس پر کسی قدیم و جدید شاعر کا عکس نہ پڑے۔ میں نے میر، غالب، انیس، اقبال، جوش، فیض، سردار جعفری، مخدوم، یگانہ سبھی کا مطالعہ کیا ہے، ان سے بہت کچھ سیکھا بھی ہے لیکن میں ان میں کسی شاعر کا بھی معنوی شاگرد نہیں ہوں۔ مجھے داغ، جگر، حسرت، فراق اور شاد بھی بہت پسند ہیں کیونکہ یہ سب بڑی آب و تاب کے شاعر ہیں ان کے یہاں جس طرح کے جمالیاتی حظ کا احساس ہوتا ہے وہ جگر کے زمرے میں آتا ہے۔ میں نے از خود زبان و قواعد کے اعتبار سے اپنی شعر گوئی پر کچھ خاص پابندیاں عائد کرلی ہیں۔ میرے اشعار میں لفظ ''اور'' ہر جگہ پوری آواز کے ساتھ نظم ہوا ہے۔ میں نے کہیں بھی وزن پورا کرنے کے لئے ''اور'' کے بجائے ''ور'' کا استعمال نہیں کیا ہے۔ مصرعوں میں پاس پاس ایک ہی حرف کی تکرار سے بھی میں نے پرہیز کیا ہے۔ میری کوشش رہی ہے کہ شعر میں آنے والا ہر لفظ اپنی پوری آواز کے ساتھ موزوں ہو کر تکمیل کرواتا ہو۔ لفظ ''یوں'' کو اکثر شعرا وزن ''یہ'' باندھنے لگے ہیں۔ میں نے ہمیشہ اس سے بھی احتراز برتا ہے۔ اپنی کمین گاہ میں بیٹھ کر اپنی خامیوں کی خود گرفت کرنا سخت مشکل عمل ہے۔ اصل فیصلہ ''حساب جاں'' پڑھنے والوں کو ہی کرنا ہے..... ماہی انصاری

ایک مجھ تک نہ گیا جنبش خرد سے ماہی
ہم تو دیوانے ہیں بس طرز سخن بوتے ہیں

جناب ماہی انصاری کے اپنے طرز سخن کی بابت ارشادات آپ نے

ملاحظہ فرمائے۔ مناسب یہی ہے کہ چلتے چلتے ناصر انصاری صاحب کے طرزِ سخن سے کچھ حظ بھی اٹھایا جائے جس کی روشنی میں ”حسابِ جاں“ کی بابت کیت سے کوئی رائے قائم کرنے میں تو شاید زیادہ مدد نہ مل سکے البتہ ”حسابِ جاں“ کی نسبت آپ کے اشتیاق کو مہمیز ملنے کا قوی امکان ضرور ہے۔

میرا سفر بھی عجب دشتِ بے کنار میں ہے
بڑھو کہیں چلوں پھر بھی گھر نہ آئے گا

اگرچہ اس کا تکبر زیاں کا سودا ہے
وہ خود پرست کبھی راہ پر نہ آئے گا

وہ اور لوگ تھے جو حرفِ حق پہ مر گئے تھے
فرازِ دار پہ اب کوئی سر نہ آئے گا

حصارِ جسم سے باہر بہت اندھیرا ہے
یہاں سے کوئی چراغاں نظر نہ آئے گا

سخن کے نام پہ کہتے رہو غزل ناصرؔ
تمہیں کچھ اس کے سوا عمر بھر نہ آئے گا

O

دل کے ہر گوشے میں اک تازہ سماں دیکھتے ہیں
ہم تو اس آئنہ خانے میں جہاں دیکھتے ہیں

کسی پہلو سے نہیں عافیتِ جاں کی خبر
چشمِ اغیار کو ہر سُو نگراں دیکھتے ہیں

ان کے ماتھے پہ تو ہے سطوتِ شاہی کا جلال
سادہ دل بندوں کی آنکھیں کہاں دیکھتے ہیں

جن کو جینے کا سلیقہ ہے نہ دم سازی
ان کے ہاتھوں میں بھی اب رطلِ گراں دیکھتے ہیں

O

حسن تمام کہتے ہیں مشغلِ جاں سمجھتے ہیں
حیلہ گرانِ شہر کو لوگ کہاں سمجھتے ہیں

جرعہ کشانِ وقت کو جامِ سخن سے کیا غرض
یہ تو فقط حکایتِ سود و زیاں سمجھتے ہیں

وجہِ ستم کچھ اور ہے ورنہ انہیں ہے سب خبر
اہلِ درد سنتے ہیں، نوحۂ جاں سمجھتے ہیں

O

سرخرو ہو کے رہے جاہ و حشم والے
زورِ شاہاں نہ چلا زورِ قلم کے آگے

پشت پر کچھ بھی نہیں، دامِ ہوا، سنگِ صدا
کیسا طوفاں ہے کہ چلتا ہے قدم کے آگے

”حسابِ جاں“ ایک سو ساٹھ صفحات پر محیط ہے جو فقط ایک سو میں روپے کے عوض آپ کے التفات کی طلبگار ہے۔ دستیابی کا پتہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی (بھارت)۔ مصنف کا پتہ: 99/295 نالہ روڈ، چمن گنج کانپور، بھارت۔

اردو کی نئی بستیاں

O محمد ممتاز راشد نے ادبی زندگی میں بھرپور شرکت کی ہے۔ ان کے پانچ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ دو شعری مجموعے اور تین نثری کتب زیرِ اشاعت ہیں۔ قطر کی قدیم ترین ادبی تنظیم ”بزمِ اردو قطر“ کی صدارت بھی بحسن و خوبی نبھا رہے ہیں۔ جناب محمد راشد ادبی تنظیم ”ادارہ خیال و فن“ کے بانی بھی ہیں۔ اس تنظیم کے زیرِ اہتمام مشاہیرِ ادب کی یاد میں نشستیں منعقد کی جاتی ہیں جن میں اعتبار کے حامل مضامین پڑھے اور شائع کیے جاتے ہیں۔

O اردو کی نئی بستیوں میں جن شاعروں نے اپنی منفرد پہچان قائم کی ہے ان میں ڈاکٹر حنیف ترین کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی آواز ایک سنجیدہ شاعر کے روپ میں نمایاں ہوئی ہے۔ ان کی شاعری کی دھوم دور دور تک سنائی دے رہی ہے اور سنجیدہ ادبی حلقوں میں ان کا نام ہر جگہ لیا جا رہا ہے۔ ”بابِ صحرا“ سے ”کشتِ غزل“ تک کئی شعری مجموعے پیش کرنے کے بعد غزل اور نظم کے ممتاز شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔

O یعقوب تصور غزل کا ایک معتبر نام تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کے پہلے شعری مجموعے ”پیشِ وقت“ کی بابت ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، پروفیسر سحر انصاری، محسن بھوپالی جیسے نقاد اور شاعر اور ادیبوں نے خوب خوب ستائش سے نوازا تھا جس سے ان کا شاعرانہ مرتبہ بلند تر ہو گیا۔ اس کے علاوہ احمد ندیم قاسمی صاحب بھی جناب یعقوب تصور کو منظوم خراجِ تحسین پیش کر چکے ہیں۔

O اقبال فریدہ سروری عالمی شہرت یافتہ مصور کی حیثیت سے ساری دنیا میں علیحدہ شناخت کے مالک ہیں۔ انہیں نہ صرف بے شمار ایوارڈز، انعامات اور اعزازات مل چکے ہیں بلکہ ڈاکٹر ذاکر حسین اور اندرا گاندھی جیسی بلند پایہ شخصیات

سے بھی اقبال فریدی صاحب داد وصول کر چکے ہیں۔ اقبال فریدی صرف تو عالمی پائے کے ہیں ہی شاعر بھی باکمال کے ہیں۔ جناب آل احمد سرور، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور مالک رام جیسی ہستیوں نے جناب اقبال فریدی کی شاعری کو سراہا ہے۔

○ برطانیہ کو اس وقت اردو کے تیسرے بڑے ادبی مرکز کی حیثیت سے جانا جاتا ہے یہاں آئے دن ادبی نشستیں، مشاعرے، مذاکرے، سیمینار منعقد ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سے معیاری ادبی رسالے اور اردو کے اخبارات پابندی سے شائع ہوتے ہیں۔

○ مقبولیت اور ہر دلعزیزی کی جو سند گلشن کھنہ کو حاصل ہے وہ برطانیہ میں مقیم بہت کم اہل قلم کے حصے میں آئی ہے۔

○ حمیدہ معین رضوی کی کہانیوں میں مغربی ماحول کی عکاسی کے ساتھ مسلم معاشرے کی تہذیب اور زندگی کے دیگر مسائل اور موضوعات کو خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

○ ساحر شیوی لندن میں مقیم ہیں اور بہت جلد انہوں نے ایک منفرد مقام بنایا ہے وہ ایک اچھے شاعر اور ادیب کی حیثیت سے نہ صرف ادبی دنیا میں معروف ہیں بلکہ اپنے ادبی کارناموں کی وجہ سے ہر جگہ اور ہر مقام پر یاد کئے جاتے ہیں۔

○ ماسی کاشمیری کے ماہیوں میں سیاست، محبت، وفا، خلوص، آگ، شعلے، بیکلی، خوشی، غم، سنسانی وغیرہ سب کچھ موجود ہے۔

○ سعید روشن اپنی شاعری میں تازہ ہواؤں کے دریچے وا کرتے رہے ہیں۔

○ ڈاکٹر سجاد حیدر نے "صحرا کے پھول" میں ادب کو منفرد ذائقے سے متعارف کرا کر وہ کام کیا ہے جو اب تک کوئی نہ کر سکا۔

○ اردو کی نئی بستیوں میں نثر نگاری میں منفرد پہچان بنانے والوں میں ایک نمایاں نام بانو ارشد کا ہے۔

○ رشیدہ عیاں امریکہ میں مقیم مشہور شاعروں اور ادیبوں میں منفرد حیثیت اور جداگانہ مقام کی حامل ہیں۔

○ سید جعفری امیر امریکہ میں مقیم نئی نسل کے نمائندہ شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔

○ اطہر رضوی نے اپنے تازہ سفرنامے "اگر ہم بہ راہ مانیں" میں ہندوستانی تہذیب کے اپنے نادر نمونے پیش کئے ہیں کہ پڑھنے والے کو اپنی تہذیب و ثقافت پر فخر ہونے لگتا ہے یہ ایک سفرنامہ ہی نہیں بلکہ لندن شہر اور وہاں کے ادیبوں کی مختصر تاریخ بھی ہے۔

مذکورہ بالا نمونہ ہائے تحریر ڈاکٹر سیفی سرونجی کی تازہ تصنیف "اردو کی نئی بستیاں" سے آپ کے اشتیاق کو مہمیز کرنے کی غرض سے درج کی گئی ہیں۔ اگر آپ اردو کی نئی بستیوں کی بابت تفصیل سے آگاہی کے آرزومند ہیں تو آپ کو فرصت میں ڈاکٹر سیفی سرونجی کی تازہ تصنیف "اردو کی نئی بستیاں" کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔ "اردو کی نئی بستیاں" ایک سو ساٹھ روپے کے بدلے [illegible] پبلی کیشنز سرونج۔ ساہتیہ کاروان ادب، گوری بھوپال۔ مرکز ادب، ایم اے ایل ایل بی کالج بھوپال سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

سفر کو ہمسفر جانا

"دلاور صدیقی کی شاعری رومان پرور تجربے کی صداقت کی دلیل ہے یہ ایک جذباتی آرزومندی ہے جو بے چین اور بے قرار لمحوں کو امر کر دینا چاہتی ہے.....ڈاکٹر شاہد ماہلی"

زندگی بھر کا اثاثہ

میری ذات سے ادھر کبھی کوئی چیز بھی کیا لوٹ کر نہ آئے گی؟ اس دل کی جانب لوٹ کر چلے تھے جس پہ زندگی بھر کا اثاثہ دو آنسو کافی ہیں ایک تم سے ملنے کی خوشی میں ایک تم سے بچھڑنے کے غم میں اتنا بہت سرمایہ اب واہی نہ رہی میرے احساس کی زمین بھی پیاسی نہ رہی!!!

"دلاور صدیقی کی نظمیں ایسے شاعر کا اشارہ نما ہیں جو دوستی، محبت، خلوص کو زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ جانتا ہے.....صبا اکرام"

تتلی میرا دل بن گئی تھی:

جب تم نے میری ہتھیلی پہ ہاتھ رکھا نظر کی زنجیر سے دل کو جکڑ کر اس سیدھی ترچھی لکیروں کو دیکھا تھا دھڑکنوں کے شور میں ابھی نہ سکا لیکن زیر لب تم نے مجھ کو کہا تھا ان لکیروں میں نہیں آ جاتے ہو خوبصورت انداز میں اتنا سکون ملا تھا شاید وہی زندگی بھر کے رتجگوں کا صلہ تھا ہونٹوں پہ مسکراہٹ ایسے آ گئی تھی اوس قطروں کے درمیان خوش گوار بہاروں کی آہٹ اس قدر عیاں تھی اس پر دل کی دھڑکن جذبوں کی شادابی سے ہجر کی شاموں کے غازۂ نظر کے قریب انداز میں سوچتا ہوں اس لمحے تتلی میرا دل بن گئی تھی اگر دل ہتھیلی پہ آ گیا تھا یا چاک کیسے ادھر کے جذبوں میں ساون چھا گیا تھا میں بے خبر تھا سارے جہاں سے اور نظر میں ایک جہاں آ گیا تھا!!!

"مسکراتے ہوئے نوجوان شاعر اور صحافی دلاور صدیقی کو فن کے اس محبت بھرے ادبی سفر کی سوغات کے اشاعتی موقع پر مبارکباد پیش کرتا ہوں.....عدیم ہاشمی"

انمول ایک عہد کے ویرانے میں اک آس کے سائے میں پاؤں کے آبلوں نے دشت کے کانٹوں سے الجھ بجھائے ہیں دھوپ کی کشتی میں ان پلکوں کے آنسوؤں نے ساون برسائے ہیں اشک وفا نے ان کے انداز جانے ان کے لمحے بھی تنہائی ہیں سمندر بھی شرمائے ہیں!!!

"دلاور صدیقی کی محبت اور زندگی سے بھرپور شاعری پڑھ کر عظیم شعر، حسن اور فن کی یاد آ جاتی ہے.....ڈاکٹر شہناز"

"سفر کو ہمسفر جانا" کی دستیابی مکان نمبر 35، گلی 57، ایف سکس ون سے سیف ایک سو پچاس روپے اور بیرون ملک 8 امریکی ڈالر یا 5 برطانوی پاؤنڈ کے عوض ممکن ہے۔

ڈرامہ

آج کی تازہ خبر

گلزار جاوید

سین نمبر 1

کردار: عنبرین۔ مہوش۔ صدف۔ فائزہ۔ اقصیٰ اور منال۔

مہوش: بڑی بور سی ہے یہ صبح (انگڑائی لیتے ہوئے) کچھ ہلا گلا کرو چھٹیاں تو بندے کو مٹی کا ڈھیر بنا رہی ہیں.....!

فائزہ: بالکل! بندے کے پاس اگر کرنے کو کچھ نہ ہو تو..!

منال: مثلاً آپ کے پاس کیا کیا ہے کرنے کو سوائے.....ر.....!

اقصیٰ: ابے یار.....ر.....پر آ کر تیری سوئی اٹک کیوں گئی؟ پتہ ہے میری امی کہا کرتی ہیں ش ش کرنے سے بہتر ہے ایک بار سری کہہ دو.....!

عنبرین: حضرت جبرائیل کی فلاسفی کم از کم میرے پلے بالکل نہیں پڑی.....!

صدف: خوبی! سیدھی بات تمہاری کھوپڑی شریف میں آتی کب ہے.....؟

عنبرین: مطلب.....؟

مہوش: مطلب یہ کہ.....ر.....ر..... کرنے سے بہتر نہیں کہ بندہ صاف صاف رومانس کہہ دے.....!

فائزہ: توبہ کرو توبہ..... تم لوگوں کے سروں پہ ہر وقت رومانس ہی سوار رہتا ہے اور بھی بہت سے موضوع ہیں گفتگو کے.....!

منال: مثلاً.....!

فائزہ: سیاست ہے، مذہب ہے، شعر و شاعری ہے.....اور.....اور.....تیری مونچھیں ہیں (اچانک شرارت کرتے ہوئے)

عنبرین: ہاں یار.....! تو اپنی پوزیشن بدل! میڈیکل چیک اپ کرا.....!

اقصیٰ: (حیرت سے) میڈیکل چیک اپ..... مگر..... کیوں.....؟

عنبرین: (برا سا منہ بناتے ہوئے) بندے کی جنس بھی تو بدل سکتی ہے.....!

فائزہ: ٹھہر تیری تو.....! (عنبرین کے پیچھے بھاگتے ہوئے) میری جنس بدلے نہ بدلے تیری شکل ضرور بدل دوں گی.....!

صدف: How interesting یار.....! آپس کی بات ہے اگر فرض کر کل کلاس ہم میں سے کسی ایک کی جنس تبدیل ہو جاتی ہے تو ہم سب کا رویہ اس کے ساتھ کیا ہو گا.....یا..... کیا ہونا چاہئے.....؟

اقصیٰ: ہو گا کیا.....؟ وہ ہم میں سے کسی ایک کو پروپوز کرے گا..... اور.....بس.....!

منال: بس کیا بھئی.....! آگے بھی تو کچھ کہو.....؟

مہوش: بڑی بے شرم ہے تو.....!

منال: چلو جی ہم بے شرم سہی آپ تو بڑی ستی ساوتری ہیں ناں (مہوش کی کمر میں دھپ مارتے ہوئے) اور سناؤ کیسا حال ہے.....؟ (آنکھیں مٹکاتے ہوئے)

مہوش: کیسا حال ہے مطلب.....؟

صدف: مطلب بھی صاف ہے اور اشارہ بھی..... یہ دوسری بات ہے کہ تم سمجھنا نہ چاہو.....!

مہوش: چلو چلو..... بکواس بند کرو..... وہ دیکھو بیل ہو رہی ہے پیریڈ شروع ہونے والا ہے.....!

صدف اور منال: (ہم آواز ہو کر) ہاں جی.....! اب تو ہماری باتیں تمہیں بکواس لگیں گی.....!

سین نمبر 2

کلاس روم

کردار: منال۔ عنبرین۔ اقصیٰ۔ فائزہ۔ مہوش۔ صدف۔

کلاس کی بہت سی لڑکیاں اور میڈم

میڈم: تمام سٹوڈنٹس کو میری جانب سے خوش آمدید۔ امید ہے آپ کی چھٹیاں عمدہ گزری ہوں گی۔ آپ لوگوں نے پڑھائی کے علاوہ اور کیا کیا کیا.....؟

کئی لڑکیاں ایک ساتھ: میڈم! ہم نے.....!

میڈم: اس طرح تو مسئلہ گھمبیر ہو جائے گا۔ چلو یوں کرتے ہیں گفتگو کی ابتدا نئے چہروں سے کریں۔ آپ کا کیا نام ہے.....؟ (آخری row میں بیٹھی ہوئی طرحدار لڑکی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے)

لڑکی: میڈم.....! میرا نام سارہ ہے میں وقار النسا کالج سے آئی ہوں میں نے بی اے میں تیسری پوزیشن حاصل کی تھی اپنی کلاس میں.....!

میڈم: کچھ اپنی ہابیز کے بارے میں بتائیں.....؟

سارہ: میڈم مجھے سونا بہت پسند ہے.....!

ایک آواز: آج کل بہت مہنگا ہے.....! (پوری کلاس کے کھلکھلانے کی آواز)

سارہ: (جھینپ کر ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے) میرا مطلب ہے مجھے نیند بہت آتی ہے.....!

میڈم: اور آپ.....؟ (درمیان کی row میں بیٹھی سانولی رنگت اور لانبے قد

والی لڑکی سے مخاطب ہوکر)

لڑکی: میڈم.....!میرا نام عزیزہ ہے میں کراچی کی رہنے والی ہوں۔میرے والد کی پوسٹنگ ہوگئی ہے اس لئے مجھے یہاں داخلہ لینا پڑا ہے.....!

میڈم: کراچی سے.....!بہت خوب' کچھ وہاں کے حالات' موسم اور بارشوں کی بابت بتلاؤ.....؟

عزیزہ: (سہمے ہوئے انداز میں دھیمی آواز کے ساتھ) بس میڈم سب کچھ ٹھیک ہی ہے.....!

منال: میڈم کچھ ہم سے بھی گپ شپ کریں..... ہم سوتیلے تھوڑی ہیں.....!

(کندھے اچکاتی ہوئی بیٹھ جاتی ہے)

میڈم: ہاں' ہاں کیوں نہیں . . . . . ! چلو تمہی بتلاؤ تمہاری چھٹیاں کیسی گذریں.....؟

منال: (کھڑے ہوکر دھیمے لہجے میں) بس میڈم کچھ خاص نہیں۔میرا ایک رشتہ آیا تھا میں نے شادی سے انکار کردیا اور اسی کی بابت سوچ سوچ کر ہلکان ہوتی رہی.....!

میڈم: کیوں.....؟

منال: (آنکھیں نیچی کئے ہوئے) میں.....میڈم.....وہ.....لڑکا مجھے پسند نہیں تھا.....!

میڈم: اچھا topic ہے آج کی گفتگو کا.....!ہر کسی کا کوئی نہ کوئی آئیڈیل be ہے مثلاً ایک آئیڈیل تو وہ be ہے جسے ہم اپنی زندگی کا ہیرو بنانا چاہتے ہیں۔جس کے اصولوں اور آدرشوں سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ایک وہ آئیڈیل be ہے جسے ہم خوابوں کا شہزادہ یا زندگی کا ساتھی کہہ سکتے ہیں۔آپ بتلایئے.....!آپ کے ذہن میں آئیڈیل کا تصور کیا ہے.....؟

تحریم: میں.....!میڈم.....میں.....میرے خیال میں.....!(پیریڈ ختم ہونے کی گھنٹی بجتی ہے اور گفتگو ادھوری رہ جاتی ہے)

سین نمبر 3

کالج کی کینٹین

کردار: صدف۔مہوش۔منال۔اقصیٰ۔تحریم

فائزہ۔کینٹین کا مالک۔چند ملازمین۔

اکلوتا ویٹر ارشاد عرف للّا اور بہت سی سٹوڈنٹس۔

تحریم: یار.....!یہ للّا سالا آج تنگ کیوں نہیں کر رہا.....؟

منال: اس کا تو باپ بھی کرے گا.....!(سر نیچے کرکے دونوں انگلیاں منہ میں ڈال کر سیٹی بجاتی ہے۔ہال میں بیٹھی ہوئی تمام لڑکیاں متوجہ ہوکر چاروں جانب دیکھنے لگتی ہیں۔کینٹین کا مالک اور اس کے ملازمین بھی چونک کر ایک دوسرے کو استفہامیہ انداز میں دیکھنے لگتے ہیں۔کینٹین کا اکلوتا ویٹر ارشاد عرف للّا دوڑتا ہوا ٹیبل کی جانب آتا ہے)

ارشاد: جی باجی جی.....جی.....!

اقصیٰ: ارشاد بھائی.....مزاج شریف کیسا ہے آپ کا' امید ہے طبیعت' حال' چال' ڈھال بھی ٹھیک ٹھاک ہوں گے.....!

ارشاد: جی اللہ کا شکر ہے جی..... آپ سنائیں آپ کیسی ہیں.....؟

اقصیٰ: میں.....!میں تو بالکل ٹھیک ہوں..... آپ کو کیسی لگ رہی ہوں؟ (اٹھلاتے ہوئے)

ارشاد: وہ جی.....میں تو.....بس..... کیا بتاؤں جی.....!(کہنا کچھ اور بھی چاہتا ہے کہ رال کا لمبا تار گرنے کے باعث کھسیانا ہوکر منہ صاف کرنے لگتا ہے)

فائزہ: چل بہت بے شرم کہیں کی.....ارشاد بھائی کو تو میں اچھی لگتی ہوں..... ہیں نا ارشاد بھائی.....؟

ارشاد: جی.....جی.....!(شرماتے لجاتے ہوئے قمیض کا دامن منہ میں چبانے لگتا ہے)

صدف: بڑے ہرجائی ہیں آپ ارشاد بھائی..... پچھلی بار تو آپ کہہ رہے تھے کہ میں آپ کو سب سے زیادہ اچھی لگتی ہوں.....!

ارشاد: وہ جی.....بات.....دراصل.....یہ ہے.....مجھے آپ سب اچھی لگتی ہیں.....!

مہوش: قسم کھا کر کہو.....!میری جان کی.....؟

ارشاد: قسم اللہ پاک کی جی..... جھوٹ بولوں تو.....!

مہوش: تو پھر ہو جائے ایک سیٹ چائے کا اور سموسوں کی پلیٹ.....ڈبل..... ڈبل کا مطلب سمجھتے ہو نا کہ بھول گئے.....؟(آنکھ مارتے ہوئے)

ارشاد: (ٹپکتی ہوئی رال کو منہ کی جانب واپس کھینچتے ہوئے) فکر ہی نہ کریں جی.....ابھی لایا.....!

تحریم: ویسے یار.....!یہ بڑی زیادتی..... بے چارے کو خواہ مخواہ گنہگار کرتی ہو.....!

صدف: تمہیں بڑا ترس آرہا ہے اس فقرے پر.....سالا..... کس طرح..... باری.....باری.....سب پر..... نگاہیں گاڑ کر لیتا ہے.....!

اقصیٰ: لیتا ہے تو لینے دے ہمارا بھلا کیا بگڑتا ہے.....!شوکیس میں لگی مٹھائی دیکھ کر لیتا نہ والے مٹھائی کا کچھ بگاڑ لیتے ہیں کیا.....؟

مہوش: چل چل رہنے دے اپنی یہ گھٹیا فلاسفی..... تیرا نہیں بگڑتا ہوگا.....ہمارا

تو بکتا ہے۔۔۔۔یہ مارکیٹ اکانومی کا دور ہے۔۔۔۔ محترمہ۔۔۔۔!یہاں کوئی چیز مفت نہیں ملتی۔۔۔۔ہر چیز کی کوئی نہ کوئی قیمت ہے۔۔۔۔بھلے ہی نظارہ ہی کیوں نہ ہو۔۔۔۔!

فائزہ: یار۔۔۔۔!میڈیکل سائنس کو اس جانب بھی توجہ دینا چاہیئے کہ کسی بھی اور نول چلول شخص بھی سیکس کی بابت ہر طرح باخبر کیوں ہوتا ہے۔۔۔۔؟

سین نمبر 4

کالج کی لائبریری

کردار: مہوش۔صدف۔منال۔فائزہ۔اقصیٰ۔عنبرین

اور بہت سی لڑکیاں

منال: ہور سناؤ کیہ حال اے۔۔۔۔!(کتاب پر نظریں لگائے مہوش کو ٹہوکا دیتے ہوئے)

مہوش: چل ہٹ۔۔۔۔ کمینی کہیں کی۔۔۔۔ویسے تو کہتی ہے تم میری بہترین دوست ہو۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔!

منال: مگر کیا بھئی۔۔۔۔؟(چونک کر اٹھ بیٹھتی ہے)

عنبرین: کل کلاس میں کیا کہہ رہی تھی میڈم سے۔۔۔۔؟

منال: اچھا۔۔۔۔!۔۔۔۔وہ۔۔۔۔بھئی میں نے سوچا تم لوگ ملوگی تو تب بتاؤں گی۔۔۔۔ کل صبح کی گپ شپ میں مجھے یاد ہی نہ رہا۔۔۔۔ سوری۔۔۔۔معاف کر دو۔۔۔۔پلیز۔۔۔۔!(کان پکڑتے ہوئے)

صدف: چل چل معاف کیا۔۔۔۔!فٹافٹ یہ بتا کہ تو نے رشتے سے انکار کیوں کیا۔۔۔۔؟

منال: انکار کیوں کا مطلب صاف ہے کہ لڑکا مجھے پسند نہیں تھا۔۔۔۔ویسے۔۔۔۔بات بالکل ختم نہیں ہوئی۔۔۔۔صاحبزادے کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔۔۔۔!

مہوش: ہئے ہئے۔۔۔۔قربان جاؤں۔۔۔۔اپنی بنو کے(منال کی بلائیں لیتے ہوئے)کیا خرابی ہے بیچارے میں۔۔۔۔؟

منال: ضروری تو نہیں جو چیز آپ کو ناپسند ہو اُس میں کوئی خرابی بھی ہو۔۔۔۔! انسان کی پسند ناپسند بھی کوئی چیز ہوتی ہے آخر۔۔۔۔!

اقصیٰ: اچھا کس طرح کا لڑکا پسند ہے آپ کو۔۔۔۔؟

منال: پہلے تو بتا۔۔۔۔؟

اقصیٰ: (کھڑے ہو کر دوپٹہ کمر کے گرد کستے ہوئے) مجھے۔۔۔۔؟(گلا کھنکارتی ہے) سیدھا سادا جورو کا غلام پسند ہے بس اور کیا۔۔۔۔؟(ساری سہیلیاں کھلکھلا کر ہنسنے لگتی ہیں)

مہوش: میں بتاؤں۔۔۔۔؟

منال: رہنے دے رہنے دے۔۔۔۔تیری پسند۔۔۔۔ناپسند۔۔۔۔بلکہ۔۔۔۔ہر چیز کا ہم سب کو پتہ ہے۔۔۔۔تو بتا فائزہ تجھے کیسا لڑکا پسند ہے۔۔۔۔؟

فائزہ: لڑکا۔۔۔۔یا۔۔۔۔دولہا۔۔۔۔؟

مہوش: دولہا نہیں۔۔۔۔دولہا بھائی۔۔۔۔؟

فائزہ: مجھے۔۔۔۔مجھے تو۔۔۔۔قد بوت۔۔۔۔ناک نقشہ۔۔۔۔رنگ وغیرہ سے زیادہ۔۔۔۔مضبوط دلیر، بہادر اور مضبوط ارادے کے زیادہ پسند آتے ہیں۔۔۔۔!

اقصیٰ: نوکر لوگی۔۔۔۔!یہاں ایک نہیں ملتا بیگم صاحبہ لڑکوں کی بات کر رہی ہیں۔۔۔۔!

فائزہ: چل ہٹ۔۔۔۔بے شرم کہیں کی۔۔۔۔!(کہنی مارتے ہوئے)

صدف: پوچھو عنبرین لو بنو۔۔۔۔میں نے ابھی تک اس بابت زیادہ غور و فکر نہیں کیا۔۔۔۔شوہر۔۔۔۔شوہر۔۔۔۔obviously۔۔۔۔loving and caring ہونا چاہیئے۔۔۔۔!

فائزہ: تمہارے کیا ارادے ہیں محترمہ۔۔۔۔؟(عنبرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)

عنبرین: میرے سارے ارادے۔۔۔۔آہ۔۔۔۔(ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے) کتنی عجیب بات ہے کہ ہماری دوسالہ دوستی میں یہ topic پہلی بار discuss ہورہا ہے۔۔۔۔آپ لوگوں کو شاید پتہ نہیں گاؤں دیہات میں نسبتیں بچپن میں طے کر دی جاتی ہیں۔۔۔۔میں بھی اپنے میٹرک فیل چچازاد سے منسوب ہوں۔(ایک بار پھر ٹھنڈی آہ بھرتی ہے)

مہوش: عنبرین تو نے تو ہم سب کو اداس کر دیا۔۔۔۔تو کہہ تو ہم کچھ کریں۔۔۔۔!

عنبرین: چھوڑو یار۔۔۔۔کل کس نے دیکھی ہے۔۔۔۔جو ہوگا دیکھا جائے گا۔۔۔۔یہ سب کیا دھرا اصل میں اس منال کی بچی کا ہے۔۔۔۔ہم سب کو کھنگال کر خود کیسی پارسائی بنی بیٹھی ہے۔۔۔۔اب منہ سے کچھ پھوٹے گی بھی۔۔۔۔یا۔۔۔۔(منال کی طرف متوجہ ہوتی ہے)

منال: آپس کی بات ہے۔۔۔۔لڑکا ویسے بُرا نہیں جو ہمارے پڑوس میں رہتا ہے۔۔۔۔میرے انکار کے باوجود اس نے ہمت نہیں ہاری۔۔۔۔میں نے سنا ہے کہ وہ اپنے دوستوں میں خود کو میرا منگیتر کہہ کر شیخیاں بگھارتا ہے۔۔۔۔۔مگر۔۔۔۔۔میرا آئیڈیل۔۔۔۔۔جو ہے نا۔۔۔۔وہ۔۔۔۔کوئی۔۔۔۔اور۔۔۔۔ہے۔۔۔۔!

اقصیٰ: قربان جاؤں تجھ پر اور تیرے آئیڈیل پر۔۔۔۔ذرا جلدی سے بتا اُس کا اتا پتہ۔۔۔۔؟

منال: پھر کبھی۔۔۔۔!

فائزہ: کیوں.....؟

منال: تم لوگ مذاق اُڑاؤ گی میرا.....!

تحریم: وعدہ.....پکا وعدہ..... کوئی بھی مذاق نہیں اڑائے گا.....قسم سے.....!

منال: مجھے.....وہ.....وہ.....فرہاد.....بہت پسند ہے.....!

مہوش: ہائے اللہ.....! یہ منہ اور مسور کی دال.....؟

منال: یہ وعدہ خلافی ہے.....مہوش میں بتلائے دیتی ہوں تم باز نہ آئی تو بہت بُرا ہوگا.....!

اقصیٰ: بہنا.....یہ مذاق نہیں.....طنز ہے.....طنز..... سمجھیں..... ہاں.....!

منال: تم لوگ مجھے سمجھتی کیا ہو.....؟ (غصے پر قابو پاتے ہوئے)

فائزہ: ہم تو تجھے.....حور پری.....سپنوں کی رانی.....ملکۂ حسن.....سب کچھ ماننے کو تیار ہیں..... مگر.....سچ.....سچ.....!

منال: تو کیا سمجھتی ہے میں اُس تک نہیں پہنچ سکتی.....؟

تحریم: یہ کیا.....ہم سب یہی سمجھتی ہیں کہ یہ پاگل پن ہے.....پاگل پن.....اس کے سوا کچھ بھی نہیں.....!

منال: شرط لگتی ہے.....؟

مہوش: شرط..... کیسی شرط.....؟

منال: اگر میں تم سب کا خیال غلط ثابت کر دوں.....تو..... کیا انعام دو گی.....؟

اقصیٰ: سوچ لو.....بہت بڑا دعویٰ کر رہی ہو تم.....!

منال: میں نے تو سوچ لیا ہے.....البتہ..... تمہیں.....اگر..... کوئی.....شک ہے.....تو.....دوسری بات ہے.....؟

تحریم: تو بھلا بتلاؤ.....ہمیں کیا شک ہو سکتا ہے.....؟

مہوش: تو پھر لگی شرط.....! (ہاتھ بڑھاتے ہوئے) اور..... تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی..... کہ.....شرط بلا شک ہے.....جیتنے والا جو مانگے گا دیا جائے گا.....! (ساری سہیلیاں ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر عہد کرتی ہیں)

سین نمبر 5

منال کے گھر کا ڈرائنگ روم

کردار: منال اور جنید (منال کا اُمیدوار)

جنید: آج کی تازہ خبر..... آج کی تازہ خبر..... آج کی تازہ خبر.....! (ہاتھ میں اخبار لہراتے ہوئے)

منال: impress کرنے کے اور بھی بہت طریقے ہیں..... نہیں آتے تو کسی سے اُدھار لے لیجئے.....!

جنید: محترمہ.....! شعر کہنا بھی آسان کام نہیں..... تیر نشانے پر لگانا کسی کسی کو آتا ہے.....! (اپنی طرف فخریہ انداز میں اشارہ کرتے ہوئے)

منال: تو پھر جائیے.....! یہ شعر کہیں اور جا کر آزمائیے.....یہاں پہلے چلا ہے نہ اب چلے گا.....!

جنید: دیکھ لیجئے.....سوچ لیجئے..... کمان سے نکلا ہوا تیر اور زبان سے نکلا ہوا لفظ واپس نہیں آتا.....!

منال: نہیں آتا تو نہ آئے.....میری بلا سے.....!

جنید: اگر فرہاد صاحب خود چل کر آ رہے ہوں.....تب بھی.....؟

منال: فرہاد صاحب.....خود چل کر.....! (حیرت اور خوشی سے)

جنید: جناب.....!

منال: پلیز.....! جلدی بتاؤ !.....فرہاد صاحب کب آ رہے ہیں..... کہاں آ رہے ہیں..... کیسے آ رہے ہیں.....؟

جنید: اتنی بڑی خوشخبری.....منہ میٹھا کئے بغیر.....سنا.....تو.....بد ذوقی ہو گی...؟

منال: چلو.....وعدہ رہا.....! لڈو' برفی' گلاب جامن' بڑے' رس گلے وغیرہ.....جو کہو گے کھلاؤں گی اب بک بھی دو.....!

جنید: میں تو رس ملائی کا دیوانہ ہوں.....!

منال: چلو بابا جیسے تمہاری مرضی.....جتنی کہو گے اتنی رس ملائی کھلا دوں گی..... سسپنس تو ختم کرو.....!

جنید: اوں ہوں.....! اُدھار سے کام ہرگز نہیں چلے گا.....ابھی.....اسی وقت.....! (آنکھوں میں شرارت بھر کر)

منال: نہیں سنانا تو مت سناؤ.....فضول بکواس کے لئے وقت نہیں ہے میرے پاس.....! (چڑتی ہوئی کمرے کے اندر جانے لگتی ہے)

جنید: با ادب.....با ملاحظہ ہوشیار.....! آپ کے محبوب ہیرو فرہاد صاحب اپنی نئی فلم "پیار کی آگ" کا مورخہ 7 جنوری کو شہر کے مشہور سینما فلمستان میں بہ نفسِ نفیس افتتاح کرنے خود تشریف لا رہے ہیں.....(رش سے بچنے کے لئے ایڈوانس بکنگ کرا لیجئے.....! (اخبار چہرے کے سامنے کر کے با آوازِ بلند پڑھنے لگتا ہے)

منال: ہائے اللہ.....اتنی خوشی کی خبر.....اس قدر تاخیر سے سنا رہے ہو.....! (بے چینی اور بے قراری کا اظہار کرتے ہوئے اخبار کھینچتی ہے)

جنید: اخبار تو بازار میں اور بھی مل جائیں گے..... مگر.....یہ یاد رکھئے گا کہ

سات تاریخ کو مجھ سے بہتر ہمراہی نہ مل سکے گا.....!

منال: اطمینان رکھیے.....میں احسان فراموش ہرگز نہیں ہوں.....سات تاریخ کو آپ کو ہمراہ ضرور لے جاؤں گی.....اگر قسمت نے وفا کی.....اور.....فرہاد صاحب سے میری ملاقات ہو گئی تو آپ کا تعارف ضرور کراؤں گی.....!

جنید: ہا ہا.....ہا.....میں بھر پایا.....اس معنوی چکا چوند سے.....مجھے تو محفوظ ہی رکھنا.....مجھے کوئی شوق نہیں ہے.....آپ کے فرہاد صاحب سے ملنے یا ان کی فرسودہ فلمیں دیکھنے کا.....!

منال: مجھے اگر تمہارے ساتھ جانا نہ ہوتا تو میں تمہیں فرہاد صاحب کی فلموں کو برا کہنے کا مزا چکھا دیتی.....! (مصنوعی غصے سے سینڈل کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے)

سین نمبر 6

فلمستان سینما کے باہر کا منظر

کردار: منال۔جنید۔مشہور فلمی ہیرو فرہاد۔پولیس کی بھاری گارڈ۔ڈرائیور اور سینکڑوں شائقین۔

جنید: باپ رے باپ..... کس قدر پاگل ہے ہماری عوام.....اور.....کس قدر فالتو وقت ہے ان کے پاس.....فالتو کاموں کے لئے.....!
(شرارت سے ایک نظر منال اور ایک جم غفیر پر ڈالتے ہوئے)

ایک تماشائی: ارے ٹکٹ خریدنے کی کیا ضرورت ہے.....حسن کے نظارے تو ٹکٹ کے بغیر بھی دستیاب ہیں.....! (منال کی جانب اشتہا انگیز نظروں سے دیکھتے ہوئے)

منال: توبہ ہے میرے خدا.....اس ملک کے عوام کو کب تمیز آئے گی.....؟

جنید: آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا.....؟

منال: اگر آپ کا خیال ہے کہ میں ان باتوں سے ڈر کر یہاں سے بھاگ جاؤں گی تو آپ غلطی پر ہیں.....!

جنید: غلط اور درست کا فیصلہ وقت کیا کرتا ہے.....میں اور آپ نہیں.....! (کسی قدر بیزاری سے)

منال: یہ بھی کوئی وقت ہے..... اس قسم کی باتوں کا..... شرم نہیں آتی..... دیکھ کر چلنا.....! (ایک تماشائی کا دھکا لگنے کے بعد)

تماشائی: آپ دکھا دیجئے نا.....!

جنید: میں نے کہا تھا نا.....!

پولیس آفیسر: پیچھے پیچھے ہو جائیے.....رسّے کے ساتھ قطار بنا کر کھڑے رہیئے..... اگر کسی نے آگے بڑھنے یا ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو وہ اپنے انجام کا خود ذمہ دار ہو گا.....! (ڈنڈا گھماتے ہوئے بڑے سے پیٹ والے پولیس آفیسر کی دھمکی کارگر ثابت ہو رہی تھی)

منال: اُف میرے خدا..... مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا..... مجھے چکر آ رہے ہیں.....! (اچانک فرہاد صاحب کی گاڑی کے سامنے آ کر گرنے کے بعد)

فرہاد: ارے ارے..... یہ کیا کیا تم نے.....اندھے ہو گیا..... نظر نہیں آتا تمہیں.....! (گاڑی سے اترتے ہوئے ڈرائیور پر خفا ہوتا ہے)

ڈرائیور: معاف کر دیجئے صاحب جی! یہ اچانک گاڑی کے سامنے آ گئی میں نے پوری کوشش کی بریک لگانے کی مگر گاڑی وقت پر نہ رک سکی.....!

فرہاد: بریک کے بچے.....انہیں جلدی گاڑی میں ڈالو.....ان کے سر سے خون بہہ رہا ہے.....انہیں ہسپتال لے کر جانا ہے.....!

ڈرائیور: او صاحب آپ کی فلم کا افتتاح.....؟

فرہاد: گولی مارو افتتاح کو.....! (گاڑی اسٹارٹ ہو کر مجمع کو چیرتی ہوئی رینگنے لگی ہے)

سین نمبر 7

پرائیویٹ ہسپتال کا او۔پی۔ڈی

کردار: چند ڈاکٹر، نرسیں، وارڈ بوائے، مریض، فرہاد، منال اور ڈرائیور۔

ایک ڈاکٹر: (خوشی سے آگے بڑھتے ہوئے) سر..... آپ.....اور یہاں.....میں بتا نہیں سکتا کہ مجھے آپ کو دیکھ کر.....!

فرہاد: ڈاکٹر صاحب میرے خیال میں.....اس وقت مجھ سے زیادہ میرے patient کو آپ کی توجہ کی ضرورت ہے.....!

ڈاکٹر: offcourse....offcourse.....why not? (ڈاکٹر شرمندہ ہو کر وارڈ بوائے کو وہیل چیئر لانے کا اشارہ کرتا ہے)

فرہاد: ڈاکٹر صاحب جلدی کیجئے..... خون بہت تیزی سے بہہ رہا ہے.....!

منال: پانی، پانی.....پانی.....!

فرہاد: جلدی سے پانی کا تھرماس لاؤ گاڑی سے (ڈرائیور کو حکم دیتا ہے)

ایک نرس: لیجیے بی بی.....پانی پئیں.....(منال ہاتھ بڑھا کر پانی کا گلاس پکڑنے کی کوشش کرتی ہے)

فرہاد: آپ یہ پانی پی لیں.....یہ صاف ہے اور ٹھنڈا بھی.....! (اپنے ہاتھ سے تھرماس سے پانی نکال کر منال کو پلاتا ہے)

دوسرا ڈاکٹر: گھبرانے کی کوئی بات نہیں......چند اسٹیچ لگیں گے......خون بند ہو جائے گا......! (نرس کے ہاتھ میں پکڑی ٹرے سے قینچی اٹھاتے ہوئے)

منال: ڈاکٹر صاحب ایک منٹ......فقط ایک منٹ......(اپنے ہاتھ سے ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ کر روک دیتی ہے) فرہاد صاحب...... آپ کے پاس قلم ضرور ہوگا......!

فرہاد: جی ہاں یہ لیجئے......یہ لیجئے......! (قمیص کوٹ کی اندرونی جیب سے قلم نکال کر دیتا ہے)

منال: فرہاد صاحب......میں نے آپ کو بہت زحمت دی ہے......ایک زحمت اور گوارا کر لیجئے......پلیز......انکار مت کیجئے گا......میرے خون میں قلم ڈبو کر...... آٹوگراف دے دیجئے...... آپ کو اندازہ نہیں کہ میں آپ کی کتنی بڑی فین ہوں......! (فرہاد کی جانب قلم بڑھاتے ہوئے منال کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے ہیں)

فرہاد: ارے رے......رے...... آپ تو شرمندہ کر رہی ہیں...... آپ کی صحت آٹوگراف سے زیادہ قیمتی ہے...... آپ ٹھیک ہو جائیے اس کے بعد جتنے آٹوگراف کہیں گی اور جس طرح کہیں گی مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا...... مگر......اس وقت یہ سب مناسب نہیں لگتا......!

منال: فرہاد صاحب......پلیز......میری دیرینہ خواہش پوری کر دیجئے......! (فرہاد آگے بڑھ کر......جذباتی آنکھوں سے منال کے بہتے خون میں قلم ڈبو کر......منال کے آنچل پر آٹوگراف دیتے ہوئے جذباتی ہو جاتا ہے......ہسپتال کا عملہ بھی یہ جذباتی منظر دیکھ کر خوشی کے آنسو ضبط کرنے لگتا ہے)

سین نمبر 8

منال کے گھر کے باہر کا منظر

کردار: فرہاد، منال، ڈرائیور، محلے کے چند لوگ اور جنید۔

فرہاد: آہستہ آہستہ......! (منال کا ہاتھ تھامے ہوئے دروازے کی طرف بڑھتا ہے۔ ڈرائیور گاڑی کا دروازہ کھولنے کے بعد جلدی سے دروازہ بند کر کے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آتا ہے۔ بڑی گاڑی اور فرہاد کو دیکھ کر لوگ اکٹھا ہونے لگتے ہیں۔ شور کی آواز سن کر جنید اپنے گھر کی کھڑکی میں آ کر انکواری سے فرہاد اور منال کو گھر کے اندر داخل ہوتا دیکھتا ہے)

منال: آپ رُک کیوں گئے......؟ آ یئے نا......!

فرہاد: میرا خیال ہے...... آپ مجھے اجازت دیں تو بہتر ہے......!

منال: پلیز......! (التجا بھری نظروں سے فرہاد کی جانب دیکھتے ہوئے)

فرہاد: ایک شرط پر......کسی طرح کا تکلف ہرگز نہ ہوگا......!

منال: جیسے آپ کی مرضی......!

سین نمبر 9

منال کے گھر کا ڈرائنگ روم

کردار: منال، فرہاد، منال کے والد، والدہ، چھوٹی بہن اور جنید۔

منال کی والدہ: میری بچی......میری جان...... کہاں گم ہو گئی تھی تو......! (منال کو گرمجوشی سے گلے لگاتے ہوئے)

منال کے والد: بیٹا......وہ جنید کہہ رہا تھا......!

جنید: کمال کرتی ہو منال......(غصے سے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے) یہ بھی کوئی طریقہ ہے......کسی سے ملنے کا......! (فرہاد کی چبھتی ہوئی نگاہیں دیکھ کر آواز دھیمی کرتا ہے) اور تم نے ہسپتال جاتے وقت بھی مڑ کر نہیں دیکھا......حالانکہ......میں......منال......منال......پکار......پکار کر تھک گیا......!

فرہاد: اس وقت یہ شاید ہوش میں نہیں......!

جنید: پھر بھی......اس طرح اکیلے کسی غیر آدمی کے ساتھ...... تنہا چلے جانا بھی تو مناسب نہیں......!

منال کی والدہ: بیٹا......! فرہاد صاحب غیر نہیں ہیں......ان بے چاروں نے تو اپنوں سے بڑھ کر اپنائیت کا ثبوت دیا ہے......ہسپتال سے پل پل کی خبر دیتے رہے اور اب خود چل کر منال کو گھر چھوڑنے آئے ہیں......!

منال: ہاں......ہاں......بڑی بات......بہت بڑی بات ہے...... تمہیں شاید اندازہ نہیں......فرہاد صاحب کا ایک ایک پل کس قدر قیمتی ہے......!

جنید: معلوم ہے......اچھی طرح معلوم ہے......! (ناگواری سے، جس کا فرہاد نوٹس لیتا ہے)

فرہاد: او کے منال......میں چلتا ہوں......اپنا خیال رکھنا......! (کھڑے ہو کر)

منال کے والد: فرہاد صاحب......پہلی مرتبہ آپ ہمارے گھر تشریف لائے......اور......اس طرح......جا رہے ہیں......!

فرہاد: گھبرایئے نہیں......یہ آخری بار ہرگز نہیں ہے......میں آتا جاتا رہوں گا......منال کی خیریت جاننا بھی تو ضروری ہے......! (جنید کی طرف تک دیتے ہوئے کمرے سے باہر نکل جاتا ہے، منال کے والد، والدہ اور چھوٹی

(بہن دروازے تک چھوڑنے آتے ہیں)

منال کی چھوٹی بہن: (ہاتھ ہلاتے ہوئے اونچی آواز میں) انکل بھولیے گا نہیں...... آئیے گا ضرور...... میں نے آپ سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں......!

سین نمبر 10

پرنسپل کا دفتر

کردار: پرنسپل، فرہاد، چپراسی اور منال۔

پرنسپل: (فائل پر نظریں جمائے گہری سوچ میں مبتلا ہے۔ چپراسی وزیٹنگ کارڈ لے کر آتا ہے۔ بیزاری سے کارڈ پر نگاہ ڈالتے ہوئے) کون ہے بھئی......! بلاؤ...... بلاؤ...... جلدی بلاؤ...... بلکہ ٹھہرو...... میں خود انہیں لینے آتی ہوں......! (خوشی سے آنچل، چشمہ، بال اور کپڑے درست کرتے ہوئے)

فرہاد: میں حاضر ہو سکتا ہوں......؟ (کمرے میں داخل ہوتے ہوئے)

پرنسپل: فرہاد صاحب......! آپ نے کیوں تکلیف کی......؟ میں خود آپ کے استقبال کے لئے باہر آ رہی تھی...... میں بتا نہیں سکتی...... کہ...... مجھے آپ کو اپنے روبرو دیکھ کر کس قدر خوشی ہو رہی ہے...... ویسے تو میں فلمیں کم کم ہی دیکھا کرتی ہوں...... مگر...... جب سے جب آپ کی فلم ریلیز ہوتی ہے...... تو...... میں اولین فرصت میں دیکھتی ہوں...... بلکہ کئی کئی بار دیکھتی ہوں...... آج سے نہیں بچپن سے میرا یہی معمول ہے......!

فرہاد: جی......؟ (حیرت سے ایک نظر اپنے دوسری پرنسپل کے سراپے پر ڈالتے ہوئے)

پرنسپل: فرمائیے......! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں......؟ میرا مطلب ہے آپ کیا لینا پسند کریں گے...... ٹھنڈا...... یا...... گرم......!

(گھبراہٹ میں چپراسی کو بلانے کے لیے گھنٹی بجاتی ہے)

فرہاد: کل شام آپ کی ایک سٹوڈنٹ میری گاڑی سے ٹکرا گئی تھی......!

پرنسپل: (حیرت اور خوشی سے) اچھا......!

فرہاد: جی "اچھا" نام ہے...... اُس کا...... ا...... ا......!

پرنسپل: میرا خیال ہے...... آپ منال کا ذکر کر رہے ہیں......!

فرہاد: جی جی بالکل درست فرمایا آپ نے...... دراصل میں نے منال کی خیریت دریافت کرنے کے لئے ان کے گھر فون کیا تو معلوم ہوا وہ کالج آئی ہوئی ہیں...... میں چند روز کے لئے آؤٹ ڈور پر جا رہا ہوں...... اس لئے میں نے سوچا......!

پرنسپل: ایک منٹ (گھنٹی بجاتے ہوئے) تم جاؤ فرسٹ ایئر سے منال کو بلا کر لے آؤ...... منال اشتیاق...... (گھڑی دیکھتے ہوئے) میرا خیال ہے...... سر جعفری کا پیریڈ ہونا چاہیے...... انہیں کہنا...... میں نے بلایا ہے......!

فرہاد: (موبائل پر کال سنتے ہوئے) ٹھیک ہے ٹھیک ہے...... میں ایک گھنٹے میں پہنچ جاتا ہوں......!

پرنسپل: آج کل آپ کی کتنی فلمیں انڈر پروڈکشن ہیں......؟

فرہاد: جی...... وہ...... (سوچتے ہوئے)

پرنسپل: ڈرامائی سین کرانا تو آپ پر ختم ہے...... سامنے والے اداکار کی چھٹی کرا دیتے ہیں آپ...... اور...... گانا فلمانا تو آپ پر ختم ہے...... انگ انگ سے ایکٹنگ پھوٹتی ہے آپ کے...... ایسا لگتا ہے کہ سب کچھ حقیقت میں ہو رہا ہے...... دیکھنے والا خیالوں اور خوابوں میں گم ہو جاتا ہے......!

(حسرت سے تصور میں ہیروئن کی جگہ خود کو محسوس کرتی ہے)

منال: مے آئی کم ان (کمرے میں داخل ہوتے ہوئے)

پرنسپل: ہاں...... ہاں...... آؤ...... بیٹھو...... دیکھو...... تم سے کون ملنے آیا ہے......؟

منال: فرہاد صاحب آپ......؟

فرہاد: میں نے آپ کے گھر خیریت معلوم کرنے کی غرض سے فون کیا تو معلوم ہوا......!

منال: (فرہاد کی بات کاٹ کر) جی وہ میں نے اپنی سہیلیوں سے......؟

پرنسپل: سہیلیوں سے......؟

منال: میرا مطلب ہے میڈم سے وعدہ کیا تھا کہ میں آج کی اسائنمنٹ مس نہیں کروں گی......!

پرنسپل: گڈ...... ویری گڈ......!

فرہاد: پڑھائی سے آپ کی کمٹمنٹ کی بابت جان کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے...... یہ دیکھ کر تو میں اور بھی خوش ہوا ہوں کہ آپ کل کی نسبت کافی بہتر ہیں...... ورنہ...... میں تو...... ڈر ہی گیا تھا......!

پرنسپل: جی "ایکسیڈنٹ" تھا کیا...... ہوا کہاں تھا......؟

فرہاد: جی...... وہ...... فل......!

منال: فلٹریشن پلانٹ کے پاس (فرہاد کا جملہ کاٹتے ہوئے)

پرنسپل: فلٹریشن پلانٹ......! کونسا والا...... مال روڈ والا یا صدر والا......؟

فرہاد: صدر والا...... صدر والا...... (خشمگیں نظروں سے منال کی طرف دیکھتے ہوئے) بس اجازت چاہوں گا...... میم...... آپ کا بہت بہت شکریہ......!

پرنسپل: یو آر ویلکم...... ویسے میرا نام...... شبانہ ہے...... مس

شبانہ......!

فرہاد: جی......جی...... مس شبانہ...... آپ کا بہت بہت شکریہ......

(ایک نظر منال پر ڈالتے ہوئے غصّہ ضبط کرتا ہے اور باہر نکل جاتا ہے)

سین نمبر 11

کالج کا کلاس روم

کردار: منال، مہوش، عنبرین، فائزہ،

اقصیٰ، صدف، کلاس فیلوز اور میڈم۔

فائزہ: ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے...... اُدھر نکلے تھے ارماں اِدھر ہمارا پرس نکلے......! (منال کے کلاس روم میں داخل ہونے پر کان پر ہاتھ رکھ کے)

اقصیٰ: واہ......واہ...... مر بے حیا...... کیا کہنے...... سبحان اللہ...... غالب کی روح کو اس سے زیادہ اور کوئی کیا بے چین کرے گا......؟

صدف: وہ آئیں کلاس میں ہماری...... خدا کی قدرت ہے...... کبھی ہم ان کو...... کبھی اپنی جیب کو دیکھتے ہیں......!

مہوش: اب اتنی بے درد...... اور...... بیدرد بھی نہ سمجھو...... بیچاری...... منال کو...... وہ شرط ضرور جیتی ہے...... مگر......!

عنبرین: اگر...... مگر...... کچھ نہیں...... سیدھے...... سبھاؤ...... سب اپنی جیب ڈھیلی کرو...... اور...... ملکہ عالیہ کے حضور پیش کرو...... پھر...... جو حرج یار میں آئے......(سب کھلکھلا کر ہنستے ہوئے منال کی طرف دیکھنے لگتی ہیں)

ایک کلاس فیلو: ہائے تو کچھ منہ سے بھی پھوٹو......!

دوسری کلاس فیلو: بے چاری ابھی تک شہزادے کے حسین خوابوں میں کھوئی ہوئی ہے......!

تیسری کلاس فیلو: بات ذرا سی تھی کچھ آگے بڑھی...... یا...... ہماری دوست کا خون رائیگاں گیا......!

چوتھی کلاس فیلو: خون رائیگاں نہیں جاتا دوستو...... کبھی...... نہ کبھی...... رنگ...... ضرور لاتا ہے......!

منال: یار......! آپ لوگ اوور ایکٹ کر رہے ہو...... جو کچھ آپ سمجھ رہے ہو...... ایسا کچھ بھی نہیں ہے...... میں نے شرط جیتی تھی...... سو جیت لی...... اب میں اس جیت کے بدلے...... آپ لوگوں سے کیا مانگی ہوں...... کب مانگی ہوں...... پیار کی بات ہے...... (چہرے پر گہری سنجیدگی) مجھے اپنی جیت کو انجوائے تو کرنے دو......! (کلاس روم کے دروازے میں میڈم نمودار ہوتی ہے اور سب لڑکیاں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جاتی ہیں)

سین نمبر 12

بڑے ہوٹل کے کافی ہاؤس کا پُرسکون گوشہ

کردار: منال، ویٹر، فرہاد اور دیگر لوگوں کے علاوہ فرہاد کے فینز۔

منال: میں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ میں آپ سے مل سکوں گی...... آپ کے ساتھ کافی پیوں گی...... گھوموں گی...... پھروں گی...... اور...... اور...... آپ سے ڈھیروں باتیں کروں گی......!

فرہاد: ہم ایکٹر لوگ بھی...... انسان ہوتے ہیں...... ایک عام انسان...... ہمارے...... غم...... خوشی...... سب...... عام انسانوں جیسا ba ہے...... غور سے دیکھا جائے تو ہماری زندگی...... ایک طرح سے...... قابلِ رحم ہوا کرتی ہے...... نہ اپنی مرضی سے سو سکتے ہیں...... نہ جاگ سکتے ہیں...... نہ کھا سکتے ہیں...... نہ پی سکتے ہیں...... حتیٰ کہ...... اپنی مرضی سے گھوم پھر بھی نہیں سکتے......!

منال: میں نے ایک میگزین میں آپ کا انٹرویو پڑھا تھا جس میں آپ نے کہا تھا کہ آپ سال کے سال چھٹیاں گزارنے یورپ ضرور جاتے ہیں......!

فرہاد: (چونک کر) یورپ......؟

منال: جی ہاں......! یورپ...... آپ نے اپنے انٹرویو میں یہ بھی کہا تھا...... کہ...... وہاں...... ہمیں دیکھ کر...... نہ کوئی...... آوازیں کستا ہے...... نہ...... آٹوگراف مانگتا ہے...... اور...... نہ...... پرائیویسی میں خلل ba ہے......!

فرہاد: بڑی تفصیل سے پڑھتی ہیں آپ فلمی لوگوں کے انٹرویوز......!

منال: فلمی لوگوں کے نہیں...... صرف...... اور...... صرف...... آپ کے......!

فرہاد: my pleasure......!

منال: فرہاد صاحب......! ایک بات تو بتایئے......؟

فرہاد: جی جی...... پوچھئے......!

منال: رہنے دیجئے......!

فرہاد: کیوں......؟

منال: ذاتی قسم کا سوال کرنا مناسب نہیں لگتا......!

فرہاد: بھئی ہم اداکار لوگ...... پبلک پراپرٹی ہوتے ہیں...... ہماری زندگی...... ذاتی کب ہے......؟

منال: آپ پچیس سالوں سے فلموں میں کام کر رہے ہیں...... مگر...... آپ کی figure میں رتی برابر فرق نہیں پڑا...... اور...... جب...... آپ...... یورپ کے دورے سے لوٹتے ہیں...... تو...... آپ کی

سارنئیس اور بھی دلکش ہو جاتی ہے......!

فرہاد: (بے خیالی میں سر اور چہرے کی طرف ہاتھ لے جاتے ہوئے) کچھ نہیں...... کچھ بھی نہیں......بس...... کھانے......پینے...... اور......سونے......جاگنے...... کا......بہت خیال رکھتا ہوں......اور ......بس...... سب ......عام ......لوگوں جیسا ہے......عام لوگوں......جیسا ہے......! (کئی فین اتنے میں فرہاد کو پہچان کر آٹوگراف بک بڑھا کر آٹوگراف مانگنے لگتے ہیں اور فرہاد کے ساتھ منال سے بھی آٹو گراف دینے کی ضد کرتے ہیں)

منال: میں......! (حیرت کا اظہار کرتے ہوئے) نہیں بھئی...... میں...... کوئی ...... آرٹسٹ......وارٹسٹ نہیں ہوں......میں تو......خود......فرہاد صاحب کی......!

ایک فین: میم پلیز......!

فرہاد: یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ آپ آرٹسٹ نہیں ہیں...... کبھی غور سے آئینہ دیکھئے......تو...... آپ کو اندازہ ہوگا کہ آپ جیسی خوبصورت حسین......اور......دلکش......تو......ہماری ایک بھی ہیروئن نہیں ہے......دے دیجئے آٹوگراف......بے چارے کا دل نہ توڑیے......!

منال: جی......!(حیرت اور پریشانی سے)

فرہاد: محترمہ تکلف سے کام لے رہی ہیں (فین کو مخاطب کرتے ہوئے) حالانکہ یہ میری آنے والی فلم کی ہیروئن ہیں......!

منال: میں......اور......ہیروئن......!(خوشی اور حیرت سے)

فرہاد: جی......جی...... آپ...... اب بیچارے کو مزید انتظار نہ کرائیے......اور...... مستقبل کی ہیروئن کے طور پر......پہلا...... آٹو گراف......دے ہی دیجئے......یہ بھی کیا یاد کریں گے......!

منال: میں......ہیروئن......اور......آٹوگراف......! (ماتھے کا پسینہ صاف کرتے ہوئے کانپتے ہاتھوں سے آٹوگراف بک کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے)

سین نمبر 13

منال کے گھر کا ڈرائنگ روم

کردار: منال، جنید اور منال کی والدہ۔

جنید: آنٹی آپ اتنی دیر سے خاموش بیٹھی ہیں آپ تو کچھ بولئے......!

منال کی والدہ: بیٹا......میں کیا بولوں یہ بچی تھوڑی ہے......اپنا برا بھلا سمجھتی ہے...... آگے یہ جانے اور اس کے ابو جانیں......اجازت تو انہوں نے ہی دی ہے......!

منال: آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے...... کہ......میں......ابو سے ......پہلے ہی......اجازت لے چکی ہوں......!

جنید: منال......منال......تم......ان...... فلمی لوگوں کو نہیں جانتیں......بہت فراڈ ہوتے ہیں یہ......!

منال: ہوتے ہوں گے......مجھے کیا......میں تو......فرہاد صاحب کو جانتی ہوں......اور......فن کے حوالے سے......ذاتی سے کہہ سکتی ہوں...... کہ......فن جیسا شریف......ایماندار...... مخلص......اور......(ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے)

منال کی والدہ: ہیلو......جی......جی کون......؟......فرہاد صاحب......جی......جی......ایک منٹ......(منال دوڑ کر فون ریسیو کرتی ہے)

منال: جی......جی سر......میرے تو سینئر ہیں نا آپ......مجھے تو سر کہنا ہی چاہیے......اور......پھر......عمر......میں بھی......بڑے ہیں آپ......جی......جی......یہ تو ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ......چلئے ...... بالکل ٹھیک ہے...... آج سے......میں......آپ کو......فرہاد صاحب ہی کہا کروں گی......کب......؟ کل صبح......سچ کہہ رہے ہیں...... ہائے اللہ مجھے یقین کیوں نہیں آ رہا......جی......جی......میں وقت پر پہنچ جاؤں گی......اس تکلف کی کیا ضرورت ہے......میں ٹیکسی میں آ سکتی ہوں......اس کے آگے میں کیا کہہ سکتی ہوں......جی......جی......اللہ حافظ......!

جنید: منال......پلیز......ایک بار پھر......سوچ لو......(بے بسی سے منال کی طرف دیکھتے ہوئے)

منال: زندگی میری ہے......میں جو چاہوں کروں......! آپ خوامخواہ......شہر کے اندیشے میں دبلے ہوں......!(تیزی سے بیڈروم کی سیڑھیاں چڑھ جاتی ہے)

سین نمبر 14

اسٹوڈیو میں فرہاد کا دفتر

کردار: فرہاد، منال، پروڈیوسر، ڈائریکٹر، میک اپ مین، ڈریس ڈیزائنر، نوکر چاکر اور بہت سے۔

فرہاد: خوش آمدید......خوش آمدید (منال کے گلے میں ہار پہناتے ہوئے)

ڈریس ڈیزائنر: ہائے اللہ...... قربان جاؤں......کاش میں لڑکا be (کولہے مٹکاتے ہوئے)

فرہاد: منال......اس کی باتوں کا برا مت منانا یہ وہ شخص ہے جس نے قدرت

کے کاموں میں دخل دینے سے بھی گریز نہیں کیا......! (ڈریس ڈیزائنر کی درمیانی جنس پر طنز کرتے ہوئے)

فوٹوگرافر: بی بی......! ذرا ادھر دیکھئے...... تھوڑا ادھر......اوپر...... جی...... تھوڑا......اور......اوپر......ہاں......ٹھیک ہے......اب دائیں......ٹھیک ہے......اب بائیں دیکھئے...... آنکھیں...... کھلی رکھیے......! (بے شمار تصاویر کھنچتی ہیں)

فرہاد: بھئی آپ لوگ تو آتے ہی شروع ہو گئے...... کم از کم بے چاری کو سانس تو لینے دو......!

ڈائریکٹر: سن گئے سر جی......! سو فی صد سن گئے......ویکھیں تو......اے گوری......دعا کرنا کرے تے تیرا ناں بدل دیا......!

مجمع سے ایک آواز: شیرازی صاحب پہلاں ای دس دیو...... دوجا ناں کیہہ......رکھو گے......؟

ڈائریکٹر: اے کیہڑا ایں وفلاا بولیا اے......چپ ہو جے کرا دے......؟

پروڈیوسر: او شیرازی صاحب......! چھڈو جی...... منڈے تے تہاڈے نال لگے ای رہندے نیں...... کیہڑے...... کیہڑے...... تو......پھڑو گے......؟

فرہاد: ہاں بھئی شیرازی......!

ڈائریکٹر: جی......سر جی......!

فرہاد: بس فٹافٹ ہیروئن کا میک اپ کراؤ اور آڈیشن لو......!

پروڈیوسر: بڑا افسوس اے......ایہناں نال بڑا ای افسوس اے......جے بے عزت کرنا اے...... تے رج کے کرو......اینج لفظاں دی جتیاں تے نہ مارو...... سوہنے سرکار...... کڑی تہاڈی پسند دی خراب ہو سکدی اے......! کتاب کڈو......ڈیلاں دیو...... محنت کرو......فیر......ویکھنا جے......تے کجھ پچھو......!

فرہاد: (ڈائری دیکھتے ہوئے) تو ٹھیک ہے بس...... اگلے مہینے کی پندرہ سے...... ساری ڈیٹس تمہاری...... جب تمہاری فلم مکمل ہو گی...... تب...... کسی اور کو دیکھیں گے...... ڈسٹری بیوٹر سے میری بات پہلے ہی ہو چکی ہے......!

میک اپ مین: واہ جی......واہ...... سوہنے سائیں...... تسی تے کمال کر دتا اے......میں کہیا......پبلک دی چیکاں نا کڈا دے آں تے میرا ناں......! ایہا میک اپ کراں گا......ایہا میک اپ کراں گا......!

ایک آواز: فردائی صاحب......چیکاں تے پروڈیوسر دی...... تسی......تے نچ دی کڈا دینا ہو......ہیروئن کولوں کجھ ہور کڈاؤ......!

فرہاد: (ہنسی ضبط کرتے ہوئے) چلو بھئی......وہ مٹھائی کہاں ہے......؟ اب لے بھی آؤ......!

پروڈیوسر: کیہہ غضب کرن لگے او سرکار......پہلاں بی بی نو......شیرنی تاں لین دیو (جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالتے ہوئے) لو بی بی...... قبول کرو...... آج سے آپ ہماری اک نی......دو نی......تن فلماں دی ہیروئن بنگی......!

فرہاد: اور......میں......!

پروڈیوسر: سر جی...... تسی تے ساڈے...... مائی باپ ہو...... تہاڈی مرضی تو بغیر تے پتہ وی نی ہل سکدا......! (پروڈیوسر کا ملازم مٹھائی کا ٹوکرا لے کر آتا ہے۔ سب لوگ مٹھائی کھاتے ہوئے دفتر سے باہر آنے لگتے ہیں)

سین نمبر 15

منال کے گھر کا ڈرائنگ روم

کردار: ہیروئن کی سہیلیاں، والد، والدہ

چھوٹی بہن، رشتے دار، محلے دار اور جنید

کزن رفعت: ہائے اللہ منال کتنی پیاری لگ رہی ہو تم...... جی چاہتا ہے...... بس دیکھتی رہوں......!

منال کی چھوٹی بہن: رفعت باجی...... ابھی کیا......؟ باجی کو اس وقت دیکھنا...... جب باجی کی فلم ریلیز ہوگی...... میں تو پہلے دن پہلا شو دیکھنے باجی کے ساتھ جاؤں گی......!

منال: چل ہٹ پگلی...... ہیرو ہیروئن سینما میں تھوڑی جاتے ہیں فلم دیکھنے...... ان کے لئے تو سٹوڈیو کے اندر ہی خاص شو ہوتا ہے......!

جنید: اب بیچاری کو اتنا بے وقوف بھی مت بناؤ......! وہ جو آپ ان حضرت کی گاڑی سے ٹکرائی تھیں...... وہ وہاں جھک مارنے آئے تھے......؟

منال: تم بیچ میں ٹانگ ضرور اڑانا...... بھئی وہ فلم دیکھنے نہیں فلم کا افتتاح کرنے آئے تھے......!

چھوٹی بہن: باجی...... آپ بھی اپنی فلم کا افتتاح خود کرنا...... بڑا مزا آئے گا......!

منال: میری پیاری بہنا......! میں ابھی اتنی بڑی اسٹار تھوڑی ہوں...... کہ اپنی فلم کا افتتاح خود کروں......!

سہیلی: ہو نہیں......تو...... ہو جاؤ گی...... یہ منزل بھی کون سی دور ہے......!

صدف: ہاں بھئی منال...... جس طرح تم نے ہم سب کو چاروں شانے چت کیا ہے...... اس کے بعد تو......ہم سب تمہاری ذہانت کے قائل ہو

چکے ہیں.....!
انعمی: ذہانت کے بھی ..... اور...... خوش قسمتی کے بھی.....!
فائزہ: شیطان کی اولاد..... ہم سے تو تُو نے شرط کے بدلے ابھی تک کچھ نہیں لیا..... مگر..... ہم سب نے فیصلہ کیا ہے.....فیصلہ کیا ہے..... کہ..... ہم..... سب..... تجھے..... تیری..... فلم..... کے..... ریلیز ہونے پر..... زبردست ٹریٹ دیں گے.....!(تالیاں بجانے لگتی ہے سب لوگ بھی اُس کا ساتھ دیتے ہیں)
مناہل کے والد: بیٹا.....!تمہارا فون ہے
مناہل: کون ہے ابو جی.....؟
والد: بیٹا.....! کسی اخبار سے بول رہے ہیں..... انٹرویو کے لئے وقت مانگ رہے ہیں.....!
مناہل: کل صبح گیارہ بجے کا وقت دے دیجئے..... فرہاد صاحب کے دفتر کا.....!
تحریر: ہیروئن صاحبہ.....! آپ کی مصروفیت کا یہی عالم رہا تو ہم دوروں کے مارے کہاں جائیں گے.....؟ (ساری دوست 'جواب دو'جواب دو'کی صدا لگانے لگتی ہیں)
مناہل کے والد: مناہل..... بیٹا..... تمہارا فون ہے.....!
مناہل: کون ہے ابو جی.....؟
والد: بیٹا.....فرہاد صاحب کا فون ہے.....!
مناہل: (بھاگتے ہوئے) فرہاد صاحب کا.....!
مناہل کی والدہ: بیٹا کیا کہہ رہے تھے فرہاد صاحب.....؟
مناہل: امی جی..... وہ..... ڈریس اور جیولری وغیرہ کا انتخاب کرنا ہے..... اُس کے بعد میک اپ بھی ہونا ہے..... آسان کام تھوڑی ہے..... ہیروئن بننا.....!(پیار کرتی ہوئی مہمانوں کو رخصت کرتی ہے)

سین نمبر 16

فلم کا سیٹ

کردار: فلم انڈسٹری کے چیدہ چیدہ لوگ' فرہاد' مناہل' ساتھی لڑکیاں' ڈائریکٹر' رائٹر' پروڈیوسر' میک اپ مین' کیمرہ مین' ساؤنڈ ریکارڈسٹ اور اسسٹنٹ وغیرہ

ڈائریکٹر: ہاں تو سر جی..... اجازت ہو تو..... ٹیک کریں (فرہاد کو مخاطب کرتے ہوئے)
فرہاد: میں تیار ہوں..... (مصنوعی مونچھیں شیشے میں دیکھ کر درست کرتے ہوئے) بی بی کا میک اپ وغیرہ اچھی طرح چیک کر لو..... پہلا شاٹ بہت عمدہ اور پرفیکٹ ہونا چاہیئے..... مناہل کے کیریئر کا سوال ہے..... بہت لوگ دیکھنے آئے ہیں.....!
ڈائریکٹر: بس تھوڑی سی گڑبڑ ہو رہی تھی..... کہ ..... لاڈلی اک گڑیا کی طرح...... بس.....!
فرہاد: اور ہاں.....!(ڈائریکٹر تک فرہاد کی آواز نہیں پہنچتی اور وہ فرہاد کے پاس سے سیٹ کے درمیان چلا جاتا ہے)
ڈائریکٹر: ہاں جی..... سب تیار ہے..... (لائٹس مین' کیمرہ مین اور ساؤنڈ ریکارڈسٹ کی طرف دیکھتے ہوئے) لائٹس آن..... فل لائٹس آن..... درمیان سے تیسری لائٹ کو تھوڑا نیچے کرو.....بی بی..... آپ نے کیمرے کی طرف بالکل نہیں دیکھنا..... آپ یوں کرو..... یوں کرو..... (دور جا کر ہاتھوں سے فریم بناتے ہوئے) بس یہاں دیکھتے رہو..... ٹھیک ہے..... گھبرانے.....یا..... پریشان ہونے کی..... کوئی..... ضرورت..... نہیں..... میں نے..... بڑی..... بڑی..... ہیروئنوں..... کو.....!
فرہاد: شیرازی.....!
ڈائریکٹر: جی..... جی سر جی..... او کے..... جی..... ٹیک کریں گے..... لائٹس آن..... کیمرہ سٹارٹ..... (ہیروئن کونے پر اُداس بیٹھی دوپٹہ مروڑ رہی ہے)
ایکسٹرا لڑکی: میں نے کہا..... کس کا انتظار ہے..... ذرا ہمیں بھی تو بتاؤ.....؟
ہیروئن: چل ہٹ.....بےشرم کہیں کی.....!
دوسری ایکسٹرا: اچھا جی.....! اب ہم بے شرم ہو گئے..... اور..... وہ.....!
ہیروئن: وہ.....وہ کون.....؟
تیسری ایکسٹرا: ابی..... حضور.....جن کے شانے پر چلنے کے لئے یہ مخملیں زلفیں بےقرار ہیں.....!(ہیروئن کے بالوں کو ہاتھوں میں تھام کر سونگھتے ہوئے)
ہیروئن: ہائے اللہ.....اتنی بےمروت تو..... زبان پر اُن کا نام لاتے ہوئے..... ہمیں.....شرم آتی ہے.....!
ڈائریکٹر: کٹ اِٹ..... واہ..... جی..... واہ..... کمال کر دیا ہے..... تم نے..... میری پوری زندگی میں اتنا پرفیکٹ شاٹ کسی ہیروئن نے نہیں دیا.....اور اتنا ہو.....پہلے پہلے..... شاٹ..... تم نے بڑی..... بڑی.....منہ زور..... گڑیاں نس جاتی تھیں..... (تالی بجاتے ہوئے ڈائریکٹر کا ساتھ دیتے ہوئے سیٹ پر موجود دیگر لوگ بھی تالیاں

ہٹا کر ہیروئن کو داد دیتے ہیں)

اخباری رپورٹر: میڈم......! ''جانِ جہاں'' اخبار و وقت روزنامہ کے لئے آپ کا انٹرویو کرنا چاہتا ہوں......!

دوسرا رپورٹر: جی...... میں...... ''چاروں'' کا نمائندہ ہوں...... مجھے بھی کچھ وقت چاہیئے......!

تیسرا رپورٹر: میرا نام مقیم الرحمٰن ہے...... میں...... روزنامہ ''حق اُمنگ'' سے ہوں...... پہلے شاٹس اور فلمی ماحول کی بابت آپ کے تاثرات کیا ہیں......؟ (ایک فوٹو گرافر سب کو دھکیلتے ہوئے تصویر بناتا ہے)

ایک پروڈیوسر: (اونچی آواز میں) بی بی......! اخباری نمائندوں سے فراغت ہو تو کچھ وقت ہمیں بھی دینا......!

ایک رپورٹر: آپ نے...... فلموں میں کام کرنے کا کتنا معاوضہ طے کیا ہے......؟

ایک ڈائریکٹر: ہوشیار......! اس طرح کی باتیں...... سرِ عام پوچھنے کی تھوڑا ہی ہوتی ہیں...... بی بی...... ہم بھی آپ کے انتظار میں کھڑے ہیں...... !(اونچی آواز میں)

فرہاد: توجہ فرمایئے......! (سیٹ کے عین درمیان، دیہاتی لڑکے کے روپ میں) خواتین و حضرات...... آپ سب کی آمد کا بے حد شکریہ...... آج...... منال کا پہلا دن ہے...... میرے خیال میں...... آج کا دن...... سوال و جواب کے لئے...... زیادہ مناسب نہ ہوگا...... کل صبح دس بجے آپ سب میرے ساتھ میرے دفتر میں چائے بھی پیجئے...... اور...... منال سے...... سوال و جواب بھی کیجئے......!

ایک رپورٹر: کیا ہم اسے پریس کانفرنس کی دعوت سمجھیں......؟

فرہاد: جی...... جی...... پریس کانفرنس ہی سمجھئے......! (سب لوگ ایک ایک کر کے جانے لگتے ہیں)

ڈائریکٹر: (ہیروئن کو ایک طرف لے جاتے ہوئے) بی بی......! ایک بات عرض کروں...... خفا تو نہیں ہوں گی......؟

ہیروئن: جی...... جی...... ارشاد......!

ڈائریکٹر: آپ ماشاءاللہ پڑھی لکھی ہیں...... ڈائیلاگ ڈلیوری کے وقت تلفظ کا خیال...... ضرور رکھیئے گا...... لفظ...... زبان...... نہیں...... زُبان ہے......!

ہیروئن: جی...... جی...... میں...... آئندہ...... خیال رکھوں گی......!

ڈائریکٹر: جھنڈو شاہ جی......! اَسی دی کیہ رے...... تے کتھاں وچ پے گئے...... اساں...... دیکھے...... فلم...... علن آئے آں...... کر...... اردو...... اکیڈمی...... کھولن...... آئے آں......؟

سین نمبر 17

منال کے گھر کا ڈرائنگ روم

کردار: منال کے والد، والدہ، جنید، جنید کے والد، والدہ اور منال

جنید کے والد: ہو تو بچی ہے...... نا سمجھ ہے...... پر...... آپ نے تو زمانہ دیکھا ہے......!

منال کے والد: خواجہ صاحب......! یہ ہمارا یا آپ کا زمانہ نہیں ہے...... یہ میڈیا کا دور ہے...... آج کی نوجوان نسل...... ہم سے زیادہ باشعور...... اور...... ذہین ہے...... اپنا بھلا...... ہم سے بہتر سمجھتی ہے......!

جنید کی والدہ: مگر بھائی صاحب......! جوان بچی کا...... یوں...... اس طرح...... گھر سے باہر...... اکیلے......؟

منال کے والد: (ناگواری سے بات کاٹتے ہوئے) مجھے اپنی بچی پر...... مکمل...... بھروسہ ہے (اپنی بات پر زور دیتے ہوئے) وہ کبھی کوئی ایسا کام نہیں کرے گی جس سے ہمیں شرمندگی کا سامنا ہو......!

جنید: آنٹی......! آپ بھی تو کچھ بولئے...... آپ سمجھائیے نا...... انکل کو......!

منال: (دروازہ سے داخل ہوتے ہوئے) کسی کو کچھ سمجھانے کی ہرگز ضرورت نہیں...... میں جو کچھ کر رہی ہوں سوچ کر ہی کر رہی ہوں...... اور...... سمجھ کر بھی......! (لاپرواہی سے اندر چلی جاتی ہے)

منال کے والد: چائے لیجئے نا...... ٹھنڈی ہو رہی ہے...... آپ تو کچھ لیجئے بھابھی......!

جنید کے والد: جی......! (گہری سوچ سے چونکتے ہوئے)

جنید: (غصے سے کھڑا ہوتے ہوئے) میرا خیال ہے تو...... اجازت لیجئے...... اب یہاں بیٹھنے کا کوئی فائدہ نہیں......!

(جنید اور اُس کے والدین کچھ کہے بغیر اُٹھ کر چل پڑتے ہیں، منال کے والدین سر نیچا کئے بیٹھے رہتے ہیں)

سین نمبر 18

بڑے ہوٹل کا ڈائننگ ہال

کردار: فرہاد، منال، ویٹر اور دیگر لوگ۔

فرہاد: اصل میں......! ان لوگوں کو خبر سے غرض ہوتی ہے...... رائی کا پہاڑ بنا...... اور...... پہاڑ کو رائی میں بدلنا...... کوئی ان سے سیکھے...... اخبار یا رسالہ بیچنے کے لئے...... ایسی...... ایسی...... سنسنی...... پیدا کرتے

ہیں......اللہ توبہ......!(کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے)

منال: آپ ہی بتا دیجئے......مجھے کیا کرنا چاہیے......؟

فرہاد: جس قدر ممکن ہو......پولیس والوں سے......دور......رہو......!
بیماری کا......معروفیت کا......شادی کا......غمی کا......کوئی......
نہ......کوئی......بہانہ......بنا کر......خود کو......میڈیا......
سے......دور......رکھو......جس قدر آپ شہرت کے پیچھے بھاگو
گے......اسی قدر......یہ......آپ سے......دور بھاگے گی......
اور......جس قدر......آپ......اس کو......avoid کرو گے......
اسی قدر یہ......آپ......کا تعاقب......کرے گی......!

منال: وہ جو......پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز کو......وقت دیا ہوا ہے......
اس کی بابت بھی تو کچھ بتا دیجئے......؟

فرہاد: ہاں......! یہ غور طلب بات ہے......جہاں تک سوال......
معاوضے......کا......ہے......اُسے......تو......ابھی......
pending رہنے دو......!

منال: (حیرت سے) pending رہنے دوں......مگر......کب
تک......؟

فرہاد: اس وقت تک جب تک پروڈیوسرز کی زبانیں کھلی رہیں......ہم اپنی
طرف سے......کبھی......کوئی......دروازہ......خود پر......بند
کریں......!

منال: ہوں......!(گہری سوچوں سے پلٹتے ہوئے)

فرہاد: خدا کرے......تمہاری پہلی فلم باکس آفس پر ہٹ ہو جائے......
بس......پھر کیا ہے......پھر تو منہ مانگے پیسے ملیں گے......!

منال: اگر کسی نے کل......فلم کی پیشکش......کی......تو......؟

فرہاد: کریں گے......ضرور......کریں گے......مگر......؟

منال: مگر کیا......؟(فکرمندی سے)

فرہاد: فلمی دنیا......ایک سراب......کی......مانند......ہے......
اسے......مٹھی......میں بند کرنے کے لئے......ہر وقت......
آنکھیں......اور......کان......کھلے رکھنا پڑتے ہیں......!

منال: میں کچھ سمجھی نہیں......!

فرہاد: چھوڑو......تمہیں......سمجھانے کو......ابھی بہت وقت پڑا
ہے......کل......جو......بھی......فلم کی پیشکش کرے......
بس......اسے......کام......کرنے......کی شرط کے ساتھ منظور کر
لینا......باقی میں سنبھال لوں گا......!

منال: جی......بہتر......!(دھیمے لہجے میں کہہ کر اٹھنے لگتی ہے فرہاد بھی
ہمراہ چل پڑتا ہے)

سین نمبر 19

منال کا بیڈروم

کردار منال، ٹیلی فون کے دوسری طرف آواز۔

منال: ہیلو......جی......بول رہی ہوں......!(کافی دیر تک ٹیلی فون کی
گھنٹی مسلسل بجنے کے بعد نیند سے جاگتے ہوئے) what are you
talking about?......یہ کس طرح ہو سکتا ہے......؟ ابھی ابھی کچھ
دیر پہلے میں ان کے ساتھ تھی......!(اٹھ کر بیٹھتے ہوئے) اُف میرے
خدا......یہ کیا ہو گیا......اچانک یہ کیا ہو گیا......میں کیا کروں......
کہاں جاؤں......؟(بال باندھتے ہوئے سلیپر ڈھونڈتی ہے)

سین نمبر 20

منال کے گھر کا کاریڈور

کردار منال، والد، والدہ۔

منال: امی......امی جی......! کہاں ہیں آپ......؟(سیڑھیاں اتر کر
والدین کے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے)

والدہ: یا الٰہی خیر......میرے مولا خیر......! کیا......کیا ہوا......؟
(چشمہ درست کرتے ہوئے بیٹی کے قریب ہو کر)

منال: وہ......وہ......فرہاد صاحب کا ایکسیڈنٹ......ایکسیڈنٹ ہو گیا
ہے......!

والد: ایکسیڈنٹ ہو گیا......کب ہو گیا......کہاں ہو گیا......کس......
طرح......ہو گیا......(گاؤن درست کرتے ہوئے کمرے سے برآمد
ہوتے ہیں)

منال: نو جی......فرہاد صاحب پر......غنڈوں نے حملہ کیا ہے......
شدید زخمی حالت میں......انہیں ہسپتال داخل کیا گیا ہے......ہمیں......
ہمیں جلد وہاں پہنچنا چاہیے......!

والد: ہاں......بیٹا......ہاں......چلو......جلدی......چلو......!
(باپ بیٹی باہر کی طرف لپکتے ہیں)

والدہ: الٰہی خیر......میرے مولا خیر......فرہاد صاحب کو......جلد......
اچھا کر دے(دونوں ہاتھ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے)

سین نمبر 21

منال کے گھر کے باہر

کردار:منایل'والد۔

والد:آؤ......بیٹی...... آؤ...... بیٹھو......!(گاڑی ریورس کر کے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے) کچھ پتا......چلا......ہے......فرہاد صاحب......کو...... کس ہسپتال میں......داخل کیا گیا ہے......؟

منایل:جی......ہو......جی......الشیخ ہسپتال......الشیخ...... گ...... گ......!

والد:اچھا......اچھا......الشیخ...... ہسپتال......وہ...... تو...... فرہاد صاحب کے گھر کے قریب ہے......!

منایل:جی......جی......ہو...... اطلاع دینے والے نے......یہی...... بتایا ہے......!

والد:اس کا مطلب ہے......!فرہاد صاحب......پر...... حملہ...... اُن کے...... گھر کے قریب ہوا ہے......!

منایل:شاید......!(کچھ پڑھتے ہوئے)

سین نمبر 22

الشیخ ہسپتال کی پارکنگ

کردار:منایل کے والد'منایل اور بہت سے لوگ۔

منایل:یہاں تو......پارکنگ ملنا بھی ...... دشوار ہے......!(جھنجلاتے ہوئے)

والد:آہستہ......بیٹا آہستہ...... تمہارے پریشان ہونے سے...... کچھ نہیں......ڈاکٹروں کی توجہ......اور...... ہم سب کی دعاؤں سے...... خدا نے چاہا تو......فرہاد صاحب......جلد ٹھیک ہو جائیں گے......!(منایل کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے)

منایل:جی......وہ......تو...... ٹھیک ہے...... مگر......!(گاڑی کا دروازہ کھول کر تیزی سے ہسپتال کی بلڈنگ کے اندر جاتی ہے'پیچھے پیچھے والد بھی تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے جاتے ہیں)

سین نمبر 23

ہسپتال کی ریسپشن

کردار:منایل کے والد'منایل'ریسپشنسٹ اور آتے جاتے چند لوگ۔

منایل:excuse me......!

ریسپشنسٹ:ایک منٹ......!(ہاتھ کے اشارے سے'ٹیلیفون سنتے ہوئے)

منایل:پلیز......!

ریسپشنسٹ:آپ دیکھ رہی ہیں کہ میں فون پر مصروف ہوں......پھر بھی......!

منایل کے والد:(منایل کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر خاموش رہنے کی تاکید کرتے ہوئے)بیٹا......!وہ......فرہاد......صاحب......!

ریسپشنسٹ:فرہاد صاحب......!مشہور فلم ایکٹر......!

منایل:(ناگواری سے)جی......جی......فرہاد صاحب...... مشہور فلم ایکٹر......!(چباتے ہوئے)

ریسپشنسٹ:اُن کے لئے آپ کو سیکنڈ فلور(رجسٹر دیکھتے ہوئے)روم نمبر 19 جانا ہوگا......!

منایل کے والد:شکریہ......!(منایل کے پیچھے سیڑھیاں چڑھنے لگتے ہیں جو پہلے ہی تیز تیز قدم بڑھا کر سیڑھیاں چڑھ چکی ہے)

سین نمبر 24

ہسپتال کا وی۔آئی۔پی روم

کردار:منایل'منایل کے والد'دو ڈاکٹرز'

ایک نرس اور چند اخباری نمائندے۔

ڈاکٹر:میں نے آپ سے کہا نا......فرہاد صاحب......کے لئے...... آئندہ بارہ گھنٹے بہت اہمیت کے حامل ہیں...... اس کے علاوہ...... میں...... فی الحال......اور کچھ...... کہنے کی......پوزیشن......میں...... نہیں......!

اخباری نمائندہ:انجری کے بارے میں تو کچھ بتا دیجئے نا......!

دوسرا ڈاکٹر:آپ کے سامنے ہے......دیکھ لیجئے......!(فرہاد کی گردن'چھاتی'بازو اور ٹانگ پر بندھی پٹیوں اور پلاسٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)میں تو حیران ہوں...... کہ......اس قدر شدید انجری کے باوجود......!(کمرے سے باہر نکل جاتا ہے)

منایل:بیڈ پر پڑے مریض کو حیرت سے دیکھتے ہوئے(ڈاکٹر کی جانب رُخ کر کے)یہ کون صاحب ہیں......؟

ڈاکٹر:اگر یہی سوال میں آپ سے کروں...... کہ...... محترمہ...... آپ...... کون......ہیں......اور......فرہاد...... صاحب سے آپ کا کیا......رشتہ ہے......؟

منایل کے والد:جی......ہم......ہم......فرہاد......صاحب......کے بہت قریبی عزیز ہیں......!

ڈاکٹر:اس کے باوجود......فرہاد صاحب کو......پہچاننے میں......اس قدر......دشواری......کا......سامنا ہے......؟

منایل:یہ......یہ......فرہاد......صاحب...... نہیں......ہو...... سکتے......!(صدمے سے بے ہوش ہو جاتی ہے'کبھی منایل کا کلوزلیا جاتا ہے کبھی ہسپتال کے بیڈ پر لیٹے'اُجلی داڑھی والے عمر رسیدہ چہرے'سفید مونچھوں اور فارغ البال سر کو فوکس کرنے لگتا ہے)

رس رابطے

ترتیب و تدوین

وقار جاوید

گلزار بھائی، آداب!

"چہار سو" کا مئی جون کا شمارہ میرے ایسے شخص کے نام منسوب کر کے معلوم نہیں آپ نے اُردو ادب کو کیا فائدہ پہنچایا۔ تاہم اس کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنے موقر جریدے کے توسط سے مجھے اپنے قارئین سے کچھ حد تک متعارف کرایا۔

میں آپ کے "قرطاس اعزاز" سلسلے کا شروع سے ہی مداح و معترف رہا ہوں اور کئی بار میں نے ریڈیو پروگرام "بازگشت" میں اس منفرد و انتہائی اہم سلسلے کا تفصیلی ذکر بھی کیا ہے۔ اور شاید آپ کو یاد ہو کہ جب پہلی بار مجھے "چہار سو" موصول ہوا تھا تو میں نے اپنے خط میں آپ کو داد دی تھی (حالانکہ مجھے خط لکھنے کی زیادہ عادت نہیں اور میں "مکتوباتی ادیب" نہیں جو ہر پرچے میں اپنا نام دیکھنے کے لئے بے وجہ مدیر محترم کو خط لکھتے رہتے ہیں اور کئی بار تو رسالے میں ان کا خط دیکھ کر تو قاری کو بھی بڑا عجیب سا لگتا ہے کہ خدا کرے وہ خیریت سے ہوں) کہ آپ پاکستانی ادبا و شعراء کے ساتھ ساتھ ہندوستانی قلمکاروں کو بھی اس میں جگہ دیجئے کیونکہ یہاں ہندوستان میں بھی بہت سے ممتاز و معتبر ادیب اور شاعر موجود ہیں اور اس طرح آپ دونوں ملکوں میں ایک خیر سگالی کے پل کا کام انجام دیں گے۔ مگر مجھے یہ خیال نہیں تھا کہ کبھی میرا بھی اس میں نمبر آئے گا۔ بہرحال اس نوازش کے لئے شکریہ۔

مگر معاف کیجئے گا جیسا کہ میں نے پہلے بھی شاید لکھا تھا یا کہا تھا مجھے ایک ہی پرچے میں دو اہل قلم کا گوشہ ایک ساتھ شائع کرنا کچھ اچھا نہیں لگتا کیونکہ ادیب اور شاعر بڑے "حساس" ہونے کے علاوہ "نازک مزاج" بھی ہوتے ہیں اور کبھی اپنے مرتبے کے بارے میں خوش فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اور پشت پر شائع ہونے والے کو ضرور ٹھیس پہنچتی ہوگی۔ اسی بات کو پیش نظر رکھ کر میں "عالمی اُردو ادب" میں ہمیشہ ادیبوں کو حروف تہجی کے لحاظ سے چھاپتا ہوں تا کہ کسی کو گلہ نہ ہو کہ اس سے کمتر ادیب کو مجھ سے پہلے چھاپ دیا گیا ہے اور اس "پہلے" اور "بعد" کے چکر میں تو کئی ادیب، شاعر مدیران سے ناراض بھی ہو جاتے ہیں۔ خیر میری گزارش ہے کہ از راہ کرم ایک میان میں دو تلواریں ڈالنے کی کوشش ترک کر دیجئے اور ہر شمارے میں ایک ہی قلمکار کو اعزاز قرطاس بخشیے۔ (شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میں "عالمی اُردو ادب" میں باری باری ہندو پاک کے ادیبوں پر خصوصی نمبر نکالتا ہوں تا کہ توازن قائم رہے اور کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ میں نے پہلا خصوصی نمبر حبیب جالب پر دوسرا اوپیندر ناتھ اشک پر تیسرا احمد ندیم قاسمی پر چوتھا سردار جعفری پر اور پانچواں اشفاق احمد پر نکالا تھا۔ اور اب کسی ہندوستانی ادیب پر نکالنے کا ارادہ ہے (غالباً پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب پر)۔

میری کسی بات کا بُرا نہ مانیے گا۔ ایک مشورہ ہے جو عمر میں آپ سے بڑا ہونے کے ناطے پر آپ کو دے رہا ہوں۔ ویسے آپ اپنی مرضی کے مالک ہیں اور ہر مدیر کو تو پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے رسالے کو اپنی مرضی کے مطابق چلائے۔

(نند کشور وکرم)

جناب گلزار جاوید صاحب! السلام علیکم۔

اس بار پُرلطف واقعہ یہ ہے کہ جیسے ہی ڈاک سے مجھے آپ کا "چہار سُو" ملا میں اُس وقت ایک غزل مکمل کر کے بیٹھا تھا۔ چنانچہ اودم میں "چہار سُو" کے لئے وہی تازہ بہ تازہ غزل ملفوف کر رہا ہوں۔ وہی بات کہ یہ غزل تازہ غیر مطبوعہ غیر مسموعہ تو صد فی صد ہے لیکن یہ کیسی ہے آپ کے معیار پر پوری بھی اُترتی ہے یا نہیں اس کا فیصلہ آپ ہی کو کرنا ہے۔ بے چارے شاعر کو تو اُس کی اپنی تازہ غزل خوامخواہ اچھی لگتی ہے۔

اب یہ کس طرح اور کس نئے انداز میں آپ کو داد دوں کہ آخر آپ نے محمود ہاشمی صاحب کو بھی چہار سُو کی گرفت میں لے لیا اور خوب لیا زندہ باد۔

(مشکور حسین یاد)

میرے بہت ہی محترم اور پیارے بھائی گلزار جاوید صاحب!

تاخیر سے ملنے والے شمارے کا قرطاس اعزاز اردو کے مشہور و جدید شاعر اور ادیب جناب ندا فاضلی کے نام سے منسوب کر کے آپ نے ایک بڑا ادبی قرض ادا کیا ہے۔ آپ کے اس اقدام کے لئے میں ساری اردو برادری کی طرف سے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ میں شروع شروع میں جب ممبئی آیا تو ندا سے بہت قریب ہو گیا تھا اور ہم باندرہ ممبئی کی پالی ہل سے متصل سڑک لنکنگ روڈ پر شام کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھوما کرتا تھا۔ جب ہم تھک جاتے تھے تو نیشنل کالج کے سامنے ہیپی ہوٹل میں چائے پینے بیٹھ جاتے تھے۔ ہمارے ساتھ کبھی کبھی چائے نوشی کے دوران صابر دت بھی آ جاتے تھے لیکن اپنی اس نزدیکی اور قربت کے باوجود میں ندا فاضلی سے نظریاتی اعتبار سے کبھی متفق نہیں ہو سکا میں جن اخلاقی قدروں کا علمبردار اور شیدا ہوں ندا ان اخلاقی قدروں سے کوئی سروکار نہ پہلے رکھتے تھے اور نہ آج رکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کی شاعری کے ایک وافر حصے سے میں اس وقت بھی اختلاف رکھتا تھا اور آج بھی رکھتا ہوں۔ بچے خدا کی قدرت کا زندہ و پائندہ ثبوت ہوتے ہیں ان کی ہنکار سے خوش ہو کر انہیں گود میں لے کر انہیں ہنسانا مجھے بھی بہت اچھا لگتا ہے کیونکہ یہ عبادت میں شامل ہے لیکن بچوں سے ذہنی قربت کے عوض مسجد اور عبادت الٰہی

سے کنارہ کشی اختیار کرنا' ازدواجی زندگی کے تقدس کے ساتھ کھلواڑ کرنا اور باپ کی قبر پر جانے سے گریز کرنا یہ اور ایسے بہت سے ناپسندیدہ اطوار ندا فاضلی کی زندگی میں شامل ہیں۔ لفظوں کی بازیگری اور گورکھ دھندے سے نہ تو کوئی شاعری پسندیدہ ہو سکتی ہے اور نہ کوئی نثر پارہ پایۂ اعتبار کو پہنچ سکتا ہے۔ لیکن تخلیقات سننے میں کان کو تو اچھی لگ سکتی ہیں لیکن انسانی ذہن کی تعمیر کا کوئی پہلو ان سے نہیں نکلتا۔ اس اختلافی صورت کے باوجود میں ندا کو پسند کرتا ہوں۔ اس پسند کے پس پشت انسانی زندگی کا کوئی نہ کوئی اچھا اور خوبصورت پہلو تو ان کے ساتھ ہے جو مجھے ان کی طرف کھینچتا ہے۔ بہرحال "چہارسُو" کا یہ گوشہ بھرپور ہے۔ ندا کے احباب نے ان کی ادبی و ذہنی شخصیت کے کچھ مخفی اور نمایاں پہلوؤں پر تسلی بخش روشنی ڈالی ہے۔ آپ کا سوالنامہ خوب ہے۔ اس سے ندا کے اندر کا فنکار پوری طرح آشکار ہو گیا ہے۔

آپ کا افسانہ "تقدیر کا رشتہ" مجھے پسند آیا۔ اپنی بات کو قاری کے ذہن میں اتارنے کی فنی دروبست مناسب ہے۔ جتیندر بلو کے افسانے "چکر" میں بھی کشش ہے۔ رینو بہل نے بھی "سانجھا چولہا" میں افسانہ نگاری کے فن کی لاج رکھی ہے۔ شبی تازہ کے تحت غزلوں کا حصہ قابلِ مطالعہ ہے۔ نظمِ عصر کے گوشے میں شامل سبھی نظمیں تخلیقی قوتوں کی حامل ہیں۔ نظر انتخاب کڑی ہو تو نظموں اور غزلوں کا انتخاب خوبصورت ہو سکتا ہے اس کا ثبوت اپنے رسالے کے ذریعے آپ نے فراہم کر دیا ہے۔ "رس رابطے" کے زیرِ عنوان جن خطوط کو شامل کیا گیا ہے انھیں میں نے حسبِ دستور بڑے شوق سے پڑھا۔ میرے پاس جو رسالے آتے ہیں ان میں خطوط کا جو حصہ شامل ہوتا ہے میں اسے خاص دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ رسالے کی دیگر تحریریں بھی ٹھیک ٹھاک ہوتی ہیں۔ چلتے چلتے ایک اچھی خبر آپ کے سامنے پیش کردوں کہ پاکستان کے ساتھ ہندوستان کے طول و عرض میں چہارسُو چھا گیا ہے۔ آپ کی خوش اسلوبی اور خوش مذاقی کے اثرات ذہنوں پر مرتب ہوتے ہیں۔

(محمد ایوب واقف)

میرے گلزار خوش رہو۔

"چہارسُو" کا تازہ شمارہ بابت جولائی اگست موصول ہوا۔ اس بار قرطاسِ اعزاز جناب محمود ہاشمی فرزندِ کشمیر کو سونپ کر قرطاس پر ایک اور ستارہ اپنی محفل میں لے آئے۔ ان کی "مشرق کی کہانی" اور "مشرقی تہذیب کا المیہ" خورشید اور محمود ہاشمی کا ہم بیاں کیسے پہنچا باوجود طوالت کے کافی دلچسپ ہے اور آئینہ بردباری محمود ہاشمی کے نام خطوط بھی خوب ہیں۔ رحمان پرویز کی نعت کے اشعار اچھے لگے۔ سید مشکور حسین یاد اور مظفر حنفی کی غزل کے اشعار پسند آئے شبنم شکیل کی غزل کا شعر "رات ہم ایک غزل لکھتے ہوئے روتے رہے بعض لفظوں کو تو اشکوں نے مٹا بھی ڈالا" ڈاکٹر خالد حمید شیدا کی غزل اچھی لگی۔ غالب عرفان کی غزل کا شعر "اس کے لہجے میں استعمال کیا / اپنے بس میں زبان رکھتا ہے" اور عشرت ظفر کی غزل کا شعر "دیارِ خاک میں بے وقت جانے کون سی شے / دریدہ پیرہن و بے قبا بھی ہو" پسند آیا۔

جتیندر بلو کا افسانہ "درد بے سمت" کیدار ناتھ شرما نور احسن کا کھڑکی سے آنے والا جھونکا اور دیپک بدکی کا "معصوم علی" پسند آئے۔ مجبور اختیاری والا پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے آپ اُس سین کا ایک حصہ بن جاتے ہو۔ اور خوب بہاتے چلے جاتے ہو۔ اور زبان کی خوبصورتی تیزی والے سے باتیں، اور دل یہی چاہتا ہے کہ آپ کا افسانہ کبھی ختم نہ ہو۔ اور پھر آخر میں حالات ایسے کروٹ بدلتے ہیں کہ سب کچھ ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ خطوط بناوٹ ہی بناوٹ۔ گفتگو میں کس طرح کا اپنا پن تھا۔ سکی خوش ہو گیا۔ آج کل تو یہ سب ختم ہو چکا۔ اس مرتبہ نظم کا حصہ کافی جاندار ہے۔

شگفتہ نازلی کی غزل جس میں انہوں نے چہارسُو کا احاطہ کیا ہے اچھا لگا۔ رس رابطے تو جائے امان ہے ہیں۔ پُرلطف سے کچھ شکوے گلے ہیں چہارسُو۔ فیصل عظیم کی غزل کے اشعار اچھے لگے۔ حریف قلم عبدالعزیز خالد کے قطعات اچھے لگے۔ ابن انصاری کی رباعیات اور خورشید یہ کی آوارگی اور ڈاکٹر صابر آفاقی کا محبت کا گیت جینت پرمار کی نظمیں، خیال آفاقی کے قطعات کی کا احساس، ڈاکٹر ستار عاشق ہرگانوی، خورشید انور رضوی کی نظمیں۔ علی آذر کا سراب اور زندگی، حنیفہ انجم کی نظم اچھی لگی۔ اور سجاد مرزا کا کاش ایسا ہوتا، صدائے پیاگی کا سراج، پروفیسر زبیر کنجاہی پسند آئیں۔

ستیہ پال آنند کی نظمیں مونا لیزا کا تو کچھ دیر گاری، مونا لیزا ہو یار پڑھی۔ ان کی پنجابی غزلیں بھی اچھی لگیں۔ "میں ورق پر لیٹی لیں" جن جوہر کا کلام شمع جلتی رہی / رات ڈھلتی رہی / اک تمنا سی دل میں مچلتی رہی / خون بہتا رہا نسلِ انساں کا / دل دھڑکتا رہا / نبض چلتی رہی بھی خوب ہے۔

(یوگیندر بہل تشنہ)

برادرم گلزار جاوید۔ سلام و نیاز

"چہارسُو" کا تازہ شمارہ ملا۔ مہمان نوازی کا شکریہ۔ تین ماہ پہلے بھائی نند کشور وکرم سے "غالب اکادمی" کے سہ روزہ سیمینار میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس سال اختر کو "غالب اکادمی" نے غالب ایوارڈ برائے مجموعی خدمات سے نوازا ہے۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ بھائی نند کشور وکرم کی خدمات کے اعتراف میں انھیں گوشۂ قرطاسِ اعزاز سے سرفراز فرمایا۔ آپ کی فراخ دلی اور وسیع النظری بے مثل اور بے نظیر ہے۔ کاش ہندوستان میں بھی آپ سا ایک گلزار جاوید نور قرطاسِ ادب بن کر نمودار ہو جائے..... موصوف پر بڑے اچھے مضامین چھپ پائے ہیں۔ ناولوں پر تبصرے پڑھ کر معلومات میں یقیناً اضافہ ہوا۔

اس بار نعتِ رسول کا حصہ بھی دل و دماغ کی سرزمین کو خوشبو سے معطر کر گیا ہے..... کرامت بخاری کی نعت خاص طور پر پسند آئی۔ غزلوں کے حصے

میں بڑے ساتھ ہیں لیکن کسی کی غزل نے اپنی جانب نہیں کھینچا.....

گزشتہ شمارے میں آپ نے ناچیز کی غزل شائع کی تھی۔ اس غزل کے دو مصرعے کمپوزنگ کی غلطی کا شکار ہو گئے تھے جس کی طرف بھائی غالب عرفان نے اشارہ کیا تھا..... ایک شعر تو مجھے اچھی طرح یاد ہے جو یوں ہے:

سیاہی سے ہم کو نہیں واسطہ
ہمارا ہے نام و نسب نور میں

(علیم صبا نویدی)

پیارے بھائی گلزار جاوید! السلام علیکم۔

چہار سُو حسبِ معمول مل رہا ہے جس کے لئے شکر گزاری کے الفاظ نہیں مل رہے۔ اس بار رتن کشور وکرم اور مانک ٹالا صاحب کی نسبت بہت کچھ پڑھنے کو ملا۔ خاص کر رتن کشور وکرم کے "چاچا سام کے نام" خطوط میں خط نے بہلا کر رکھ دیا۔ مضامین قریب سبھی اچھے ہیں مگر دیویندر اسر کا "یہ عشق نہیں آساں" کے بیشتر جملوں کی ساخت قابلِ تحسین ہے۔ مثلاً غالب کے مصرع میں موجود الفاظ کی طرح ہیں۔ بہت قطرے سارے ہیں لیکن پھر بھی کم قطرے۔ افسانے بھی سب عمدہ ہیں مگر آپ کے افسانے "شناخت پریڈ" میں ہم معنی الفاظ ایک ہی جملے میں ہونے کا عمل نامناسب ہے۔ اس بار شعری حصہ زیادہ توجہ کا مستحق تھا مگر آپ کی مصروفیات کے باعث اپنے حصے کی توجہ سے محروم رہا۔ مثلاً مولوی محمد اسلم وڑائچ (میرے خیال میں مولوی لکھنا زیب نہیں دیتا) جناب کنول ناز کی پوری، جناب کرامت بخاری کے کچھ اشعار تخلیق کار یا کمپوزر صاحب کی زیادہ توجہ چاہتے تھے۔ جن شعراء کے کلام میں پختگی اور برجستگی نمایاں ہے اُن میں جناب محسن احسان، ڈاکٹر وزیر آغا، صدیقی شاہد، جلیل عالی، انوار فیروز، اکبر حمیدی، خیال آفاقی، قیصر تمکین اور بہت سے جن کو میری دلی مبارک اور آپ کے لئے بے پناہ دعائیں۔

(اسلم راہی)

برادرم گلزار جاوید صاحب آداب و نیاز!

چہار سُو کا تازہ شمارہ ملا۔ شکر گزار ہوں۔ مصروفیات کے سبب میں میگزین جلدی نہیں پڑھ پایا۔ جب بھی فرصت مل جاتی ہے تو اٹھا لیتا ہوں اور ایک دو رات میں مسلسل جاگ کر پورا پڑھ لیتا ہوں۔ آپ چہار سُو میں ہندوستان کے مشہور و معروف ادیبوں کے گوشے نکالتے ہیں۔ یہ بہت ہی اچھی بات ہے۔ رتن کشور وکرم تو خیر ایک ادارہ ہیں۔ عالمی ادب ہر سال نکال کر اردو ادب کے لیے بہت اچھا کام کرتے ہیں۔ ان کا مطالعہ بھی کمال کا ہے۔ حال ہی میں انہوں نے اشفاق احمد اور احمد ندیم قاسمی پر بہت ہی خوبصورت گوشے شائع کیے تھے۔ مانک ٹالا کا پوگرام بھی کافی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ میری کتاب "عصری تحریریں" میں مانک ٹالا پر کافی کام ہوا ہے۔ سچ مانئے تو ایک پروفیسر دوست فرید پربتی اور

لندن کے ادیب قیصر تمکین نے مجھ سے سوال کیا کہ میں نے اس کو تبصرہ بنا کر داخل کیوں نہیں کیا۔ ان کا ماننا تھا کہ یہ مضامین ریسرچ کے برابر ہیں۔ خدا جانے سچ کیا ہے۔ میں نے تو اپنی طرف سے کوشش کی ہے۔

(دیپک بدکی)

حضرت گلزار جاوید صاحب! آداب و سلام۔

تازہ چہار سُو ملا، جی خوش ہو گیا۔ اس بار رتن کشور وکرم کا "آتم پروچن" اچھا تھا۔ جگنوں داس انجاز کے "اصلی روپ" پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ یہ چھپتے رہنے چاہئیں تا کہ دوہوں اور قطعوں کا فرق یاد رہے۔ "شخصی معروضی" البتہ چکرا دے گیا کیوں کہ "شخصی معروضی" کے حصے میں سارا کلام تو شخصی تھا پھر آپ نے اسے معروضی کیوں کہا؟ ابھی تک سوچ رہا ہوں۔ اس میں قیصر تمکین صاحب کے دو اشعار "سکافتانِ چمن" اور "نظر تو دو" والے اچھے لگے۔ منیر الدین احمد کا "اوور کوٹ" کہانی سے اچانک "افسانہ" بنا جس نے لطف دیا اور آخری پیراگراف سے پہلے تو میں مایوس سا ہو گیا تھا۔ ناصر شہزاد صاحب کی اس بار کی غزل کے بعض اشعار اچھے تھے۔ پروین حیدر کی غزل متاثر کن رہی۔ ماجد سرحدی کی "سب سے پہلا پاکستان" اچھا شعر ہے۔

(فیصل عظیم)

قابلِ احترام جاوید صاحب! آداب۔

مئی جون کا شمارہ وقت پر مل گیا تھا۔ معافی چاہتی ہوں خط لکھنے میں تھوڑی دیر ہو گئی۔ آپ نے "چہار سُو" کی ایسی عادت ڈالی ہے کہ ایک شمارہ پڑھ کر ختم کرتی ہوں تو اگلے کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ سونے پہ سہاگہ زریں رسالہ "دلِ مضطرب تھا شگفتانہ" لکھا ملتا ہے۔ براہِ راست میں آپ نے جناب رتن کشور وکرم سے سوال کیا تھا کہ "آپ سرکاری اداروں سے مالی معاونت لیتے ہیں نہ احباب کو زحمت دیتے ہیں" یہی سوال میرے ذہن میں بھی اٹھتا ہے۔ آپ کا ادب کے لئے احترام، خدمت اور پیار سمجھ میں آتا ہے مگر اس دور میں جبکہ اردو رسالے صرف مالی امداد نہ ملنے کی وجہ سے بند ہو رہے ہیں آپ ہر بار چہار سُو کو پورے آب و تاب کے ساتھ چھاپتے اور قارئین تک پہنچاتے ہیں۔ یہ بات قابلِ داد ہے۔

رتن کشور وکرم جی نے اردو زبان کے مستقبل کو لے کر جو چنتا ظاہر کی ہے اس سے حوصلہ بڑھتا ہے۔ "آتم پروچن" زندگی کی سچائی، ہمارے رسم و رواج اور سماج کو بے نقاب کرتی ہے۔

"ستارہ ماجی" "روشنی" "چار دن" اور "شناخت پریڈ" الگ الگ رنگ کے دلچسپ افسانے ہیں۔ خوبی ان میں یہ ہے کہ چاروں انسان کی خوبیاں اُن کی کمزوریاں بیان کرتے ہیں۔ قرطاسِ احترام کے ذریعے مانک ٹالا صاحب کے بارے میں جاننے کو بہت کچھ ملا۔ آپ کے انٹرویو دلچسپ ہوتے ہیں۔ اُن کا افسانہ "دست تیگ" کا انسان بہت پسند آیا۔ خصوصاً جناب ڈاکٹر ستیہ پال

آنند کی پنجابی غزلیں اور نظمیں اچھی ہیں۔ اس رابطے میں اُن کا خط پڑھا اور معلوم ہوا کہ اُن کی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ بھگوان سے یہی دعا کروں گی کہ انہیں جلد صحت یاب کرے۔ شعری حصہ چاہے وہ "شبِ معراج" "شبِ معطر" "شبِ آفتاب یا شبِ ماہتاب" میں شامل کیا گیا ہے، سارے اچھے ہیں۔ کسی ایک شاعر کا ذکر کرنا مشکل ہے۔ ملے جلے نظمیں اور غزلیں بھی پسند آئیں۔ اس بار شعری حصے میں پڑھنے کو بہت کچھ تھا۔ (ڈاکٹر رینو بہل)

محب مکرم جناب گلزار جاوید صاحب! السلام علیکم۔

اُبل نظر صاحب کے توسط سے چہارسُو کا شمارہ بابت جنوری فروری ۲۰۰۹ء بنظر نواز ہوا۔ اس گرانقدر ادبی سوغات کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ پہلی ہی نظر میں اس کی نفاست اور صوری جمال دامن کش قلب و دل ہوا اور مطالعہ کے بعد اس کی معنوی جہتیں بھی روشن ہوتی چلی گئیں۔ قرطاسِ اعزاز کا مستقل کالم مجھے سب سے زیادہ پسند آیا جس میں ادب کی ایک عبقری شخصیت ڈاکٹر وحید قریشی کو پیش کر کے آپ نے قدر شناسی کا عمدہ ثبوت دیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے جہاں اُن کی بے پناہ علمی و ادبی صلاحیتوں کا انکشاف ہوتا ہے وہیں ان کے خلاف محاذ آرائیوں سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔ یہ بات بھی لائقِ توجہ ہے کہ وہ ان محاذ آرائیوں سے سرخرو گزرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اس تعلق سے ضمیر جعفری صاحب نے بجا فرمایا ہے کہ "وہ (ڈاکٹر وحید قریشی) ان لوگوں میں سے ہیں جن کو قدرت ساحلوں پہ رہنے کے لئے نہیں بلکہ گرداب سے لڑنے کے لئے پیدا کرتی ہے" "منشولات" میں دیگر نثری و شعری حصے آپ کی بصیرت اور صاف ستھرے ذوق کا جواز فراہم کرتے ہیں۔ کچھ تو چاہتا ہے کہ ان تمام کا حوالہ دوں مگر طوالت کے خوف سے صرف نظر کرنا پڑتا ہے۔ اس میں برصغیر کے جن فنکاروں کی نگارشات جگمگا رہی ہیں وہ سب ایں خانہ ہمہ آفتاب است کے مصداق ہیں۔ آپ کا اداریہ "عطار کے لونڈے" زبان و بیان کے چٹخارے کے ساتھ اپنے چونکا دینے والے تخلیقی انداز کے لئے لائقِ تحسین ہے۔ تازہ تصانیف کا تعارف عقیل سکندر علی نے بڑے سلیقے سے کرایا ہے اور اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ وہ نثری و شعری اصناف کے نشیب و فراز سے بخوبی آشنا ہیں۔ بہر حال اس خوبصورت اور معیاری پیشکش کے لئے آپ کو اپنی دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ (سعید رحمانی)

گرامی قدر گلزار جاوید صاحب، سلام و رحمت۔

نارنگ صاحب پر آپ کا مقالہ باصرہ نواز ہوا۔ اس کرم کے لیے شکر گزار ہوں۔ کتاب جلد ہی طباعت کی منزل میں پہنچنے والی ہے۔ آپ کا مقالہ شامل رہے گا۔ تہہِ دل سے مشکور ہوں کہ آپ نے چہارسُو بھی عنایت فرمایا۔ میں تو زیر نظر شمارہ (مئی جون ۲۰۰۹ء) دیکھ کر حیران و ششدر ہوں کہ یہ پرچہ پاکستان کا ہے کہ ہندوستان کا۔ قرطاسِ اعزاز بھی بھارتی کے نام اور انہیں قرطاس پیش کرنے والے بھی آدھے سے زیادہ ہندوستانی۔ پاکستانی قلمکار بھی برابر کے شریک۔ قرطاسِ احترام بھی بھارتی یعنی مالک رام کے نام۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو نے جغرافیائی تقسیم کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ وہ گلشنِ برصغیر کی خوشبو ہے جو سیاسی طور پر وضع کردہ سرحدوں کو نہیں مانتی۔ اِدھر پھول مہک رہے ہیں تو اُن کی خوشبو اُدھر جا رہی ہے، اُدھر کے پھولوں کی خوشبو اِدھر آ رہی ہے۔ یہ خوشبو ہندو مسلمان میں امتیاز نہیں کرتی۔ دونوں کے مشامِ جاں کو معطر کر رہی ہے اور فی الحقیقت "زندگی کے ساتھ چہارسُو" موجود ہے۔ بہر حال اس عنایت کے لیے ممنون بھی ہوں اور مشکور بھی۔ ستیہ پال آنند، کشور وکرم اور مالک رام کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور اُن کی خدمات کا اعتراف ہم بھارتیوں کا فرض تھا۔ ہماری کوتاہی سے یہ سعادت آپ کے حصہ میں آ گئی۔ (کوثر صدیقی)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

"چہارسُو" میں تند کشور وکرم کے لیے گوشہ نکال کر کمال کیا ہے۔ آپ کی ادب و علم سے گہری اور فکری وابستگی اور علمی و ادبی شخصیات کو اُن کی زندگی میں خراجِ تحسین پیش کرنے کی اب روایت بن گئی ہے اور یہ روایت نہ صرف قابلِ ستائش ہے بلکہ لائقِ تقلید بھی ہے۔ "براہِ راست" میں آپ اپنے منفرد اور نکھرے انداز میں نظر آئے۔ تند کشور وکرم صاحب کی اس بات سے متفق نہیں کہ "اردو حلقے ہر جگہ خوش فہمی کا شکار ہیں"۔ پھر تند کشور وکرم آگے چل کر اقرار کر رہے ہیں کہ "دکانیں کھلنے کا مطلب ہے کہ اردو کے لیے کچھ کام ہو رہا ہے"۔ امریکا، کینیڈا، برطانیہ اور دیگر ریاستوں میں مشاعروں کی وجہ سے اردو زبان پھیل رہی ہے۔ اردو ادب کی شناخت بن رہی ہے۔ مشاعروں، مذاکروں اور ادبی محافل کو "دکانیں" کہنا مناسب نہیں۔ بہر حال کسی طرح تسلیم تو کیا۔ "شبِ معطر" میں ڈاکٹر نثار ترابی اور فیصل عظیم کی چھوٹی بحر کی غزلیں بہت عمدہ ہیں۔ شگفتہ نازلی کی غزل کی ردیف الگ الگ محسوس ہوتی۔ پرویز ساحر کی غزل کا انداز اور اسلوب قابلِ داد ہے۔ پروفیسر نذیر کجاہی اور ڈاکٹر سیفی سرونجی کی غزلیں پُر لطف ہیں۔ نجمہ عثمان کی غزل زمین سے محبت، ہجرت اور رشتوں میں منافقت کے حوالے سے ہے۔ "شبِ معراج" میں وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید، سرور انبالوی کی غزلیں سماجی شعور کی بہترین مثالیں ہیں۔ قیصر نجفی، عشرت ظفر، ماجد سرحدی کی غزلیں عصری تقاضوں کو پورا کرتی نظر آ رہی ہیں۔ اکبر حمیدی اور شبنم شکیل کے انداز نے بیحد متاثر کیا ہے۔

منیر الدین احمد کی کہانی "اوورکوٹ" تاریخی حوالوں سے اچھی کہانی ہے۔ قیوم راہی کی کہانی "ستارہ ابی" متاثر نہیں کر سکی۔ "شناخت پریڈ" چھیکوں اور کمیوں کی داستان ہے۔ آپ فسانے کو کئی جہت عطا کر رہے ہیں جس خوبی سے جزئیات کا ذکر کرتے ہیں وہ کمال ہے جب کہ فسانے میں اس کی گنجائش کہاں ہوتی ہے مگر آپ بڑی فنکاری سے گنجائش نکال لیتے ہیں۔

مشتاق اعظمی کا افسانہ ''روشنی'' خوب صورت اور پُراثر ہے۔ ''مجلسِ چہار سُو'' میں مانک ٹالا سے ملاقات نہایت خوشگوار اور مفید رہی۔ مانک ٹالا صاحب نے آپ کے سوالات کے حقیقت پسندی سے جوابات دیے ہیں۔ مانک ٹالا صاحب کے حوالے سے تمام تحریریں معلوماتی اور دلچسپ ہیں۔ نند کشور وکرم صاحب کے حوالے سے دیویندر اِسّر اور شرف عالم ذوقی کے مضامین عمدہ ہیں۔ ذوقی صاحب نے ''نیسوں اور صیاے'' پر مختصر مگر جامع تبصرہ کیا ہے۔ ''سخنِ آفتاب'' میں وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید، جاوید شاہین، ماجد سرحدی، جوہر جعفری اور علی آذر کی نظموں نے بہت لطف دیا۔ محسن احسان کے ہائیکو میں نیا پن ہے۔ (نوید سروش)

محترمی گلزار جاوید صاحب۔ خلوصِ بیکراں

''چہار سُو'' کے ایک نہیں دو شمارے ایک ساتھ ملے۔ ساتھ میں آپ کا محبت نامہ۔ وہ بھی ایک نہیں دو دو۔ مانوں میں اسے میں اپنی خوش نصیبی ہی کہوں گا جو آپ نے مجھے اس قدر خلوص و محبت سے لبریز کر دیا۔ سب سے بڑی حیرت و مسرت مجھے تب ہوئی جب میں نے آپ کے ہاتھوں لکھا ہوا ہندی میں خط دیکھا۔ آپ کو ایک راز کی بات بتانا چاہوں گا میرے لئے ہندی کالا اکشر بھینس برابر ہے۔ یقین مانئے آپ کا خلوص اور دریا دلی دیکھ کر بے ساختہ منہ سے نکل گیا۔ گلزار جاوید زندہ باد۔ میں نہیں جانتا تھا کہ پاکستان میں گلزار جاوید جیسے انسان بھی رہتے ہیں، جو ریگزاروں میں بھی پھول کھلا سکتے ہیں۔ جو پیار کرنے پر آجائیں تو محبت اور خلوص کے دریا بہا سکتے ہیں۔ وائے رے قسمت میں اب تک آپ کے نیاز سے محروم کیوں رہا۔ خدا آپ کو لمبی عمر دے۔ میں آپ کی عظمت کا قائل ہو کے رہ گیا ہوں۔ پہلے جناب معراج جامی، پھر جناب طفیل اختر (ایڈیٹر مسکراہٹ) اور اب جناب گلزار جاوید نے مجھے محبت کی زنجیروں میں باندھ لیا ہے۔ آپ محبت کا جو پیغام ''چہار سُو'' پھیلا رہے ہیں انشاء اللہ کرے وہ پیغام اُن کانوں تک بھی پہنچے جو نفرت اور عداوت کی وجہ سے بہرے ہو چکے ہیں۔

(دیپک کنول)

محترم گلزار جاوید صاحب، آداب۔

چہار سُو ملا خوشی ہوئی۔ حسبِ سابق وقیع جامع اور موثر۔ البتہ میری غزل کے دو شعروں میں کتابت کی غلطیاں ہو گئیں، اصل شعر اس طرح ہیں۔

طبیعت کا تقاضا بھی یہی ہے
کوئے جاناں کو ہی جانے کے دن ہیں

یہی دن ہیں متاعِ بزمِ ہستی
یہی تو عشق فرمانے کے دن ہیں

قرطاسِ اعزاز سے لے کر ''دل رابطے'' تک سارا پرچہ ایک اہم دستاویز ہے۔ ڈاکٹر انور سدید، جعفر بلوچ، احمد صغیر صدیقی اور محمود ہاشمی کی تحریریں اچھی ہیں۔ نثری معرکہ تو سخن معرکہ ہے، نثری معرکہ بھی عطر بیز، موسیقیت سے لبریز اور ہر طبعِ نکتہ جُو کے لیے مہمیز سے کم نہیں۔ شانِ ردا، آئینۂ فن اور سخنِ آفتاب چندے ماہتاب ہے۔ تخلیقِ عصر بھی سخنِ ماہتاب بھی وجہ طمانیتِ قلب اور آسودگی کے اسباب مہیا کرتا ہے۔ پرچہ ترتیب، تشکیل، تدوین، تزئین، تفہیم، تقسیم اور ترسیل کے لحاظ سے بھی بہت کامیاب جا رہا ہے۔ یہ سب آپ کی محنت اور محبت کا نتیجہ ہے۔ (کرامت بخاری)

محترم گلزار جاوید صاحب۔ السلام علیکم

یقین جانیے ''چہار سُو'' اک تحفۂ جاں فزا کی طرح ملا۔ آپ کی قلندرانہ بے نیازی متاثر کرتی ہے۔ آپ نے نہ ادارے کے نام پر اپنے آپ کو project کیا نہ اشتہار بازی سے کام لیا۔ پرچہ یک لخت abruptly شروع ہوتا ہے۔ ادیبوں شاعروں کی پذیرائی آپ خوب فرماتے ہیں۔ اور وہ بھی ''براہِ راست''.......

محترم نند کشور وکرم اردو ادب کے خاموش خدمت گزار ہیں۔ ان کا سالانہ کتابی سلسلہ سرکاری و غیر سرکاری کتب خانوں میں آسانی سے مل جاتا ہے۔ یہ ایک طرح کا عطر مجموعہ ہوتا ہے۔ آپ نے ان کے لیے گوشہ جیسا اہتمام کیا ہے۔ غزلیں، نظمیں، مضامین اور افسانے دل لبھاتے ہیں۔

مانک ٹالا کے لیے بھی آپ نے گوشہ جو مرتب فرمایا ہے وہ ان کی حیثیت کے مطابق ہی ہے۔ پرچم جدت کے وکیل کے طور پر وہ کافی جانے جاتے ہیں۔ بہر حال اک اک صفحے کا لطف لے رہا ہوں۔ (رؤف خیر)

محترم و مکرم گلزار جاوید۔ سلام و رحمت!

آپ نے نامور شاعر و ادیب، نقاد اور محقق محمود ہاشمی کے نام منسوب کر کے ادبی معاشرے کے قرض کی ایک اور قسط ادا کر دی ہے۔ بلاشبہ آپ کے بقول محمود ہاشمی جیسے کم گو اور گوشہ نشین اہلِ قلم سے فیض یاب ہونا معجزہ نمائی کی دلیل ہے۔ یوں آپ نے حقیقت میں چہار سُو کو اسمِ با مسمّیٰ بنا دیا ہے۔ یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔ دل کی گہرائیوں سے آپ کو اس کی داد دیتا ہوں۔

اگرچہ ''کشمیر اداس ہے'' اُن کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے لیکن محمود ہاشمی نے اس کے بعد بھی مسلسل اور متواتر لکھا ہے۔ مختلف ادیبوں کے مستقبل کے بارے اُن کی پیشین گوئیاں ادب کے ہر طالبِ علم کے لیے دلچسپی کا باعث ہیں۔ میں اُن کی ان نگارشات سے مستفید ہو چکا ہوں۔

میری مختلف تحریروں میں اُن کی نگارشات کے حوالے موجود ہیں۔

میں اُن سے نیاز مندانہ تعلقِ خاطر برقرار ہے۔ مجھے چہار سُو کا ایک گوشہ اُن کے نام منسوب دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی ہے۔ آپ کی یہ کاوش ہر لحاظ سے کامیاب ہے۔ حرفِ تحسین قبول فرمائیے۔ (پروفیسر غفور شاہ قاسم)